خطباتِ
حکیم الامت

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۱۳

دعوت و تبلیغ

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت
حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

عنوانات
قاری محمد ادریس صاحب ہشیارپوری مدظلہ

تصحیح و تزئین
صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث
مولانا زاہد محمود قاسمی

اِدارہ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

دعوت و تبلیغ

تاریخ اشاعت.............. شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
ناشر............................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت...................... سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ...چوک فوارہ...ملتان — مکتبہ رشیدیہ......راجہ بازار......راولپنڈی
ادارہ اسلامیات.........انارکلی.........لاہور — یونیورسٹی بک ایجنسی....خیبر بازار......پشاور
مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار......لاہور — ادارۃ الانور.........نیو ٹاؤن.......کراچی نمبر 5
مکتبہ رحمانیہ........اردو بازار .... لاہور — مکتبہ المنظور الاسلامیہ...جامعہ حسینیہ...علی پور
مکتبہ المنظور الاسلامیہ...........بلاک زیڈ........مدینہ ٹاؤن........بنک موڑ.......فیصل آباد
ادارہ اشاعت الخیر - حضوری باغ روڈ - ملتان
ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K (ISLAMIC BOOKS CENTERE — 119-121- HALLIWELL ROAD BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۱۳ ''دعوت و تبلیغ'' جدید اشاعت سے مزین آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ کے فضل و کرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔ بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے۔ ادارہ کی درخواست پر محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب نے یہ کام سرانجام دیا اور اس کے ساتھ ہی ہم حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ کے مشکور ہیں کہ اُنہوں نے فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح بھی فرما دی۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ بمطابق ستمبر 2006ء

اجمالی فہرست

ضرورت تبلیغ (صفحہ-۲۱۵)

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ط وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ.

اتباع علماء (صفحہ-۲۷۲)

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ

التبشیر (صفحہ-۲۹۶)

فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولا تختلفا.

الاستقامت (صفحہ-۳۴۰)

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ.

فہرست عنوانات

الدعوۃ الی اللہ

افسوس! دوسروں کو تو ہم اپنے مذہب میں کیا لاتے۔
اپنے ہی بھائیوں کو اپنے مذہب میں نہیں رکھ سکتے۔
خدانخواستہ اگر یہی نوبت رہی تو آج تو نومسلموں پر
مشق ہے۔ اگر مخالفین کا حوصلہ بڑھ گیا تو کل وہ پرانے
مسلمانوں کو بھی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کریں گے۔

از حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ''الدعوت الی اللہ''
یکم شعبان 1241ھ یتیم خانہ اسلامیہ کان پور میں کرسی پر بیٹھ
کر ساڑھے تین گھنٹے تک ارشاد فرمایا۔
محترم احمد عبدالحلیم صاحب نے قلمبند فرمایا۔
سامعین کی تعداد ایک ہزار تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الدعوت الی اللہ

الحمدللّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نؤمن بہٖ و نتوکل علیہ و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہٗ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہٗ و رسولہٗ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ وبارک وسلم۔

اما بعد: فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰہِ وَ عَمِلَ صَالِحاً وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ط وَلَاتَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَاالَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ وَمَایُلَقّٰھَآ اِلَّاالَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّاذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَالسَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔(حٰمٓ السجدہ آیت نمبر ۳۳ تا ۳۶)

(اور اس سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو (لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نیک برتاؤ سے بدی کو ٹال دیا کیجئے، پھر یکا یک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہوجائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے اور یہ بات ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصب ہے اور اگر آپ کو (ایسے وقت) شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آئے تو (فوراً) اللہ کی پناہ مانگ لیجئے بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے)

ضرورت بیان

یہ چند آیتیں ہیں سورۂ حٰم سجدہ کی۔ ان میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے ایک خاص عمل کی فضیلت مع ان کے مکملات وآداب کے ارشاد فرمائی ہے اور وہ خاص عمل کون سا ہے۔؟ وہ وہ ہے جس کا نام انہی آیات میں ''دعوت الی اللہ'' رکھا گیا ہے۔ ''دعوت الی اللہ'' کے کیا معنی؟ یعنی حق تعالیٰ کی طرف بلانا۔ حق تعالیٰ کی طرف بلانے کا یہ مطلب کہ دین کی طرف بلانا اور نہ کوئی حق تعالیٰ کے سامنے لے جا کے تو کھڑا کرنے سے رہا، تو یہ ہے وہ عمل جس کی فضیلت ان آیات میں ذکر کی گئی ہے۔

ہر چند یہ عمل ایسا نہیں ہے جس کا نام آج نیا سنا ہو۔ یہ تو قرآن کا مدلول ہے اور قرآن کے مطالب ومعانی آج سے نہیں بلکہ تیرہ سو برس پہلے سے مشہور ومعلوم ہیں۔ جو اہل علم ہیں وہ تو خود ہی خوب جانتے ہیں اور جو غیر اہل علم ہیں وہ بھی ضرورت کے درجہ تک اگرچہ خود نہ سہی تو سنے سنائے جانتے ہیں۔ بہرحال یہ ایسا عمل نہیں جس کی فضیلت ذہنوں سے غائب ہو۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سب اس مضمون کو جانتے ہیں تو پھر تحصیل حاصل سے کیا فائدہ؟

لیکن اگر اپنا معاملہ اس کے ساتھ دیکھا جائے تو یہ آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ ایسے ضروری مضمون کی طرف سے کس قدر بے توجہی اور لاپرواہی کی جارہی ہے اور اسی لئے ضرورت متوجہ کرنے کی ہوئی۔ اب تحصیل حاصل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور بے توجہی ہمیشہ دو وجہ سے ہوتی ہے یا تو اس کی ضرورت کا علم نہیں ہوتا یا علم تو ہے مگر عمل نہیں ہے۔ سو یہاں غایت سے غایت اگر کوئی کہہ سکتا ہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ علم تو سب کو ہے۔ اس لئے کہ کبھی نہ کبھی قرآن سب پڑھتے ہیں اور قرآن ہی کا یہ مضمون ہے۔ تو میں کہتا ہوں، اول تو قرآن کے پڑھنے سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک درجہ کا علم ہے۔ گو اس علم میں بھی اہل علم وغیر اہل علم کے مدارج میں تفاوت ہوتا ہے تو خیر یہ ضرورت نہ ہوگی۔ اس مضمون کی طرف متوجہ کرنے کی۔ مگر عمل کے متعلق جو اس مضمون کا حصہ ہے وہ تو یقیناً بہت ہی قلیل اور ضعیف ہے بلکہ قریب قریب معدوم ہے چنانچہ اس کے متعلق اپنی حالت کے دیکھنے سے معلوم ہو جاوے گا تو اس لئے تو متوجہ کرنا

ضروری ہے اور متوجہ کرنے کا آسان ذریعہ بیان ہے۔ اس لئے بیان کرنا بھی ضروری ہوا۔

دعوت میں کوتاہی

اب یہ بات رہ گئی کہ حالت دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ عمل کا حصہ قلیل و معدوم ہے۔ سو ہر شخص اپنی حالت دیکھ لے کہ شب و روز میں کتنے منٹ اور کتنا وقت اس کام کے لئے اس نے خاص کر رکھا ہے۔ یوں تو ہم میں عابدین بھی ہیں، زاہدین بھی ہیں۔ علماء بھی ہیں، طلباء بھی ہیں، غرض طرح طرح سے دین کی خدمتیں کی جارہی ہیں اور ان کا اہتمام بھی ہے مگر یہ دیکھ لیں کہ جتنی دیر وظیفہ، تلاوت، ذکر و شغل اور نفلیں پڑھنے میں صرف کرتے ہیں اور کسب حلال میں (جو بقصدِ ثواب عبادت ہے) مشغول ہوتے ہیں۔ آیا اس وقت میں سے کوئی حصہ اس کام میں بھی صرف ہوتا ہے کہ دوسروں کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کریں اب فرمائیے ایسے کتنے ہیں جو اس کام کو کرتے ہیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مہینے کے مہینے خالی جاتے ہیں جن میں ایک شخص کو بھی متوجہ الی اللہ نہیں کیا جاتا۔ یعنی اس کی نوبت ہی نہیں آتی کہ کافر کو اسلام کی ترغیب دیں۔ ضعیف الاسلام کو تقویت اسلام کی ترغیب دیں اور جو متردد ہیں۔ جن کے اسلام سے نکل جانے کا اندیشہ ہے ان کو اسلام پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب دیں یہ بے تو جہی تو اصول کے اعتبار سے ہے۔

اب فروع کے اعتبار سے بھی دیکھیں تو اس میں بھی وہ کوتاہی نظر آئے گی یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا باب ہی مفقود ملے گا۔ یہ امر بالمعروف نیک کام کی ترغیب، نماز کی ترغیب، جن پر نماز فرض ہے جن کے پاس بقدر نصاب مال ہے انہیں زکوٰۃ کی ترغیب۔ جن پر حج فرض ہے انہیں حج کی ترغیب دی ہو، یا جس کے اخلاق باطنی اچھے نہ ہوں۔ اسے تہذیب اخلاق کے طریقے بتائے ہوں۔ کہ یہ سب دعوت الی اللہ ہی کے شعبے ہیں اور امر بالمعروف کے اقسام ہیں۔ یا کسی کو نہی عن المنکر کیا ہو۔ کسی مبتلائے معصیت کو معصیت سے روکا ہو۔ خواہ وہ صغیرہ ہو خواہ کبیرہ۔

طمع و خوف

روکنے کے تو کیا معنی؟! اگر کہیں طمع یا خوف ہو تو اور اس کی تقریر و تائید کرتے ہیں۔ کہیں دوستوں کے ناراض ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کہیں طمع و توقع کا خیال رہتا ہے، کہیں

محسنوں کے احسان کا اثر ہوتا ہے، بہرحال طمع میں آدمی بہت ڈھیلا ہوجاتا ہے اور حالت بہت گر جاتی ہے یہاں تک ذلت وپستی کو اختیار کرلیتا ہے کہ ایسے ایسے موقعوں تک نظر جاتی ہے جہاں دوسروں کا خیال ووہم بھی نہیں پہنچ سکتا۔

چنانچہ ایک دوست یہیں کانپور کے اپنے ایک شناسا کی حکایت بیان کرتے تھے کہ اتفاقاً انہوں نے اس کی ہمراہی میں سفر کیا۔ منزل پر پہنچ کر دونوں ایک سرائے میں مقیم ہوئے۔ کھانا کھانے بیٹھے۔ اتفاقاً ایک کتا آیا۔ انہوں نے اس کے دیکھتے ہی کہا۔ السلام علیکم! میں نے کہا یہ کیا؟ کہنے لگا کبھی جن شکل بدل لیتے ہیں تو ممکن ہے، یہ جن ہو اور پھر یہ بھی احتمال ہے کہ جنوں کا بادشاہ ہو اور سلام سے خوش ہوکر ہم کو روپے دے جاوے۔ کیا اچھا حساب لگایا، بس جی اگر ایسے ہی احتمالات ہیں تو بلی کو بھی سلام کیا کرو یہاں تک کہ سور کو بھی سلام کیا کرو کیونکہ یہ احتمالات تو سب میں مشترک ہیں۔ مگر اپنی شدت طمع کی وجہ سے غریب کو یہ خبر نہ تھی کہ محققین نے لکھا ہے کہ ہر جن کتے کی شکل میں نہیں ہوتا۔ ان میں بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک معززین وامراء۔ یہ شیر، ہرن اور دوسرے ہیبت دار یا خوبصورت جانوروں کی شکل بدلتے ہیں اور ہوتے ہیں، فقیر، مفلس اور معمولی قسم کے، وہ کتے، بلی، چوہے وغیرہ کی شکل بدلتے ہیں، کیونکہ کتے کی عادت ہے کہ یہاں کھڑا ہوگیا، وہاں کھڑا ہوگیا، تو یہ بھیک مانگنے اور کنگلے کے مشابہ ہے اور جو اس قسم کے جن ہوتے ہیں وہ اس کی شکل میں آتے ہیں، ورنہ جو امراء ہیں وہ کبھی ایسی رذیل اور ذلیل شکل میں دکھائی نہیں دیتے، بہرحال اس کا سلام تو ضائع گیا کہ وہ سمجھا کہ یہ جنوں کا بادشاہ ہوگا۔ اسے تو طمع نے اتنا خراب کیا کہ اس نے کتے کو بھی اس لالچ سے سلام کیا کہ شاید روپے مل جاویں تو یہ طمع ایسی بری چیز ہے۔

خیر یہ تو اس احمق نے نہایت منکر فعل کیا، خدانخواستہ کوئی اور ایسا تو کیوں کرنے لگا مگر تاہم اس طمع کی وجہ سے ایسے افعال سرزد ہوجاتے ہیں جو کسی وجہ میں منکر ضرور ہوتے ہیں۔ اگر بظاہر وہ ناگوار معلوم نہ ہوں چنانچہ عام طور پر یہ بلا پھیلی ہوئی ہے کہ جہاں ذرا بھی توقع ہو، وہاں نہی عن المنکر سے اندیشہ ہوتا ہے اور وہم ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو خفا ہوجائے۔ میں کہتا ہوں کہ تم اپنی طرف سے ایسا طریقہ امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کا نہ نکالو، جس سے کوئی خفا ہوجاوے اور اگر تمہارے اچھے طریقے پر بھی کوئی خفا ہوجاوے تو یہ اس کا فعل ہے، تمہارا فعل نہیں ہے۔

طریق دعوت

اب وہ کون سا طریقہ ہے جو اچھا طریقہ ہے۔اس کے آداب خود ہی حق تعالیٰ نے بیان فرما دیئے ہیں۔فرماتے ہیں:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔

بلایئے اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف حکمت کے ساتھ اور نرم نصیحت کے ساتھ اور مناظرہ کیجئے ان لوگوں سے ایسے طریقہ پر جو اچھا ہو۔نرم نصیحت کے یہ معنی ہیں کہ عنوان اچھا ہو۔اس میں دل آزاری نہ ہو،طعن وتحقیر نہ ہو۔

طریق مناظرہ

اسی طرح مناظرہ میں بھی یہ چیزیں نہایت ضروری ہیں خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نمونہ دکھلا دیا اور مناظرہ تو بڑی چیز ہے کیونکہ اس میں دونوں طرف سے علمی ہی بحث ہوتی ہے اور دونوں طرف عالم ہوتے ہیں اس میں جہل کی کیا گنجائش؟ یہ امور تو ایسے واجب الرعایت ہیں کہ اگر کسی جاہل سے بھی سابقہ پڑ جائے تو اس کے جواب میں بھی جہالت کی ممانعت ہے۔چنانچہ ارشاد ہے:

وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا۔

''اور جب کہ خطاب کرتے ہیں ان سے جاہل،تو وہ کہتے ہیں سلام،یعنی جاہلوں کی جہالت کا بھی جواب جہالت سے نہیں دیتے۔''

باقی یہ کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ جاہلوں کا یہ خطاب جہالت ہی کا ہوگا سو یہاں کے وصف عنوانی سے ہے یہ معلوم ہوگیا کیونکہ خطاب کی صفت یا کیفیت انہیں بیان فرمائی بلکہ خطاب کرنے والوں کی صفت بتا دی کہ وہ جاہل ہیں۔یہ ظاہر ہے جب وہ جاہل ہیں تو خطاب بھی جاہلیت ہی کا ہوگا۔تو یہاں جہالت کی بات کا جواب بھی قَالُوْا سَلَامًا ہے۔یعنی جہالت کے طریق پر جواب نہیں دیتے۔

اسی طرح اور ایک مقام ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ کفار کی گستاخیوں پر مسلمانوں کو بے حد غیظ وغصہ آتا تھا۔ وہ نامعقول یہ کرتے تھے کہ اپنے اشعار میں مسلمانوں کی بیویوں کا نام لے لے کر اظہار تعشق کرتے تھے اس سے بڑھ کر اور کیا گستاخی اور موجب غیظ ہوگا؟ وہ اس حد سے بھی بڑھ کر اور بھی ایک گستاخی کرتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو بجائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مذمم کہتے تھے۔ (نعوذ باللہ) کیونکہ جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی بہت زیادہ محمود الاخلاق اور ستودہ صفات کے ہیں۔ اسی طرح مذمم کے معنی اس کے مقابلہ میں ہیں۔ (نعوذ باللہ) خیال تو کیجئے کہ مسلمانوں کو کس قدر ناگوار ہوتا ہوگا کہ جان لینے اور جان دینے کو تیار ہو جاتے ہوں گے۔ مگر اتنی بڑی گستاخی اور ایسے سخت موجب غیظ پر حق تعالیٰ کی تعلیم سنیئے۔ فرماتے ہیں:

لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوْا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْآ اَذًی کَثِیْرًا. وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ لتبلون اِلٰی آخرہٖ۔

یعنی جان اور مال میں تمہاری آزمائشیں ہوگیں۔ وَلَتَسْمَعُنَّ اِلٰی آخرہٖ اور مشرکین اور اہل کتاب سے اذیت کی باتیں سنو گے۔

اس کی تفسیر میں مفسرین نے یہی واقعہ لکھا ہے کہ وہ اپنے اشعار میں مسلمانوں کی بیویوں کا نام لے لے کر اظہار تعشق کرتے تھے۔ اتنی بڑی غیظ وغضب کی باتیں سننے کے بعد فرماتے ہیں۔ اِنْ تَصْبِرُوْ اوَتَتَّقُوْا کہ اگر تم صبر کرو اور بچو (یعنی جہالت کی باتوں سے) تو یہ بڑی عزیمت کی بات ہے:

اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوْا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ.

میرے بندوں سے فرما دیجئے کہ وہ نرم بات کہا کریں۔

اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ۔ شیطان درمیان میں جھڑپ کرانا چاہتا ہے جب جھڑپ اور لڑائی ہوگی تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ دونوں طرف سے عداوت بڑھ جائے گی۔

• إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا.

بے شک شیطان انسان کیلئے کھلا ہوا دشمن ہے تو یہ تو قرآن مجید میں ادب بتایا گیا۔

اب حدیث سنئے کہ سب سے بڑھ کر شرارت اور گستاخی کفار کی یہ تھی کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مذمم سے بدل لیا تھا اور مذمم کی سخت ہجو کیا کرتے تھے آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ ایسے سخت الفاظ سن کر مسلمانوں کا کیا حال ہوتا ہوگا پھر مسلمان بھی ہمارے آپ کے سے نہیں بلکہ اس وقت کے مسلمان، مگر قربان جایئے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے ایسی سخت بات کو مسلمانوں کے دلوں سے کیسا ہلکا کیا ہے۔ فرماتے ہیں

انظروا كيف صرف الله عنى شتم قريش. (سنن النسائی کتاب الطلاق باب : ۲۶)

"یعنی دیکھو شتم قریش کو خدا نے مجھ سے کیسے ہٹا لیا۔"

يشتمون مذمما و يلعنون مذمما وانا محمد.

کہ وہ شتم ولعنت کرتے ہیں مذمم پر اور میں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ تو خدا نے مجھے گستاخی سے کیسے بچا لیا۔ کیونکہ انہوں نے جو برائی کی وہ مذمم (یعنی برے آدمی کی برائی کی) نام تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی حمد کئے گئے ہیں) جو مذمم ہوگا، وہ برا مانے گا اگر چہ مذمم سے ارادہ ونیت تو ان کم بختوں کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی گستاخی کی تھی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے غیض وغضب کو ہلکا کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ میاں یوں دل کو سمجھا لیا کرو کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نام مبارک ہے ہی نہیں۔

بہر حال وہ حق تعالیٰ کی تعلیم تھی اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے جب جہل کے مقابلہ میں بھی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خشونت پسند نہیں تو مناظرہ میں تو کب پسند ہوگی اسی لئے ارشاد ہوا: وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ

یعنی مجادلہ ایسے طریقہ پر کرو جو احسن ہو۔ اسلام میں وہ تہذیب ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی اور قوم نہ تہذیب کا دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ کوئی نمونہ پیش کر سکتی ہے، تو یہ تہذیب مانع ہے اس سے کہ مناظرہ میں خشونت ودل آزاری کی باتیں ہوں۔ غرض نصیحت میں اپنی طرف

سے سختی نہ کرے۔ باوجود اس کے اگر کوئی برا مانے تو مانا کرے اپنے فعل کا تو انتظام ہو سکتا ہے کہ برا ماننے کا طرز نہ اختیار کرے مگر دوسرے کے فعل کی فکر و پروا نہ کرے۔

دعوت و اندیشۂ اذیت

ہاں نہی عن المنکر میں اگر اندیشہ ہو۔ ایسی اذیت کا کہ جس اذیت کا یہ متحمل نہ ہو تو اس وقت نہی عن المنکر معاف ہے اور جہاں ایسی اذیت نہیں۔ فقط یہ اندیشہ ہے کہ مخاطب برا مانے گا یا ہمارا مرتبہ اس کی نظر میں کم ہو جاوے گا یا ہمیں شاید کچھ دینے کا ارادہ رکھتا ہو تو نہ دے گا یہ سب خیال فاسد ہیں اس وجہ سے نہی عن المنکر معاف نہیں ہے مگر اب تو یہ نوبت ہے کہ محض اپنے حفظ جاہ و مال کے لئے نہی عن المنکر سے بچتے ہیں۔ اللہ کے بندے ایسے بھی تو ہوتے ہیں کہ نہی عن المنکر یا امر بالمعروف میں اندیشہ تو کیا، مقاسات اذیت بھی ہو جاوے تب بھی وہ باز نہیں آتے۔

چنانچہ حکایت ہے کہ ایک مقام پر جامع مسجد میں ایک تاجر عطر آیا۔ جماعت کے بعد لوگ حسب معمول سنتیں پڑھنے لگے۔ اتفاق سے نمازیوں میں کوئی بڑے عہدہ دار بھی تھے۔ وہ سنتوں میں وہی رسمی اٹھک، بیٹھک کرنے لگے جس میں ارکان کی تعدیل نہ تھی جب سلام پھیرا تو اس تاجر نے جو ایک غریب آدمی تھا سامنے آ کر سلام کیا اور عرض کیا حضور! آپ کی نماز ٹھیک نہیں ہوئی اسے پھر دوبارہ پڑھ لیجئے۔ کیونکہ آپ کے وقت کا بڑا قلق ہے کہ یونہی رائیگاں جا رہا ہے۔ اس نماز سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پس اتنا سننا تھا کہ مارے غصہ کے آگ بن گئے کہ نالائق بے ہودہ تیری یہ جرأت۔ ارے تجھے کہا چپ رہ۔ خبردار جو پھر ایسی گستاخی کی۔ اس نے کہا صاحب یہ گستاخی نہیں خیر خواہی ہے کہ نماز پھر پڑھ لیجئے۔ بہرحال دونوں میں یہاں تک گفتگو بڑھی کہ عہدہ دار نے اسے مارا۔ اس نے کہا کہ آپ اور مار لیجئے مگر میں آپ کو مسجد سے نہ نکلنے دوں گا جب تک آپ نماز نہ دہرائیں گے جب شور و غل زیادہ ہوا تو چاروں طرف سے لوگ جمع ہو گئے اور عہدہ دار صاحب سے کہا کہ اس میں اس قدر برا ماننے کی کیا بات ہے سچ تو کہتا ہے کیوں نہیں پھر پڑھ لیتے غرض اس نے انہیں نماز پھر پڑھوائی۔ پھر تو ایسی تعدیل سے پڑھی کہ شاید عمر بھر میں یہ اول نماز ہوگی۔ کیونکہ اگر یہ بھی ویسی ہی پڑھتے تو پھر جھگڑا ہوتا۔ جب وہ عہدہ دار نماز پڑھ کے چلے گئے، تو اس تاجر کی بستی میں خوب شہرت ہوئی۔ لوگ اسے بزرگ

سمجھنے لگے اور جدھر جاتا ہے لوگ کہتے ہیں حضرت ذرا یہاں بیٹھ جایئے اور ذرا ہمارے گھر تشریف لے چلئے۔ اب لوگ ضرورت سے نہیں بلکہ تبرکاً عطر خریدتے ہیں۔ داموں میں بھی کچھ تکرار نہیں کرتے کہ اگر زیادہ بھی چلے جائیں گے تو برکت ہی ہوگی غرض اس کا سب عطر بھی خوب بکا اور دین کی ایک بات سے دنیا کا بھی فائدہ ہوگیا۔

تائید منکر

غرض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے لئے سختیاں برداشت کرتے ہیں اور ایک ہم سوال ہیں کہ نہی عن المنکر اس لئے نہیں کرتے۔ کہ آپس میں ویسا انبساط نہیں رہے گا۔ وہ شگفتگی باقی نہیں رہے گی۔ اذیت کا اندیشہ تو کیا ہوتا۔ محض انشراح کی کمی بھی نہیں چاہتے اور اگر اس خوف کے ساتھ طمع بھی ہو تو پھر کچھ نہ پوچھئے۔ منع کرنا تو درکنار بلکہ خوشامد کے مارے خود اس منکر کی الٹی تائید کرتے ہیں اگر امراء میں سے کوئی شطرنج کھیلتا ہو اور کوئی دوسرا ٹوکے تو چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ خود منع کرتے اور اگر منع کرنے کی ہمت نہ تھی تو خاموش رہتے، یہ بھی نہیں بلکہ یہ کہہ دیں گے کہ ہاں امام شافعیؒ نے شطرنج کو مباح کہا ہے حالانکہ اب ان کا بھی یہ قول نہیں رہا۔ انہوں نے بھی اس سے رجوع کرلیا ہے اور جب یہ قول تھا تب بھی اس شرط سے تھا کہ اس میں قمار نہ ہو اور دوسری ضرورتوں میں اس کی وجہ سے خلل واقع نہ ہو۔ آپ کسی شطرنج باز کو دیکھ لیجئے کہ اسے دنیا کی کچھ خبر نہیں رہتی۔

ضلع سہارنپور کے ایک شاطر کی حکایت ہے کہ اس کا لڑکا سخت بیمار تھا۔ وہ نزع میں مبتلا ہوا۔ یہ شطرنج میں مبتلا تھا۔ گھر میں سے ماما آئی کہ لڑکے کی بہت بری حالت ہے، چلئے گھر میں بلایا ہے کہا چلو آتے ہیں۔ پھر آئی، پھر آئی، ان کا وہ ایک ہی جواب، حتیٰ کہ اس کا انتقال بھی ہوگیا تب بھی وہ سبق کہ اچھا چلو آتے ہیں۔ اب اسے غسل دیا جارہا ہے۔ اچھا چلو آتے ہیں۔ کفن دیا جارہا ہے اچھا چلو آتے ہیں۔ وہاں تو یہ فکر ہے کہ کہیں ہار نہ جاویں۔ ایک ایک بازی میں ساری ساری رات گزر جاتی ہے اور ایسا انہماک ہوتا ہے کہ اپنے کھانے پینے اور کسی کے مرنے جینے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ تو نماز کی کسے پروا ہوتی ہے۔

بالکل اس کی خاصیت وہی ہے جو قرآن مجید میں شراب کی بیان کی گئی ہے کہ: وَ يُصَدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ۔ یعنی شراب تم کو خدا کی یاد سے روکتی ہے۔ اب آپ خود ہی غور کیجئے کہ شطرنج میں خدا یاد آتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ الغرض ان حضرت ماوّل صاحب کو اس سے بحث نہیں کہ شطرنج میں خارجی کتنے مفاسد ہیں یہ تو لالچ کے مارے کہہ دیں گے کہ بعض ائمہ کے نزدیک مباح ہے تو یہ حالت ہے طمع میں دین فروشی پیدا ہو جاتی ہے کہ خود تو کیا منکرات سے منع کریں گے اگر کوئی اور بھی منع کرے تو اس کا معارضہ کریں گے۔

علماء کی طرف سے ترک دعوت کا نتیجہ

الغرض دیکھ لیجئے کہ رات دن کے ہمارے اوقات میں دعوت الی اللہ کے (جس کے شعبے ہیں دعوت الی الطاعات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) حصہ میں کئی منٹ آتے ہیں غرض دوسرے کی اصلاح کی ذرا بھی فکر نہیں ہے۔ خلاصہ اس مضمون کا یہ ہے کہ اپنی اصلاح کے ساتھ دوسرے کو بھی خطاب ہونا ضروری ہے، خواہ وہ خطاب خاص ہو یعنی جس شخص کا جس پر اثر خاص ہے اس کو روزمرہ کی مخالطت و مکالمت میں ضروریات دین سے آگاہ کیا جاوے۔ جیسے اپنے اہل وعیال، دوست واحباب اور ملنے جلنے والوں کو آگاہ کیا۔ خواہ خطاب عام ہو کہ مجمع عام کو وعظ کے طور پر پند ونصائح کی جاویں۔ خواہ وہ اہل اسلام ہوں۔ خواہ غیر اہل اسلام۔

مگر خطاب خاص کی طرح اس خطاب میں عام یعنی وعظ کے باب میں کس قدر کوتاہی ہے ہم لوگ لکھے پڑھے کہلاتے ہیں پس طالب علموں کے پڑھانے کو بڑی معراج سمجھتے ہیں مگر جو غایت اصلی اور غرض صحیح تعلیم و تعلم سے ہے اور جو انبیاء علیہم السلام کا خاص کام ہے یعنی تبلیغ و اشاعت جو بذریعہ وعظ ہوتی ہے اس کا کہیں پتہ بھی نہیں۔ بلکہ جو اساتذہ علامہ کہلاتے ہیں وہ اسے موجب تذلیل و تحقیر و باعث استخفاف اور ننگ و عار سمجھتے ہیں اور اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ وعظ کہنا جاہلوں کا کام ہے بس جی جب تم نے اسے جاہلوں کا کام سمجھ کر چھوڑ دیا تو پھر جاہلوں ہی نے اسے لے لیا جنہیں معانی کی تو کیا خبر ہوتی۔ الفاظ تک درست اور صحیح ادا نہیں کر سکتے لوگوں نے وعظ کہتے دیکھ کر انہیں عالم سمجھ لیا اور عالم سمجھ کر بعد وعظ کے فتویٰ پوچھنے شروع

کردیئے۔ یہ بے چارے عالم تو تھے نہیں مگر یہ کہتے شرم آئی کہ مجھے مسائل نہیں معلوم۔ مجبوراً جو جی میں آیا بتادیا اور غلط سلط فتویٰ دے دیا حدیث شریف میں ہے:

اتخذوا رؤساً جهالاً فافتوا بغير علمٍ فضلوا واضلوا

کہ آخر زمانہ میں لوگ سردار بنالیں گے جاہلوں کو۔ جو بغیر علم کے فتویٰ دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے۔ لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے تو یہ نوبت کیوں آئی صرف اس لئے کہ جن کا یہ کام تھا انہوں نے چھوڑ دیا اور اپنے لئے موجب استخفاف سمجھا۔ حالانکہ یہ حضرات انبیاء کا اصل کام تھا۔ ان حضرات نے سوائے وعظ و پند اور تبلیغ و اشاعت کے کبھی مدرسہ نہیں بنایا۔

ضرورت مدارس

مگر اس سے یہ شبہ نہ ہو۔ کہ جب انبیاء علیہم السلام نے مدرسہ نہیں بنایا تو مدرسے بے کار ہیں۔ یہ بے کار نہیں ہیں۔ یہ نماز کے لئے بمنزلہ وضو کے ہیں کہ جس طرح نماز کے لئے وضو ضروری ہے اسی طرح تبلیغ و اشاعت کے لئے مدارس کا وجود ضروری ہے۔ ہاں بعد فراغ تبلیغ و اشاعت سے باز رہنا ایسا ہی ہے جیسا کوئی وضو کر کے نماز نہ پڑھے۔ تو وہاں مدارس کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ علوم کا محفوظ رہنا عادۃً ان پر موقوف نہ تھا علوم سماع سے محفوظ تھے اور وہاں رات دن ان کی تبلیغ و اشاعت ہی سے کام تھا۔ سفر میں، حضر میں، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، شغل ان حضرات کا دعوت الی اللہ ہی تھا تو جو کام انبیاء علیہم السلام کا اصلی کام تھا اس کو موجب عار و استخفاف سمجھنا کتنی بڑی غلطی و گستاخی ہے۔

اب رہا یہ کہ پڑھنا پڑھانا پھر کیوں ضروری ہوا۔ اصل تو یہی تھا کہ ایک دوسرے کو یونہی کہتے رہتے مگر نہ تو سلف کا سا تقویٰ رہا۔ نہ حافظہ، اگر ایسے ہی رہنے دیا جاتا تو یہ اطمینان نہ تھا کہ سنے ہوئے مسائل یاد رہیں گے۔ دوسرے تقویٰ کی کمی سے دیانت بھی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے تو اس حالت میں یہ بھی اعتماد نہ تھا کہ جو نقل کرتا ہے راوی سے یہ ٹھیک بھی ہے یا اپنی طرف سے کچھ کمی بیشی کر رہا ہے جب یہ آثار ظاہر ہونے لگے تو سلف صالحین کو توجہ ہوئی کہ دین کو ضبط کرنا چاہیے۔

چنانچہ اسی بناء پر انہوں نے راویوں کے تذکرے (اسماء الرجال) لکھے کہ کون راوی قوی الحافظہ ہے۔ کون ضعیف الحافظہ۔ ان کی ولادت و وفات کی تاریخیں اور ان کے سفر و تحصیل علم کے واقعات جمع کئے کہ کس نے اس سے سیکھا اور اس نے کس سے سیکھا۔ انہی اعتبارات سے احادیث کے بہت سے اقسام بن گئے اور اب کسی حدیث میں شبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ خوب پرکھ لیا گیا ہے کہ کون سی حدیث کس درجہ کی ہے پھر حدیثوں سے احکام مستنبط کر کے مدون کر دیئے کہ احکام کے سمجھنے میں گڑبڑ نہ ہو تو تبلیغ و اشاعت کے لئے علم صحیح کی ضرورت تھی اور اس کے محفوظ رکھنے کے لئے کتابوں کو لکھے جانے کی ضرورت ہوئی۔

پھر یہ ضرورت ہوئی کہ ایک باقاعدہ جماعت ہو جن کا کام صرف اس طریق سے دین کی حفاظت ہو۔ اس کے لئے پڑھانے والوں کی ضرورت ہوئی۔ اس کی ایک تو یہ صورت تھی کہ جہاں موقع مل گیا کسی سے پوچھ لیا راستہ میں کسی سے ایک سطر، کسی سے دو سطر حل کر لیں۔ تو اس طرح باقاعدہ تحصیل نہیں ہو سکتی تھی اس لئے مستقل جماعت کی ضرورت ہوئی کہ وہ ہر وقت اس کے لئے تیار رہیں کہ جو ان سے پوچھنے آئے اسے قاعدہ کے ساتھ بتائیں۔ پھر اس جماعت کے لئے سامان فراغ کی ضرورت ہوئی کہ کھانے پینے، رہنے سہنے کا ان کے لئے کافی انتظام ہو۔ اس طرح مدارس کی ضرورت پیدا ہوگئی۔ تو بہر حال اصل کام دعوت الی اللہ ہے۔ اور اس کے محفوظ و قائم رکھنے لئے مدارس کی ضرورت ہے۔ اب یہ چاہیے کہ جب مدارس سے علم ضروری حاصل کر لیں تو دعوت الی اللہ بھی کیا کریں۔ جس کا آسان ذریعہ وعظ ہے اور پڑھنا پڑھانا اس کا مقدمہ ہے۔ اس لئے یہ شغل بھی ضرور رکھیں۔ جیسے نماز کے لئے وضو اور وضو کے لئے پانی اور لوٹوں کا جمع کرنا ضروری ہے۔ ایسے ہی تبلیغ کے لئے پڑھنا پڑھانا ضروری ہے مگر اگر کوئی شخص وضو اور لوٹوں ہی کے اہتمام میں رہے اور پانی ہی بھرا کرے اور نماز کا وقت گزر جاوے۔ تو کیا یہ شخص قابل مدح ہے؟ پس اسی طرح پڑھنا پڑھانا دعوت الی الحق کے صرف مقدمات ہیں مگر اب ان مقدمات میں ایسی مشغولی ہوئی کہ اصل کام کو بھی بھول گئے۔ افسوس جو لوگ اس کے اہل تھے وہ بھی اس کو بھولے ہوئے ہیں۔ کہ وہ مقدمات ہی میں مشغول ہیں۔ مقصود میں وقت صرف نہیں کرتے۔

فضیلت دعوت

حق تعالیٰ ان آیات میں جو شروع میں تلاوت کی ہیں۔ اسی عمل کی فضیلت بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآاِلَی اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْن

ترجمہ: کون شخص ہے زیادہ احسن آزروئے قول کے اس شخص سے جو خدا کی طرف بلاوے، استفہام انکاری ہے یعنی اس سے اچھا کسی کا قول نہیں جو اللہ کی طرف بلاوے۔ احسن سے معلوم ہوا کہ اچھی باتیں تو اور بھی ہیں مگر جتنی اچھی باتیں ہیں ان سب میں زیادہ اچھی بات دعوت الی اللہ ہے۔ استفہام بقصد نفی ہے۔ سبحان اللہ! کیا بلاغت ہے کہ پوچھتے ہیں کون ہے احسن ازروئے قول کے۔ اس میں مبالغہ زیادہ ہے۔ کیوں کہ عادت ہے کہ جس جگہ پر تردد ہوتا ہے کہ کوئی خلاف جواب دیدے گا۔ وہاں پوچھا نہیں کرتے۔

مثلاً یوں کہتے ہیں کہ میاں فلاں تجارت سے اچھی کون سی تجارت ہے یہ وہاں کہتے ہیں۔ جہاں مخاطب کو متکلم کی رائے سے اختلاف نہ ہو اور جہاں یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید مخاطب خلاف جواب دے دے وہاں پوچھا نہیں کرتے۔ بلکہ یوں بتلاتے ہیں کہ میاں اس سے اچھی کوئی تجارت نہیں اور جہاں یہ احتمال نہیں ہوتا بلکہ اعتماد ہوتا ہے کہ مخاطب بھی پوچھنے پر یہی جواب دے گا وہاں پوچھا کرتے ہیں کہ تمہیں بتلاؤ کہ کون سی بات زیادہ اچھی ہے کیونکہ ظاہر بات ہے کہ بدیہی اور حسی بات کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ اسی طرح اس دعوت الی اللہ کی فضیلت اتنی صاف بدیہی اور محسوس تھی۔ کہ صرف پوچھنا کافی ہو گیا۔ گویا یہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ اس سے اچھی فلاں بات ہے تو استفہام میں تو یہ بلاغت ہے۔

احسن قولا کی تحقیق

اب احسن قولا کی تحقیق رہی۔ سو یہ افعل التفضیل کا صیغہ ہے یعنی کس کی گفتگو سب سے اچھی ہے۔ وجہ اس ترجمہ کی ظاہر ہے کیونکہ احسن باعتبار قصد کے سنت ہے قولا کی اور

اقوال ہی کے اعتبار سے اس کی تفصیل بھی ہے اور چونکہ مفضل جنس مفضل علیہ ہی سے ہوتا ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ سب قولوں سے اچھا اس شخص کا یہ قول ہے اور یہاں تک تو کوئی اشکال نہ تھا مگر آگے ارشاد ہے و عمل صالحا اور عمل صالح بھی کرے، اس جملہ کو اس کے معطوف علیہ کے ساتھ ملانے سے حاصل یہ ہوا کہ سب سے اچھی بات اس شخص کی ہے جو دعوت الی اللہ کرے اور نیک کام کرے۔

اس میں اشکال یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کو تو احسنیۃ قولاً میں دخل ہوسکتا ہے کیونکہ وہ خود قول ہے اور سب سے احسن مگر عمل صالح کا اس میں کیا۔ کیونکہ وہ فعل ہے قول نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ وہ قول نہیں مگر آداب و مکملات قول سے ہے اس لئے یہ بھی قول کے احسن ہونے میں دخیل ہے تو حاصل یہ ہوا کہ صاحب قول احسن وہ ہے جو دعوت الی اللہ بھی کرے اور اس کے ساتھ ہی خود عمل بھی اچھا کرے یعنی جو کچھ کہے اس کے موافق عمل بھی کرے تب وہ صاحب قول احسن ہے۔

اس پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ کوئی بہت اچھی بات کرے اور عمل اچھا نہ کرے تو قول تو اچھا ہے گو عمل نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی دعوت الی الاسلام کرے اور خود مسلمان نہ ہو۔ دعوت الی الصلوٰۃ کرے اور خود نمازی نہ ہو۔ اسلام کے اوصاف بیان کرے اور خود ان پر عقیدہ نہ رکھے۔ تو اس پر من احسن قولاً تو صادق آتا ہے کیونکہ اس کے معنی قولہ احسن ہیں۔ یعنی جس کی بات بہت اچھی ہو وہ احسن قولاً ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب اگر کوئی خود عمل نہ کرے تو اس کے قول کے احسن ہونے میں کیا خلل رہا۔ اگر اس نے خود نماز نہ پڑھی تو اس کا یہ قول تو احسن ہے زائد سے زائد یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمل احسن نہیں تو اس سے قول کے احسن ہونے میں کیا خلل پڑا۔

اس کا جواب بنص قرآنی بجز اس کے کچھ نہیں ہوسکتا کہ قول کے اچھے ہونے میں عمل کے اچھے ہونے کو بھی دخل ہے۔

اقسام داعی

اور اس بناء پر اس آیت سے ایک مسئلہ بھی مستنبط ہوا۔ کہ داعی دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک صاحب عمل صالح، ایک غیر صاحب عمل صالح، اول کا قول یا دعوت احسن ہے۔ ثانی کا قول یا دعوت غیر احسن ہے باقی یہ کہ اس کی لم کیا ہے کہ دعوت بلا عمل صالح غیر احسن ہے۔

تو اول یہ سمجھنا چاہیے کہ احسن ہونا کیوں ہے۔ سو بات یہ ہے کہ ہر شے کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے اور اس کی غایت ہوتی ہے تو قول احسن کی بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک طاعت ہے اور ایک اس کی غایت ہے اور وہ غایت یہ ہے کہ وہ دعوت سبب ہے دوسرے شخص کے رجوع الی الخیر کا۔ تو دعوت الی اللہ کو جو اچھا کہا گیا۔ دو وجہ سے کہا گیا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یہ سبب ہے لوگوں کے متوجہ الی اللہ ہونے کا۔ تو یہ احسنیت تو باعتبار غایت کے ہے اور دوسری اس وجہ سے کہ وہ فی نفسہا طاعت ہے اور دونوں درجوں میں اس کا احسن ہونا مشروط ہے۔ عمل صالح کے ساتھ۔

دعوت میں سبب نورانیت

اس کے لئے ایک دوسرا مقدمہ سمجھئے کہ طاعت کے دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک کی نورانیت قوی اور ایک کی نورانیت ضعیف ہوتی ہے اور اس قوت نورانیت کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک طاعت کرنے سے دوسری طاعت میں نور بڑھتا ہے جس سے اس کی نورانیت قوی ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک چراغ کی روشنی ہلکی ہوتی ہے اور دوسرا چراغ بھی جلا دیا جائے۔ تو اس پہلے چراغ کی روشنی اور نورانیت میں اضافہ ہو جائے گا سو طاعات میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک طاعت دوسری طاعت کے نور کو بڑھاتی اور قوی کرتی ہے چنانچہ عابدین و سالکین خوب جانتے ہیں۔ کہ اگر اتفاق سے ایک عمل قضا ہو جائے۔ تو دوسرے عمل میں وہ لطف محسوس نہیں ہوتا۔ اگر ایک دن تہجد قضا ہو جاوے تو سارے دن کی عبادت میں وہ لطف محسوس نہیں ہوتا۔ جو پہلے ہوتا تھا:

بر دل سالک ہزاراں غم بود گرز باغ دل خلالے کم بود

(اللہ والے کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں۔ اگر چہ دل کے باغ میں ایک تنکا بھی کم ہو جائے)

یعنی باغِ دل میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے تو ہزاروں غموں کا سامنا ہوتا ہے سو یہ

حالت مشاہدہ ومحسوس ہے اسی طرح اسی طاعت یعنی دعوت الی اللہ کا نور بھی دوسری طاعت یعنی عمل صالح سے قوی ہوتا ہے۔ یہ تو احسنیت باعتبار حقیقت کے ہے۔

داعی بے عمل

اب احسنیت باعتبار غایت کو سمجھئے وہ یہ کہ دعوت الی اللہ یعنی وعظ کا مقصود فی نفسہ کیا ہے ظاہر ہے کہ اتعاظ یعنی مخاطب کا متوجہ الی اللہ ہو جاتا ہے یعنی اس کا اثر فی نفسہ یہی ہے گو کسی عارض کے سبب اس کا ترتب نہ ہو اور عمل صالح کو اس غایت کے اعتبار سے احسنیت میں یہ دخل ہے کہ مشاہدہ ہے کہ اگر ناصح خود عمل نہ کرے تو اس کی نصیحت میں اثر نہیں ہوتا اور جو خود عمل کرتا ہے، اس کی نصیحت میں اثر ہوتا ہے۔

اور علاوہ تاثیر فی نفسہ کے اس کا ایک طبعی سبب بھی ہے وہ یہ کہ اگر خود اس پر ناصح کا عمل نہ ہو تو مخاطب کو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ عمل ضروری ہوتا تو یہ ناصح خود کیوں نہ کرتا۔ معلوم ہوتا ہے غیر ضروری ہے۔

چنانچہ ایک طبیب کی حکایت ہے کہ وہ ہر مریض کو یہ بتایا کرتے تھے کہ پانی پینا چھوڑ دو اور خود خوب کثرت سے پیتے تھے۔ اس لئے مریض کو شبہ ہو جاتا تھا کہ پانی کوئی ایسی مضر چیز نہیں۔ ورنہ حکیم صاحب خود کیوں پیتے۔ چنانچہ اس کو محسوس کر کے ان طبیب نے اپنی نصیحت پر آخر عمر میں ایک نہایت مؤثر عمل کیا کہ مرتے وقت جب موت کی تشنگی ہوئی۔ تو شربت پیش کیا گیا۔ تو کہا میں نہیں پیوں گا۔ زندگی بھر تو لوگوں کو پیاسا رکھا کہ ان کو پانی پینے سے منع کرتا رہا ان کی پیاس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اب اخیر وقت میں تو کم از کم ان کا ساتھ دوں گا چنانچہ شربت نہ پیا اور جان نکل گئی۔ حضرت پر اس واقعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ ان کی برائی پر عمل ہونے لگا۔ تو عمل وہ چیز ہے کہ نصیحت کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے۔

ایک جگہ میں گیا۔ وہاں ایک اسکول بھی تھا جس میں مسلمانوں کے بچے پڑھتے تھے اور ماسٹر اس کا ہندو تھا۔ وہاں لوگوں نے مجھ سے ماسٹر صاحب کی بڑی تعریف کی۔ کہ یہ روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھوانے کے لئے لڑکوں کو مسجد لے جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ

ان کا نماز پڑھوانا کچھ مفید نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ روزانہ پانچ وقت بچوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ اگر نماز کوئی ضروری چیز ہے تو ماسٹر صاحب خود کیوں نہیں پڑھتے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ نماز پڑھوانے والا مسلمان ہونا چاہیے اور حقیقت میں یہی ہوتا ہے کہ علماء باعمل کا جو اثر ہوتا ہے وہ علمائے بےعمل کا نہیں ہوتا۔

میں نے خود ایک مقام پر ایک واعظ صاحب کو دیکھا کہ صبح کی نماز نہیں پڑھی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مقام پر میں بلایا گیا تھا اور وہ واعظ صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ اس شان سے کہ سیکنڈ میں سفر کیا اور اپنے ساتھ دس پندرہ مصاحبوں کو بھی لائے۔ بےچارہ سیکرٹری کہتا تھا کہ میرا تو انہوں نے کورٹ کروادیا، میں کیا جانتا تھا کہ وہ اس قدر خرچ کردیں گے۔ خیر جب وہاں پہنچے۔ بارش کا موسم تھا۔ میں تو برآمدہ میں لیٹ رہا۔ مگر ان حضرات سے یہ گوارا نہ ہوا کہ برآمدہ میں لیٹتے۔ آپ اندر لیٹے اور وہاں گرمی تھی۔ سیکرٹری سے بلاکر کہا کہ دو آدمی رات بھر پنکھا جھلنے کے لئے متعین کرو۔ تاکہ رات بھر باری باری پنکھا جھلیں۔ چنانچہ سیکرٹری کو یہ بھی کرنا پڑا۔ صبح کو پانی زور سے برس رہا تھا جس سے مسجد میں جانا مشکل تھا۔ اس لئے میں نے تو اٹھ کر وہیں نماز پڑھ لی مگر وہ حضرت اندر ہی پڑے سوتے رہے اور صبح کی نماز اڑا دی اب جن کو انہوں نے وعظ سنایا ہوگا۔ بھلا ان پر کیا اثر ہوا ہوگا۔

بے عملی سبب ترک دعوت نہیں

مگر اس تقریر سے کہیں یہ نہ سمجھنا کہ اگر عمل نہ ہو۔ تو وعظ ہی نہ کہے جیسا بہت لوگوں کو یہ بھی غلطی ہو جاتی ہے۔ واقعی اس طریق میں ہر ہر قدم پر لغزشیں ہیں۔ جن سے بچنے کے لئے نہایت ہی صحیح علم کی ضرورت ہے ؂

در راہ عشق وسوسۂ اہرمن بسے ست ہشدار و گوش راہ بہ پیام سروش دار

(راہ عشق میں شیطانی وسوسے بہت ہیں۔ ہوشیار رہو اور اس کے احکام پر کان لگائے رہو۔)

یعنی قدم قدم پر شیاطین کے وسوسہ ہیں۔ ان سے ہوشیار رہو اور اپنے کان وحی کی طرف لگائے رکھو تو ایک وسوسہ تو یہ ہوا تھا کہ عمل نہیں کیا اور نصیحت شروع کی۔ دوسرا وسوسہ

یہ ہوا کہ جس روز عمل کی ضرورت سمجھ میں آئی تو نصیحت ہی چھوڑ دی۔

جیسے ایک نیم ملا نے گاؤں کے ایک چودھری کو مسئلہ بتایا۔ کہ نیت بغیر روزہ نہیں ہوتا۔ اس نے پوچھا نیت کیا ہے؟ آپ نے کہا نیت یہ ہے اَللّٰھم وبصوم غد نویت دوسرے روز جو دیکھا تو چودھری مزہ سے بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ پوچھا، ارے یہ کیا۔ روزہ نہیں رکھا؟ اس نے کہا صاحب! میں کیا کروں بدوں نیت روزہ ہوتا نہیں اور نیت ابھی یاد نہیں ہوئی اس میں اس کی بھی غلطی ہے کہ یہ مسئلہ پھر پوچھ لیتا۔ کہ اگر کسی کو نیت یاد نہ ہو تو کیا کرے، اور مولوی صاحب کی بھی غلطی ہے کہ خواہ مخواہ انہوں نے گنوار کو عربی میں نیت بتلائی۔ اول تو زبان سے کہنا ہی ضروری نہیں اور اگر کسی کو کہنا ہی ہے تو اردو بھی کافی ہے اس چودھری کی حالت ہم جیسے طالب علموں کی ہے کہ وعظ کے لئے عمل کی ضرورت سنی۔ تو یہ تو نہ ہوا کہ عمل شروع کرتے نہیں بلکہ وعظ ہی حذف:

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

کبھی ایک غلطی میں مبتلا ہیں، کبھی دوسری غلطی میں اور ہماری حالت اکثر امور میں یہی ہے کہ جو کام کریں گے۔ اس میں خرابی پیدا کرلیں گے۔ جیسے مولانا کا ارشاد ہے:

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی — چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

(جب تو بھوکا ہوتا ہے تو کتے کی طرح بھونکنے لگتا ہے اور جب پیٹ بھرا ہوتا ہے تو اکڑتا ہے اور متکبر ہوجاتا ہے۔)

یعنی یہ حالت ہے کہ بھوکے اور بلا میں مبتلا ہیں، اور پیٹ بھرے اور بلا میں مبتلا ہیں چنانچہ ہمارے بھوکے ہونے کے وقت کے اخلاق ماہ رمضان میں خوب ظاہر ہوتے ہیں۔ کسی کو تمباکو کی بھوک ہے، کسی کو حقہ کی، کسی کو افیون کی۔ پھر دیکھیے کہ اتنے جھلے ہوجاتے ہیں کہ بات بات پر غصہ آتا ہے ذرا سے میں لڑنے کو تیار:

اسی واسطے حق تعالیٰ نے ہمارے اخلاق کا انتظام ایسے مواقع میں خاص اہتمام سے فرمایا ہے چنانچہ روزہ میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے

واذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب الحدیث

(اور جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو۔ تو نہ تو بے ہودہ اور فحش باتیں کرے اور نہ چیخے چلائے)

حج میں مشقتیں بہت آتی ہیں اور اس لئے ذرا ذرا سی چیز لکڑی، پانی اور آگ پر جھگڑا ہو جاتا ہے اس لئے اس کا انتظام اس آیت سے فرمایا:

فَلاَ رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِیْ الْحَجِّ

''کہ بے حیائی اور نافرمانی کی باتیں اور جنگ وجدال یا لڑائی جھگڑا حج میں نہیں ہے۔''

دیکھئے یہ انتظام نماز کے متعلق نہیں فرمایا کیونکہ نماز میں اتنے جھگڑے نہیں پیدا ہوتے۔ اور یوں کسی کی طبیعت ہی میں خرابی ہو۔ وہاں بھی جھگڑے نکال لیتا ہے مگر شاذ، جیسے ہمارے اضلاع میں ایک قصبہ کا واقعہ ہے کہ دو شخص عید گاہ کی امامت کے مدعی تھے دونوں جا کے مصلے پر کھڑے ہو گئے بعض مقتدی ایک کی طرف تھے اور بعض دوسرے کی طرف۔ گویا کچھ ان کے ووٹ دینے والے تھے اور کچھ ان کے۔ غرض تمام صفوف میں دونوں کے مقتدین کا مجمع غلط ملط تھا ایک نے اللہ اکبر کہا۔ تو دوسرے کے مقتدی یہ سمجھے کہ ہمارا امام کہہ رہا ہے اور دوسرے نے کہا تو پہلے کے مقتدی سمجھے ہمارا امام کہہ رہا ہے۔ غرض بڑی پریشانی ہر جزو میں رہی۔ قومہ، رکوع، سجدہ، قعدہ سب میں یہی لطف رہا۔

ایک امام نے الحمد ختم کر لی تو اب دوسرے کا انتظار ہے کہ یہ سورت چھوٹی پڑھتا ہے یا بڑی، اگر بڑی پڑھے گا تو میں چھوٹی شروع کر دوں گا تاکہ پہلے رکوع میں جا سکوں۔ اور اگر چھوٹی سے چھوٹی شروع کرے گا تو میں جلدی جلدی ختم کر کے رکوع کر دوں گا۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رکوع میں پہنچا تو دوسرے کے بعض مقتدی غلطی سے رکوع میں جھک گئے تو پاس والا اس کے کہنی مارتا ہے کہ یہ ہمارا امام نہیں وہ بے چارہ پھر کھڑا ہو گیا تو دیکھئے یہاں ان لوگوں نے نماز میں بھی جدال کھڑا کر لیا مگر حج کے جھگڑوں کے مقابلہ میں یہ مثل شاذ و نادر کے ہے اور وہاں تو بات بات پر ٹھنتی ہے حتی کہ میں نے تو پیر و مرید میں بھی لڑائی ہوتے دیکھی حالانکہ اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی علاقہ ادب واحترام کا نہیں ہوتا، تھے وہ پیر خوش

اخلاق کہ لوٹ کے آئے تو صلح کر لی ۔ پھر پیر پیر ہو گئے اور مرید مرید ہو گئے ۔ خوش اخلاق کیا تھے ۔ بات یہ تھی کہ انہوں نے سوچا کہ پکھ نہ پکھ فائدہ ہی ہے ۔ کیوں اسامیاں کم کرو ۔ غرض ایسے واقعات کے سبب حج میں فرمایا گیا کہ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ علیٰ ہذا روزہ میں بھی جیسا کہ اوپر عرض کیا ہے کہ اس میں بھی ہمارے اخلاق ظاہر ہوتے ہیں ۔

اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کا بھی ایسا ہی انتظام فرمایا چنانچہ اوپر کی حدیث کا یہ بھی تمہ ہے کہ فان سابه احد فليقل انى امرءٌ صائمٌ کہ جو روزہ رکھے ۔ اسے چاہیے کہ غل شور نہ مچاوے اور نہ لڑے جھگڑے اور اگر کوئی اور لڑنے پر آمادہ ہو تو کہہ دے کہ بھائی میرا تو روزہ ہے ۔ علماء نے اس کی دو توجیہیں کی ہیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ کہہ دے کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے کہہ دے جیسا کہ ظاہر لفظ سے معلوم ہوتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ دل میں کہہ لے کہ میرا تو روزہ ہے میں لڑوں جھگڑوں گا تو روزہ خراب ہو جائے گا مگر میرے نزدیک فیصلہ بین القولین یہ ہے کہ فرض میں تو زبان سے کہہ دے اور نفل میں دل سے کہہ لے ۔

بہر حال یہ تو ہماری بھوک کی حالت تھی ۔ اب پیٹ بھرے کی سنئے کہ کیسے اکڑ اکڑ کے چلتے ہیں اور کیسے کیسے ترارے آتے ہیں گویا اپنے آپ ہی میں نہیں ہیں ۔ انہی حالتوں پر نظر کر کے مولانا کا ارشاد ہے :

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی　　　چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

" جب تو بھوکا ہوتا ہے تو کتے کی طرح بھونکنے لگتا ہے اور جب پیٹ بھرا ہوتا ہے تو اکڑتا ہے اور متکبر ہو جاتا ہے ۔

تو ہماری دونوں حالتیں محل ملامت ہیں اسی طرح یہاں بھی کہ وعظ بنے تو عمل کا اہتمام نہیں تھا اور اگر عمل کے لئے کہا گیا تو وعظ ہی چھوڑ دیا کہ عمل تو ہوتا نہیں ، وعظ ہی کیا کہیں اور اگر وعظ سننے والے بھی یہی کہیں کہ جب عمل نہیں ہوتا تو سن کے کیا کریں تو پھر کیا ہو تو گویا دین کا یہ باب ہی مسدود ہو جاوے ۔ بعضے تو یہاں تک غلطی میں ہیں کہ اپنے وعظ کہنے کو شرعاً منہی عنہ سمجھتے ہیں یا اس سے بھی بڑھ کر ہے ان کا متمسک یہ ارشاد ہے :

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ

ایک دوسری آیت میں ہے جو اس سے بھی صاف ہے:

اَتَامُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ

پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں۔ خدا کے نزدیک نہایت مبغوض و ناپسند ہے کہ وہ کہو جو نہ کرو۔ ایک تو اس آیت سے تمسک ہے اور دوسری آیت میں تو ظاہراً نصیحت بلا عمل ہی پر تصریحاً انکار ہے اس لئے اگر اس سے شبہ پڑ جاوے تو کچھ بعید نہیں مگر پہلی آیت یعنی لم تقولون الایۃ کی تو یہ تفسیر ہی نہیں۔ یہ محض ترجمہ دیکھنے سے بناء الفاسد علی الفاسد پیدا ہوتی ہے۔

ابھی میں اس کی تفسیر اور شان نزول بتاتا ہوں۔ مگر اول اس آیت کو سمجھیے۔ جس میں ظاہراً اس کا صریح ذکر ہے مگر اس کے بھی یہ معنی نہیں ہیں کہ ناسی نفس یعنی بدعمل کو وعظ کہنے کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ وعظ کو نسیان نفس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وعظ تو کہو مگر بدعمل مت بنو۔ بلکہ جو نصیحت دوسروں کو کرتے ہو وہ اپنے نفس کو بھی کرو اور اس سے بھی عمل کراؤ۔

اب رہا یہ شبہ کہ ہمزہ استفہام انکاری تامرون پر داخل ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسی نفس کو امر بالبر یعنی وعظ کی ممانعت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اہل علم جانتے ہیں کہ مدخول ہمزہ کا مجموعہ دونوں جملوں کا ہے تو مراد یہ ہے کہ امر بالمعروف اور بدعملی کو جمع نہ کرو۔ تو باحتمال عقلی اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ امر بالمعروف تو کرو۔ مگر بدعملی نہ کرو۔ ایک یہ کہ اگر بدعملی کا وقوع ہو تو پھر امر بالمعروف نہ کرو۔ تو لوگوں نے اس کا مطلب اسی دوسری صورت کو سمجھا کہ عمل بد میں مبتلا ہو تو وعظ چھوڑ دو مگر یہ اس لئے غلط ہے کہ قواعد شرعیہ کے خلاف ہے اگر تم یہ کہو کہ آیت میں اس کا احتمال تو ہے تو ہم کہیں گے کہ اول تو دوسرے دلائل سے اس کا احتمال نہیں رہا اور اگر فرضاً احتمال ہے تو دونوں جانب کا احتمال ہے تو تمہارا تو استدلال اس سے جاتا رہا باقی ہم اس سے استدلال نہیں کرتے جو ہم کو دوسرا احتمال مضر ہو۔ ہمارے پاس ہمارے مدعا کے دوسرے مستقل دلائل موجود ہیں۔

اب رہی پہلی آیت یعنی لِمَ تَقُوْلُوْنَ الایۃ تو یہاں تَقُوْلُوْنَ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے اصل میں قول کے دو معنی ہیں یا یہ کہو کہ قول کی دو قسمیں ہیں ایک قول انشائی، ایک

قول خبری،قول خبری تو یہ کہ تم بذریعہ قول کے کسی بات کی خبر دیتے ہو۔ ماضی کی یا مستقبل کی اور قول انشائی یہ کہ خبر نہیں۔ بلکہ کسی بات کا امر و نہی کرتے ہو۔ تو یہاں پر قول انشائی مراد نہیں۔ قول خبری یعنی ایک دعویٰ مراد ہے چنانچہ شانِ نزول اس کا یہ ہے کہ لوگوں نے کہا تھا کہ ہم کو اگر کوئی ایسا عمل معلوم ہو جائے۔ جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک احب و افضل ہو تو ہم ایسی ایسی کوشش کریں۔ پھر قتال نازل ہونے پر بعض جان بچانے لگے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

پس اس دعویٰ کے متعلق ارشاد ہے کہ ایسی بات کہتے ہی کیوں ہو جو کرتے نہیں، تو اس آیت میں دعویٰ کا قول مراد ہے۔ نصیحت کا قول مراد نہیں۔

چنانچہ ان ہی آیتوں میں اس کا قرینہ بھی اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ ہے بہر حال بلا عمل کے وعظ کہنے کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اس شخص کو عمل کی کوشش کرنی چاہیے اور وعظ کو ترک نہ کرنا چاہیے۔

وعظ بدعمل

البتہ ایسے شخص کا وعظ جو کہ بدعمل ہو، نور و برکت سے ضرور خالی ہوگا، الغرض احسنیت باعتبار غایت کے بھی اور باعتبار حقیقت کے بھی وہیں ہوگی۔ یہاں وعظ کے ساتھ عمل بھی ہوگا اور جہاں نرا وعظ ہوگا اور عمل نہ ہوگا وہاں احسن نہ ہوگا۔ البتہ حسن ضرور ہوگا کیونکہ افعل التفضیل کی نفی سے مجرد وصفت کی نفی لازم نہیں آتی پس حاصل اس مسئلہ کا گویا اصلاح ہے ایک مفسدہ کی جو وعظ کو پیش آتا ہے کہ وہ بدعملی ہے۔

متواضع داعی

اس کی اصلاح کے بعد ایک اور مفسدہ عارض ہو جاتا ہے وہ یہ کہ وعظ اور عمل کے ساتھ ہی اس میں کبر و عجب ہو جاتا ہے کہ میں بڑا صاحب کمال ہوں کہ اللہ میاں کے تمام حقوق ادا کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ اس کے علاج کے لئے آگے تواضع کی تعلیم فرماتے ہیں وَقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ یعنی اس نے یوں بھی کہاں کہ میں مسلمین میں سے ہوں۔

آپ کو غالباً حیرت ہوگی کہ یہ تو دعویٰ ہوا نہ کہ تواضع۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کے عنوانات میں عادت تو دعویٰ ہی کی ہے۔ اس لئے یہاں بھی دعویٰ ہی معلوم ہوتا ہے مگر یہاں مقصود تواضع ہی ہے۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ اسلام ایک ایسی چیز ہے جس میں دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ طاعت کاملہ ہے اور ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ گردن نہادن بطاعت ہے گو یہ بھی کمال ہے مگر عنوان کمال کا نہیں ہے یا یوں کہو کہ اسلام کی ایک ذات ہے اور ایک صفت ہے جب ذات کے اعتبار سے اپنے اسلام پر نظر پڑتی ہے تو اس نظر کا اور اثر ہوتا ہے اور صفت کے اعتبار سے پڑتی ہے تو اور اثر ہوتا ہے۔ ذات تو ہے گردن نہادن بطاعت اور صفت ہے طاعت کاملہ۔ جیسا کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ اس پر دال ہے یعنی خدا کے نزدیک دین صحیح وکامل اسلام ہی ہے اور چونکہ صفت تابع ہوتی ہے ذات کے اس کا مقتضا یہ تھا کہ ہماری نظر اولاً اس کی ذات پر ہوتی۔ مگر اب حیرت ہوگی کہ ہماری نظر اپنے اسلام پر ذات کی حیثیت سے نہیں پڑتی۔ بلکہ صفت کی حیثیت سے پڑتی ہے۔ کہ ہم میں یہ صفت کمال ہے اور اسی بناء پر دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ کمال ہونے میں تو شک نہیں۔ گفتگو تو یہ ہے کہ تابع پر نظر گئی، اصل چیز، یعنی ذات پر کبھی نظر نہ گئی۔ اس لئے دعویٰ پیدا ہو گیا چونکہ اس جملہ کے تکلم میں خود عادت ہے دعویٰ کرنے کی نہ کہ تواضع کی۔ اسی لئے قرآن میں بھی سمجھ گئے کہ دعویٰ میں مستعمل ہے۔ حالانکہ یہاں تواضع مقصود ہے اور دونوں قصد میں لہجہ بھی جدا جدا ہوتا ہے۔ تو بھائی یہ غلطی تو تمہاری ہے۔ کہ بلہجہ دعویٰ پڑھ کر دعویٰ مراد لے لیا۔ تو گویا تم نے معانی کو تابع لہجہ کا بنا دیا۔ لہجہ دعویٰ کا کیوں اختیار کیا۔ لہجہ انقیاد کا کیوں نہ اختیار کیا؟

جیسے ایک شاعر تھے۔ ٹھوس تخلص تھا۔ تخلص ہی سے سمجھ لیجئے کہ وہ کیسے شاعر ہوں گے عموماً ان کے اشعار میں یہ ہوتا تھا کہ ایک مصرعہ چھوٹا ایک بڑا ہوا کرتا تھا۔ کرتے یہ تھے کہ ایک مصرعہ کیف ما اتفق پہلے کاغذ پر لکھ لیا اور اسے سینک سے ناپ لیا۔ دوسرا مصرعہ اسی سینک کے برابر لکھ لیا۔ اگر عبارت زائد ہوئی۔ باریک قلم سے اتنی جگہ میں لکھ لی کسی نے اعتراض کیا کہ تمہارے اشعار میں ایک مصرعہ چھوٹا ایک بڑا ہوتا ہے۔ کہنے لگے کہ مولانا جامیؒ کو تو مانتے ہو کہ وہ کیسے اساتذہ میں ہیں۔ انہوں نے بھی ایک مصرعہ چھوٹا اور بڑا کہا ہے۔ چنانچہ دیکھ:

الٰہی غنچۂ امید بکشا (الٰہی میری آرزو پوری فرما)

اس مصرعہ کو تو خوب ٹھہر ٹھہر کے اور ترتیل کے ساتھ پڑھا۔

گلے از روضہ جاوید بنما (ایک پھول آخرت کے باغ سے مجھے دکھلا)

اس مصرعہ کو خوب جلدی سے پڑھ دیا بس ایک چھوٹا ایک بڑا ہو گیا۔ تو لہجہ کو چھوٹا بڑا بنا کر مصرعوں کو اس کے تابع بنا لیا۔ ورنہ واقع میں تو دونوں مصرعہ برابر ہیں۔ تو صاحب: لہجہ حقائق کے تابع ہے۔ حقائق لہجہ کے تابع نہیں ہیں جہاں ایسا ہوگا وہاں لہجہ کو غلط کہا جائے گا۔ حقائق کو نہ بدلا جاوے گا اسے یوں سمجھیئے کہ کوئی کہے میں طالب علم ہوں۔ اب اس کے دو محل ہیں ایک تو جاہل کے مقابلہ میں کہنا اور ایک کسی بڑے علامہ کے مقابلہ میں کہنا۔ تو جاہل کے مقابلہ میں جو کہے گا تو لہجہ میں ترفع اور دعویٰ کی شان ہوگی۔ کہ میں طالب علم ہوں۔ تم جاہل ہوں۔ میں تم سے بڑھ کر ہوں اور جو علامہ کے مقابلہ میں کہے گا اس کے لہجہ میں خود بخود نرمی اور انکسار ہوگا۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں آپ کے مقابلہ میں کیا چیز ہوں۔ آپ کی بڑی شان ہے۔ آپ علامہ ہیں۔ میں محض ایک مبتدی ہوں۔ تو عقلاء جانتے ہیں کہ لہجہ کے تفاوت سے ایک ہی فقرہ کے دو مدلول ہو گئے۔

اسی طرح وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ میں اپنے دعویٰ کا لہجہ بنا لیا اور اس کی صفت پر نظر کرنے کے اعتبار سے اس لہجہ کو صحیح بھی سمجھ لیا۔ حالانکہ یہاں ذات اسلام مراد ہے۔ ذات اسلام کے کیا معنٰی ہیں۔ انقیاد۔ گردن۔ نہادن بطاعت۔ اسلام کا لفظ عربی ہے۔ آپ نے اس آیت کے ترجمہ میں یہی لفظ دیکھا۔ اس لئے مراد واضح نہیں ہوئی۔ ذرا اپنی زبان میں اس کا ترجمہ کیجئے۔ پھر آپ کو معلوم ہو جاوے گا کہ کیا مراد ہے وہ ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ شخص یہ بھی کہتا ہے یعنی میں تو تابعداری کرنے والا ہوں۔ غلامی کرنے والا ہوں۔ اب بتائے یہ تواضع کی تعلیم ہوئی یا نہیں۔ تو آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ دعوت الی اللہ میں عمل صالح سے جس میں دعویٰ بھی نہیں پیدا ہوتا۔ اس سے اچھا کسی کا قول نہیں۔

عبدیت

اور حقیقت میں دعویٰ کا بندہ کو حق ہی کیا ہے؟ مگر ہماری حقیقت ناشناسی ہے کہ ہم اپنی

بے چارگی وعبدیت کی صفت بھول گئے، آقا نے کہا پانی پلاؤ، تو غلام نے یہ تو سمجھا کہ میں نے پانی پلایا۔ تو بڑا احسان کیا اور یہ نہ سمجھا کہ میں تو غلام ہی ہوں۔ اس صفت کے بھول جانے سے ہمیں ہر چیز پر فخر ہے۔ نماز پر فخر، روزہ پر فخر، ذکر وشغل پر فخر، وعظ پر فخر، اگر یہ سمجھتا کہ میں تو غلام ہوں۔ انہی کے حکم سے اور انہی کی توفیق سے کررہا ہوں اور اگر وہ ہمیں یہ کام نہ بتلاتے یا توفیق نہ دیتے۔ تو کہاں سے کچھ کرتے۔ پس اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ کے معنی یہ ہیں کہ میں تو فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

اور حقیقت میں ہم کرتے ہی کیا ہیں؟ یہ تو ان کی عنایت ہے کہ انہوں نے سارا کام خود کرا کر ہماری طرف منسوب کردیا۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے برآہوئے چیں بستہ اند

''مشق افسانی تیری ہی زلفوں کا کام ہے۔ (لیکن) مصلحتاً عشاق نے چین کے ہرنوں پر اکثر الزام لگادیا ہے''۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

عشق من پیدا و معشوقم نہاں یار بیروں فتنۂ او در جہاں

(یار تو جہاں سے باہر مگر اس کا تصرف جہان کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا)

اسی باب میں مولانا فرماتے ہیں:

ما ہمہ شیراں و لے شیر علم حملہ شاں از باد باشد دمبدم

''ہم ہیں تو سب شیر ہی لیکن جھنڈے کے اوپر بنے ہوئے شیر ہیں۔ جو ہوا کی وجہ سے ہر وقت حملہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایسے ہی ہم میں جو تصرف ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔''

خوب مثال دی ہے۔ پہلے یہ دستور تھا کہ علم پر تصویریں بنادیا کرتے تھے اور اس میں بھی شیر کی تصویر اکثر بناتے تھے۔ تو جب ہوا سے علم لہراتا تھا۔ تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیر حملہ کررہا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ تصویر بنانے کی اجازت ہے۔ یہ تو ایک مثال کے طور بیان کردیا ہے:۔

ما ہمہ شیراں و لے شیر علم حملہ شاں از باد باشد دمبدم

''ہم سب ہیں۔مگر شیر علم ہیں۔ کہ اس کا حملہ ہوا کی بدولت ہے۔ کہ اگر ہوا نہ ہوتو پڑے رہیں۔وہ تو ہوا ہے جو حرکت دیتی ہے۔لیکن: ۔

حملہ شان پیدا و ناپید است باد آنکہ نا پیدا است ہرگز کم مباد

''یعنی حملہ تو نظر آتا ہے۔مگر ہوا نظر نہیں آتی اور ایک فرماتے ہیں: ۔

انت کالریح و نحن کالغبار یختفی الریح و غبراہ جھان

آپ مثل ہوا کے ہیں اور ہم مثل غبار کے۔ یہ سب تشبیہیں اور مثالیں ہیں۔مگر وہ من کل الوجوہ ایسے نہیں ہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ اتصال وحرکت سے پاک ہیں۔گو محرم میں نفس تحریک یہاں اور وہاں یکساں ہے اور دونوں متحرک ہیں، نحو حرکت بھی متحد ہے۔

اور چونکہ بعض کو شبہ پیدا ہو کر الحاد کا اندیشہ تھا۔اس لئے مولانا نے اس کو خود ہی صاف کر دیا۔

اے بروں از وہم وقال وقیل من خاک بر فرق من و تمثیل من

''اے وہ ذات جو میری عقل اور سمجھ سے باہر ہے مجھ پر اور میری تمثیل پر خاک''

یعنی آپ ان سب سے منزہ اور سب سے پاک ہیں۔جیسا کہ دوسرے عارف نے کہا ہے: ۔

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم واز ہر چہ گفتہ اند وشنیدیم وخواندہ ایم

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

اور واقعی حق تعالیٰ کی شان کا کیا احاطہ ہو سکتا ہے: ۔

اے بروں از وہم وقال وقیل من خاک برفرق من و تمثیل من

''اے وہ ذات جو میری عقل اور سمجھ سے باہر ہے مجھ پر اور میری تمثیل پر خاک''

رہا یہ کہ جب وہ ہماری تمثیلات سے پاک ومنزہ ہیں۔تو مثال کی ضرورت ہی کیا تھی۔اس کی وجہ فرماتے ہیں: ۔

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت ہردمت گوید کہ جانم مفرشت

''تیری عمدہ تصویر سے بھی بندہ کو صبر نہیں آیا۔وہ ہر وقت آپ سے یہی کہتا ہے کہ آپ تشریف لائیں۔میری جان ہر وقت آپ کے لئے حاضر ہے۔''

وہ ذہن میں آسکتے ہیں اور نہ ذہن میں یعنی تشبیہ میں بھی ان کی شان بیان نہیں ہو سکتی۔اس لئے صوفیہ کا قول ہے:

كل من خطر ببالك فهو هالكٌ واللّٰه اجل من ذالک

جو کچھ تمہارے تصور میں آتا ہے وہ فنا ہو جانے والا ہے اور خدا اس سے بہت برتر ہے تو وہ ان سب مثالوں سے پاک ہیں۔ مگر بندہ کو بدوں کسی خاص تصور کے صبر نہیں آتا۔ تو یہ مثالیں مولانا نے بطور تشبیہ یعنی مشارکت فی بعض الاوصاف کے دی ہیں۔

نعمت توفیق

بہرحال یہ معلوم ہو گیا کہ ہم کیا چیز ہیں؟ اصل تو وہی ہیں۔ جو سب کچھ کرا دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود ہی فرماتے ہیں:

فسنیسرہ للیسریٰ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہی اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ پھر یہ آیت تائید میں پڑھی فسنیسرہ للیسریٰ۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں ارادہ سے۔ مگر ارادہ کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہوتی ہے۔ وہ کیا تقاضا۔ داعیہ اس کی بدولت ارادہ میں کامیابی ہوتی ہے اور وہ نہ ہو تو پھر دیکھ لیجئے عمل کرنے میں کتنی مشکل ہوتی ہے۔ نماز کی فرضیت سن کر ارادہ تو کر لیا کہ نماز پڑھیں گے لیکن اگر تقاضا نہیں پیدا ہوا تو کبھی نہیں پابندی ہوگی اور یہ تقاضا محض حق تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت اور توفیق ہے جب کامیابی بلا داعیہ کے کم ہوتی ہے اور داعیہ وہ پیدا کرتے ہیں۔ تو بس وہی کام لیتے ہیں۔ جب وہ کام لیتے ہیں تو پھر کام پر کبر و عجب کیسا وانني من المسلمين کا عربی الفاظ سے ترجمہ نہ کیجئے۔ کہ میں مسلمین میں سے ہوں اردو میں ترجمہ کیجئے کہ میں تو فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

اصلاح داعی

پھر انني مسلم نہیں۔ فرمایا کہ اس میں تفرد کا شبہ ہوتا۔ کیوں کہ بڑے کا تو غلام بننا بھی فخر ہے۔ تو اس صورت میں پھر شائبہ عجب کا رہ جاتا۔ کہ یہ شخص یہ سمجھتا کہ تنہا میں ہی فرمانبردار ہوں۔ سبحان اللہ قرآن مجید میں بھی علوم کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں تو انني من المسلمين میں ایک وجہ دلالت علی التواضع کی تو مادہ کے اعتبار سے تھی اور ایک وجہ صیغہ کے اعتبار سے ہے کہ اس

سے اشارہ اس امر کی طرف کر دیا کہ کام کرنے والے بہت ہیں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ایک ہی ہوں۔ کبھی نخرہ پیدا ہوتا کہ میں نہیں کروں گا۔ تو کام رک جائے گا۔ یہ لفظ بھی بتلا رہا ہے کہ وہاں بہت سے غلام ہیں۔ اگر ایک غلام نے فرمانبرداری نہ کی تو اس نے اپنا ہی کچھ کھویا پھر اس جگہ تو ہر واحد کے اعتبار سے بتایا کہ ایک شخص کے چھوڑ دینے سے ہمارا کام نہیں رک سکتا۔

اور ایک دوسرے مقام پر بھی بتا دیا کہ ساری جماعت کی جماعت بھی ہمارا کام چھوڑ دے۔ تب بھی ہمارا کام نہیں رک سکتا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

و ان تتولو ایستبدل قوما غیر کم ثم لایکونوا امثالکم.

اگر تم اعراض کرو تو وہ ایک اور جماعت پیدا کر دیں گے۔ جو تمہارے مثل نہ ہوں گے۔ بلکہ وہ تم سے بہتر خدمت کرنے والے ہوں گے۔ **من المسلمین** میں واحد واحد کی اصلاح تھی اور یہاں جماعت کی اصلاح ہے۔

اب صرف ایک شبہ یہ رہا کہ ہر حال میں ضرورت تو پڑی۔ ملازموں اور خدمت گاروں کی۔ جیسا کہ استبدال بتلا رہا ہے تو حدیث شریف میں جو کہ مثل کلام الٰہی کے ہے۔ خاص کر حدیث قدسی اس شبہ کا بھی جواب ہے۔

لو ان جنکم وانسکم واولکم واخرکم و رطبکم ویابسکم اجتمعوا علیٰ قلب اشقیٰ رجل منکم ما نقصو امن ملکی شیئا او کما قال

"یعنی اگر تمہارے جن وانس اگلے پچھلے خشک وتر سب سے زیادہ شقی جیسے بن جاویں تو بھی ہماری سلطنت میں کچھ نقصان نہیں آ سکتا۔ بلکہ قرآن مجید میں بھی ہے:

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ

"یعنی اگر تم نمک حرامی کرو۔ تو خدا کو کچھ پرواہ نہیں۔ پس وہ تو ایسے غنی ہیں کہ نہ انہیں فرد کی پرواہ، نہ افراد کی، نہ کل کی نہ آحاد کی۔"

اب اگر کوئی خدمت دین کی کرے تو ناز کیسا؟ مگر باوجود اس کے کہ اکثر کی یہ حالت ہے کہ ذرا سا کام کیا اور اشتہاروں اور اخباروں میں اپنی مدح کے مضمون دوسروں کے نام سے چھپوا رہے ہیں۔ بہر حال ہم کیا اور ہماری خدمت ہی کیا۔ اول تو جو خدمت ہے وہ بھی واقع میں انہی کی توفیق سے ہے۔

ہماری خدمت دین کی حقیقت

اور پھر وہ اپنی ذات میں بھی کسی قابل نہیں بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک حکایت مولانا نے تحریر فرمائی ہے کہ ایک مرتبہ عرب میں قحط پڑا اور پانی تک بالکل خشک ہوگیا۔ ایک بدوی تھا۔ اول تو وہ یوں بھی معاش نہ رکھتا تھا پھر اس پر قحط کی وجہ سے اور بھی تنگی میں مبتلا ہوگیا۔ اس کی بیوی نے کہا۔ آخر گھر میں کب تک بیٹھو گے۔ کہیں نکلو اور کچھ کماؤ۔ اس نے کہا جب مجھ کو کوئی ہنر نہیں آتا تو کہاں جاؤں اور جا کر کیا کروں گا۔ بیوی نے کہا، خلیفہ بغداد کے پاس جاؤ اور حاجت پیش کرو۔ عرض حاجت کیلئے کسی ہنر کی ضرورت نہیں۔ اس نے کہا یہ ٹھیک ہے مگر خود خلیفہ کے پاس جانے کے لئے کچھ تحفہ چاہیے سو تحفہ کیا لے جاؤں۔ کہنے لگی یہ گاؤں میں جو تالاب خشک ہوگیا ہے اور ایک گڑھے میں کچھ پانی رہ گیا ہے بس اسی کا پانی لے جاؤ بھلا ایسا پانی خلیفہ کو کہاں نصیب، وہ یہ سمجھتی تھی کہ بغداد میں بھی ہمارے گاؤں کی طرح پانی نہ رہا ہوگا، سچ کہا، واقعی خلیفہ کو ایسا سڑا ہوا پانی کیوں ملنے لگا۔

غرض وہ پانی اس نے ایک گھڑے میں بھرا۔ یہ سر پر رکھ کر سیدھا بغداد خلیفہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہاں پہنچا تو خلیفہ تک پہنچایا گیا سر پر سڑے ہوئے پانی کا گھڑا جسے بیوی نے خوب اچھی طرح بند بھی کر دیا تھا رکھا ہوا خلیفہ کے سامنے پہنچا اور جاتے ہی گھڑا تخت پر خلیفہ کے سامنے رکھ دیا، خلیفہ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ کہنے لگا ھذا ماء الجنة یہ جنت کا پانی ہے۔ خلیفہ نے حکم دیا کھولو۔ کھولا گیا تو سارا دربار سڑ گیا۔ مگر خلیفہ ایسا کریم النفس تھا کہ ناک بھوں بھی نہیں چڑھائی۔ خلیفہ کی تہذیب کے اثر سے سارا دربار خاموش رہا۔ خلیفہ نے خدمت گار کو حکم دیا کہ لے جاؤ، اسے ہمارے خاص خزانہ میں رکھو اور ان کا گھڑا خالی کر کے اشرفیوں سے بھر دو اور ان کی خوب خاطر مدارت کرو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

جب رخصت کا وقت قریب آیا۔ حکم ہوا کہ واپسی میں انہیں دجلہ کے راستہ سے ان کے گھر روانہ کرو۔ اشرفیوں سے گھڑا بھرا جانا۔ اُولٰٓئِکَ یُبَدِّ لُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنَاتٍ۔ کا مصداق تو تھا ہی۔ مگر اس نے جو دجلہ دیکھا اور اس کے پانی کی لہریں اور ٹھنڈی ہوا کا لطف

نظر آیا۔ پھر تو اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا کہ جس کے قبضہ میں اتنا بڑا دریا ہے اس کے دربار میں میں نے یہ ہدیہ پیش کیا۔ پس اسی طرح ہماری آپ کی عبادت ہے۔

عنایت باری تعالیٰ

آپ جس وقت آخرت میں خزائن اعمال انبیاء کے دیکھیں گے تو آپ کو اپنے اعمال پر نظر کر کے شرم آوے گی تو ان اعمال پر ناز کا ہے کا؟ بلکہ وہاں تو اعمال کاملہ فاضلہ کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ ان الله لغني عنكم خدا کو تمہاری کچھ حاجت نہیں۔ یہ تو ان کی عنایت ہے۔ کہ ان اعمال کی توفیق دیدی۔ تو ہمیں چاہیے کہ ان کی نعمت توفیق نظر کریں۔ نہ کہ اپنے عمل اور خدمت پر۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی　　　منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

''احسان مت بتاؤ کہ ہم بادشاہوں کی خدمت کرتے ہیں۔ بلکہ احسان مانو کہ تم جیسے نااہلوں کو اس نے اپنی خدمت میں رکھ چھوڑا ہے۔''

ایک اور واقعہ سے اس کی تفسیر اور بھی اچھی طرح سمجھ میں آسکے گی وہ یہ کہ ایک شخص مجھ کو پنکھا جھلتے تھے مگر جھلنا جانتے نہ تھے کبھی سر میں مار دیا۔ کبھی کان میں لگ گیا۔ کبھی ٹوپی اڑا دی۔ مگر چونکہ ان سے بے تکلفی نہ تھی۔ لحاظ کے مارے میں نے کچھ نہ کہا اور اتنی دیر تک صبر کیا۔ وہ اپنے دل میں یہ سمجھتے ہوں گے کہ میں نے بڑا احسان کیا۔ جو اتنی دیر تک پنکھا جھلا اور میں یہ سمجھ رہا تھا۔ کہ میں نے بڑا احسان کیا، جو ان سے پنکھا جھلوایا۔ اب دیکھ لیجئے کہ واقعہ میں احسان کس کا زیادہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ احسان میرا ہی ہے کہ ان کی خاطر سے میں نے تکلیف برداشت کر لی اور ناراضی ظاہر نہیں کی۔

اسی طرح حق تعالیٰ کی عبات کو آپ بڑی خدمت سمجھتے ہیں اگر غور کیا جاوے تو خود ہماری وہ خدمت ہی پسند کے قابل نہیں۔ دیکھ لیجئے ہمارا کوئی روزہ اور کوئی نماز بھی مکروہات سے خالی ہے پھر جو آپ کا یہ نماز روزہ انہوں نے لے لیا تو ان کا احسان ہوا کہ اس پر سزا نہیں دی۔ تو ان کی عنایت تو بھول گئے۔ اپنا احسان جتلانے لگے۔ تو انني من المسلمين (بے شک میں فرمانبرداروں میں سے ہوں) میں متنبہ کر دیا کہ خدمت پر ناز مت کرنا۔ ہمارے یہاں تم جیسے بہتیرے غلام پڑے ہیں۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ۔

یکے روز بر بندۂ دل بسوخت　　　　　که میگفت و فرمانده‌ش می فروخت

''ایک دن ایک غلام کی بات سے میرا دل پھک گیا۔ جو اپنی فروخت کے وقت یہ کہہ رہا تھا۔''

ترا بندہ چوں من بیفتد بسے　　　　　مرا چوں تو خواجہ نباشد کسے

''تجھے تو مجھ جیسے بہت سے غلام مل جائیں گے۔ میرے لئے تجھ جیسا مالک کوئی نہیں ہوگا۔''

یعنی ایک شخص اپنا غلام بیچ رہا تھا اور غلام یہ کہہ رہا تھا کہ تجھ کو مجھ جیسے تو بہت مل جائیں گے۔ مگر مجھ کو تجھ جیسا آقا نہیں ملے گا۔ تو واقعی ہماری نسبت خدا کے سامنے یہی ہے۔ نعوذ باللہ اگر یہ خدا کو چھوڑ دے۔ تو خدا کہاں ملے گا۔ مگر خدا کو اس کی کیا پرواہ۔ ایسے کھٹل۔ مچھر۔ بھنگے رہے تو کیا نہ رہے تو کیا۔ جیسے کسی مکان کے متعلق کوئی بھنگایوں کہنے لگے کہ ہم ہی نے تو اس گھر کو آباد کر رکھا ہے۔

جیسے ایک قصہ ہے کہ کسی عطر فروش کی لڑکی چمڑے والوں میں بیاہی گئی۔ ایک دن اتفاق سے ساس بہو میں لڑائی ہوئی۔ ساس نے کہا۔ کہ ایسی سست اور کاہل بہو سے پالا پڑا ہے کہ تنکے پر سے بھی نہیں ہلتی۔ بہو نے کہا واہ! مجھے کاہل نہ کہنا۔ میں نے تو اتنا بڑا کام کیا ہے کہ آج تک تم میں سے کسی سے بھی نہ ہوسکا۔ ہاں صاحب وہ کیا صاحب وہ یہ کہ میرے آنے سے تمہارے گھر کی ساری بدبو جاتی رہی۔ ورنہ پہلے گھر کیسا سڑا ہوا تھا۔ یعنی اب ان کا دماغ بھی اس بدبو کا عادی ہو گیا۔ تو یہ یہ سمجھیں کہ بدبو جاتی رہی۔ تو ایسے ہی ہم ہیں کہ غیر خدمت کو خدمت سمجھ رہے ہیں۔ ورنہ کیا ہماری خدمت تو اننی من المسلمین (بے شک میں فرمانبرداروں میں سے ہوں) کے دو معنی ہو سکتے تھے۔ ایک دعویٰ و فخر اور ایک تواضع مراد ہے۔

اور اس کی تائید کہ ایک ہی لفظ دونوں معنی میں مستعمل ہوسکتا ہے۔ خود قرآن مجید کے دوسرے موقع سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ مقبولین کی مدح میں ان کا مقولہ ارشاد ہے:

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا

یعنی اے اللہ ہم نے ایک منادی کو سنا کہ وہ ایمان کے لئے ندا دیتا ہے۔ کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ۔ فامنا پس ہم ایمان لائے، اے ہمارے پروردگار! پس بخش دیجئے

ہمارے گناہ اور دور کردیجئے ہماری برائیاں۔ دیکھئے یہاں توآمنا تواضع اور انکسار اور افتقار کے لئے ہے جس کو ذوق سلیم اور سیاق وسباق صاف بتلا رہا ہے۔ اب دوسری آیت لیجئے جو اسی لفظ کو کبر وعجب کے طور پر استعمال کرنے پر دال ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا الاٰیۃ.

یہاں بھی وہی آمنا ہے مگر یہاں اس کو رد کیا گیا جس کا سبب وہی ہے کہ دعویٰ اور فخر سے کہتے تھے۔ چنانچہ بعد والی آیت اس پر صریح دال ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ.

یعنی وہ لوگ آپ پر احسان رکھتے ہیں اپنے اسلام لانے کا۔ فرمادیجئے کہ احسان نہ رکھو مجھ پر اپنے اسلام کا۔ بلکہ خدا کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت کردی۔ بشرطیکہ تم اس قول میں سچے ہو۔

اجزائے دعوت

غرض تو دیکھئے یہاں ان کا آمنا کہنا دعویٰ اور فخر کے طور پر تھا، اس کے جواب سے صاف طور پر معلوم ہوگیا کہ واقعی خدا کا احسان ہے جو اس نے ہمیں نیک کام کی ہدایت کردی۔ اسی طرح یہاں بھی فرمادیا وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ تو ایک تکمیل دعوت الی اللہ کی یہ ہوئی۔ تو اب کل تین چیزیں ہوئیں۔ ایک مقصود یعنی دعوت الی اللہ اور دو اس کے مکمل یعنی عمل صالح اور تواضع وافتقار واعتراف فرمانبرداری۔ یہ تین اجزاء ہیں اور کیسے مرتبط ہیں۔

اب اپنی حالت دیکھئے کہ اوّلاً تو دعوت الی اللہ کا باب ہی گم ہوگیا ہے حتیٰ کہ جہاں قدرت ہے وہاں بھی نہیں اور جہاں قدرت نہیں ہے وہاں کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے۔ ہمارے بزرگ تو وہ تھے کہ جہاں قدرت نہ تھی وہاں بھی دعوت الی الحق سے باز نہیں رہتے تھے۔

محکوم کو دعوت

اور ہم ہیں۔ کہ قدرت کی جگہ بھی نہیں کرتے۔ بیوی بچوں، نوکروں کو باوجود قدرت

کے ہم کبھی امر بالمعروف نہیں کرتے۔ مگر یہ برتاؤ صرف خدا کے معاملات میں ہے۔ اپنے معاملات میں ہرگز نہیں۔ گھر میں آئیں گے تو پوچھیں گے کہ کھانا تیار ہوا، نہیں ہوا۔ مگر یہ کبھی نہیں پوچھیں گے کہ بیوی نے نماز بھی پڑھی کہ نہیں۔ بہتیرے کہیں گے کہ بیوی سے کہا تو تھا مگر وہ نہ پڑھے تو کیا کریں، بھائی کہنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک مشورہ اور ایک حکم۔ ایک تو یہ کہنا کہ نماز پڑھا کرو۔ ہمیں نماز نہ پڑھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو مشورہ کی صورت ہے کہ اس کی مخالفت سے بیوی کو ناراضی کا ڈر نہیں اور ایک یہ کہنا ہے کہ جیسے بیوی کھانے میں نمک تیز کردے تو ایک دن تو نرمی سے کہیں گے اور دوسرے دن سختی سے کہیں گے اور تیسرے دن جو ذرا اکھڑ ہیں وہ ڈنڈوں سے کہیں گے تو یہ حکم کی صورت ہے جس کی مخالفت سے بیوی کو ڈر ہو جاوے کہ میاں سخت ناراض ہوں گے۔ ذرا انصاف سے کہو کہ کیا نماز کو اسی طرح کہا تھا جس طرح نمک کو کہتے ہو۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ اگر نماز نہ پڑھو گی تو پھر ہم تمہارے ہاتھ کی روٹی نہیں کھائیں گے اور ایسا ہی کر و بھی اور ڈر و مت کہ روٹی نہ ملے گی۔ بہت سے بہت ایک ہی آدھ روز ایسا کرنا پڑے گا۔ پھر تو وہ پابندی ہو جائے گی۔

اور شہروں میں تو یہ سزا کچھ بھی مشکل نہیں۔ پوری کچوری۔ روٹی سالن سب بازار میں موجود ہے۔ البتہ قصبات میں ذرا دشواری ہے۔ مگر وہاں بھی کچھ دشواری نہیں۔ آخر جب بیوی مر جاتی ہے۔ تو نکاح ثانی تک برادری میں گھر گھر پکانے کے لئے آٹا گھومتا پھرتا ہے یا نہیں۔ اگر کہو کہ اگر ساری ہی عورتیں بے نمازی ہوں تو کیا کریں پھر کس سے پکوائیں۔ اس کا جواب یہ ہے:۔

دنیا بھر تو تمہاری محکوم نہیں ہے تمہیں تو اپنے گھر کیلئے کہا جا رہا ہے

اور اگر ہمت ہو تو سب کے ہی ساتھ یہ معاملہ کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ تمہاری ہمت کی برکت سے ساری کی ساری ہی نمازی بن جاویں گی۔

اخلاص کی برکت

اس ہمت کی برکت پر ایک حکایت یاد آئی۔ کہ ایک بزرگ تھے کہ لمبے سفر میں تو نماز و جماعت کے خیال سے ایک دو آدمی کو ہمراہ رکھتے تھے اور چھوٹے سفر میں ایسے انداز سے سفر

کرتے تھے کہ نماز کے وقت منزل پر پہنچ جاویں۔ اتفاق سے ایک چھوٹے سفر میں راستہ میں کچھ حرج ہوگیا اور ظہر کا وقت آ گیا۔ گاڑی بان ہندو تھا۔ انہوں نے وضو کیا۔ سنتیں پڑھیں، کوئی اور نمازی نہ دکھائی دیا۔ انہوں نے دعا مانگی کہ اے اللہ! ہمیشہ میں جماعت سے نماز پڑھتا ہوں اور اس وقت میں مجبور ہوں۔

اگر آپ چاہیں تو اس وقت بھی جماعت سے مشرف کر سکتے ہیں۔ مصلیٰ بچھا کے یہ دعا ہی کر رہے تھے کہ گاڑی بان سامنے آیا۔ کہ میاں مجھے تم مسلمان کرلو۔ بڑی مسرت ہوئی۔ سمجھ گئے کہ دعا قبول ہوگئی۔ کیا پوچھنا ہے اس مسرت کا۔ وجد ہو رہا ہوگا۔ اسی وقت مسلمان کیا اور وضو کرا کر کہا کہ جس طرح میں کروں اسی طرح تو بھی کر اور سب ارکان میں سبحان اللہ سبحان اللہ کہتا رہ۔ دیکھئے یہ برکت تھی ہمت کی۔

اور اس طرح محض سبحان اللہ، سبحان اللہ سے ہماری نماز تو نہیں ہوگی مگر نومسلم کی ہو جاوے گی۔ جب تک اسے سورتیں اور دعائیں یاد نہ ہوں۔ جتنی جتنی یاد ہوتی جائیں۔ اتنی اتنی اسے بھی پڑھنا واجب ہوگا اور بقیہ مواقع میں سے جس موقع کی دعا یا ذکر یاد نہ ہوئی ہو، وہاں سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ لینا کافی ہوگا۔

دیکھئے شریعت نہایت آسان ہے مجبوری میں زبردستی نہیں ہے۔ آسان پر یاد آیا کہ بعض دیہات میں اس قدر دین کی کمی ہے کہ کوئی جنازہ کی نماز تک نہیں جانتا۔ ایک جگہ کے متعلق مجھے یہ معلوم ہوا کہ جنازہ کو بے نماز پڑھے دفن کر دیا۔ یہ سن کر میرا بہت دل دکھا۔ میں نے ان کی آسانی کیلئے شریعت کا مسئلہ عام مجمع میں ظاہر کیا کہ جب تک جنازہ کی نماز کی دعا یاد نہ ہو اس ترکیب سے جنازہ کی نماز پڑھ لیا کرو۔ کہ وضو استقبال قبلہ اور حضور میت تو شرط ہے اور سب سہل ہیں۔ مگر ارکان صرف تکبیرات اربعہ ہیں اور شرط کے بعد رُکن کے ادا ہو جانے سے عبادت ادا ہو جاتی ہے۔ تو میت کو روبرو رکھ کر چار مرتبہ اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ کے سلام پھیر لیا کرو۔ بس نماز ہوگئی۔

ان ظالموں نے بجائے قدر کرنے کے اعتراض شروع کر دیا کہ خوب نماز بتلائی یہ تو ہم نے کبھی سنا ہی نہ تھا۔ یہ خوب جاہلوں نے سیکھ لیا ہے کہ ہم نے کبھی نہیں سنا۔ ارے کیا سب مسئلے تمہارے سننے ہی میں آنا ضروری ہیں؟ اگر سب مسئلے سن لیتے تو تم بھی عالم ہی نہ ہو جاتے۔ جیسے کوئی مکھی کہے کہ حلوائی بڑا! بے وقوف ہے۔ اس نے فضول اس قدر لڈو بنا

ڈالے۔ ارے میرے پیٹ بھرنے کو تو جلیبی کا شیرہ ہی کافی تھا۔ اسی طرح جو چیز ان کی سنی ہوئی نہ ہو۔ بس وہ فضول ہے اور جو چیز ان کے علم سے خارج ہو بس وہ مسئلہ ہی نہیں ہے۔

خیر یہ کلام تو استطرادی تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان بزرگ کے خلوص کی برکت سے خدا نے ہندو کو کیسا مسلمان کر دیا۔ اسی طرح آپ کو بھی خلوص کی ضرورت ہے۔ ان شاء اللہ پھر سب کی سب نمازی ہو کر روٹیاں پکا پکا کر کھلائیں گی۔

قربانی پر ثمرہ

پہلے امتحان تو دو، پھر نتیجہ نکلے گا۔ گو قدرے مشقت برداشت کرنی پڑے گی۔ اس پر بطور لطیفہ کے ایک شخص کا قصہ یاد آیا کہ اس نے کسی وعظ سے سن لیا کہ سب کو خدا دیتا ہے۔ خدا ہی پر توکل اور بھروسہ رکھنا چاہیے بس یہ سن کر جنگل میں جا بیٹھے، کہ اب ہم بھی توکل کریں گے۔ کیا خوب سمجھے۔ توکل کو اب ایک وقت گزارا، دوسرا وقت گزرا، کہیں کھانے کا پتہ نہیں۔ وہاں ایک کنواں بھی تھا۔ اتفاقاً ایک مسافر آیا۔ کنویں پر بیٹھا اور سڑک کی طرف منہ کر کے بیٹھا۔ ان کی طرف منہ بھی نہیں کیا اور کھایا پیا چلتا ہوا۔ دوسرا آیا وہ بھی کھا پی، یہ جا وہ جا۔ اب جب کئی وقت گزر گئے اور انہیں بھوک کی تاب نہ رہی تو سوچا کیا کروں۔ آخر ایک اور مسافر آ کے بیٹھا اور وہ بھی جب کھا پی چلنے کو ہوا۔ تو ان متوکل نے کھنکھارا۔ اس نے منہ پھیر کر دیکھا۔ تو بے حد پریشان صورت، اس کو ترس آیا اور روٹیاں حوالہ کیں۔

اب یہ کھا کے مولوی صاحب کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ آپ نے وعظ میں توکل کے متعلق جو کچھ بیان کیا وہ بہت ٹھیک ہے مگر اس میں ایک بات چھوڑ دی وہ یہ کہ کھنکھارنا بھی پڑتا ہے۔ تو یہ کیسا وعظ ہے کہ ایک بات کہی اور ایک بات چھوڑ دی۔ جس سے عمل کرنے والے کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تو حضرت پہلے امتحان تو دیجئے۔ پھر ثمرہ دیکھئے۔ یہ دشواریاں تو امتحان کی ہیں جب امتحان میں کامیاب ہو گئے تو پھر انعام لو۔ غرض امر بالمعروف میں کچھ مشقتیں بھی پیش آتی ہیں۔ ان کو سہو ان شاء اللہ تعالیٰ برکت ہوگی۔ مگر ہم نے تو اسکو متروک ہی کر دیا۔ یہ تو بی بی کو نماز کا حکم کرنیکا ذکر تھا۔

اسی طرح اولاد کو نہ نماز پر کچھ کہتے ہیں نہ اور احکام پر۔ ہاں اگر بچہ اسکول میں فیل ہو جائے تو آپ اس کو بے حد ملامت کرتے ہیں اور اسی ملامت کے خیال سے بچے بھی خوب محنت کرتے ہیں اور ملامت بھی اس درجہ کی کرتے ہیں کہ اس کا تحمل کر کے بعضے اسی ندامت میں جان تک دے دیتے ہیں چنانچہ یہاں کانپور ہی کا واقعہ ہے کہ ایک لڑکا فیل ہو گیا تھا جا کے ریل کی پٹڑی پر لیٹ گیا۔ ریل آئی کٹ گیا۔ اسی طرح ایک لڑکے نے اناوہ میں افیون کھا کے جان دے دی تھی۔ تو اسکول کی امتحان کی مقصودیت کی کیفیت ہے لیکن اگر صاحب زادہ نماز پر نماز قضا کرتے چلے جائیں۔ تو ابا جان مارے محبت کے کچھ نہ کہیں گے۔ الغرض دعوت الی اللہ کا اہتمام ہی دل سے نکل گیا۔

درجاتِ دعوت

اب سمجھئے اس دعوت کے بھی درجے مختلف ہیں۔ جو جس درجہ کا اہل ہو۔ ویسا ہی اہتمام کرے۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ ہر شخص سب درجوں کا اہتمام کرے۔ اس کا پتہ اس آیت سے چلتا ہے:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.

فرماتے ہیں تمہارے اندر ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو دعوۃ الی الخیر کرے اور امر بالمعروف کرے اور نہی عن المنکر کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک خاص جماعت کا کام ہے۔ ساری امت کا کام نہیں ہے اور دعوت الی الخیر اور دعوت الی اللہ کے ایک ہی معنی ہیں سو اس میں تو اس کو صرف ایک خاص جماعت کا کام فرمایا گیا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ.

کہ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے بلاتا ہوں میں اللہ کی طرف بصیرت پر ہو کر میں اور جتنے میرے متبع ہیں اور حق تعالیٰ تمام برائیوں سے پاک ہیں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ دیکھئے یہاں پر مطلقاً و من اتبعنی ہے۔ یعنی جتنے میرے متبع ہیں۔ سب حق کی

طرف بلاتے ہیں۔اس میں عموم ہے۔

اس خصوص اور اس عموم سے معلوم ہوا کہ اس کے درجات و مراتب ہیں۔ایک درجہ کا پہلی آیت میں ذکر ہے اور ایک درجہ کا دوسری آیت میں اور وہ درجات دو ہیں۔ایک دعوت عامہ۔ایک دعوت خاصہ۔ پھر دعوت عامہ کی دو قسمیں ہیں۔ایک دعوت حقیقیہ اور ایک دعوت حکمیہ۔دعوت حکمیہ وہ جو کہ معین ہو دعوت حقیقیہ میں۔میں نے آسانی کے لئے یہ لقب تجویز کئے ہیں۔ان میں اصل دو ہی قسمیں ہیں۔دعوت الی اللہ کی۔دعوت عامہ، دعوت خاصہ اور ایک قسم معین ہے دعوت عامہ کی۔تو اسی طرح یہ کل تین قسمیں ہوگئیں۔تو ہر شخص کے متعلق جدا جدا مرتبہ کے لحاظ سے ایک ایک دعوت ہوگی۔

چنانچہ دعوت خاصہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور وہ وہ ہے جس میں خطاب خاص ہو۔ اپنے اہل وعیال کو، دوست احباب کو اور جہاں جہاں قدرت ہو اور خود اپنے نفس کو بھی۔ چنانچہ حدیث میں ہے کلکم راع و کلکم مسئول۔کہ تم میں کا ہر ایک داعی (نگران) ہے اور تم میں کا ہر ایک (قیامت میں) پوچھا جائے گا۔کہ رعیت کے ساتھ کیا کیا۔یہ دعوت خاصہ ہے اور قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا.

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو عذاب دوزخ سے بچاؤ، یہ بھی دعوت خاصہ ہے کہ اپنے اہل وعیال کو عذاب دوزخ سے بچانے کا حکم ہے۔سو اس کا تو ہر شخص کو اپنے گھر میں اور تعلقات کے محل میں اہتمام کرنا چاہیے۔

عمومی دعوت میں تخصیص کا راز

اور ایک دعوت عامہ ہے۔جس میں خطاب عام ہو۔یہ کام ہے صرف مقتداؤں کا۔ جیسا کہ ولتکن منکم امة الایة سے معلوم ہو رہا ہے اور اس تخصیص میں ایک راز ہے وہ یہ کہ دعوت عامہ (یعنی وعظ) اسی وقت موثر ہوتی ہے کہ جب مخاطب کے قلب میں داعی کی رقعت ہو بلکہ مطلق دعوت میں بھی اگر داعی کی وقعت نہ ہو تو وہ موثر نہیں ہوتی۔تو عام دعوت

میں عام مخاطبین کے قلب میں داعی کی وقعت ہونی چاہیے اور ظاہر ہے کہ بجز مقتداء کے کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو عام لوگوں کے دل پر اثر ڈال سکے اور ایسے لوگ کتنے ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہوں کہ انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال اور یہ سمجھتے ہوں۔ کہ:

مرد باید کہ گیرد اندر گوش　　　ور نبشت است پند بر دیوار

"انسان کو چاہیے کہ نصیحت پر عمل کرے۔ وہ نصیحت کی بات خواہ دیوار پر لکھی ہوئی کیوں نہ ہو۔"

تو ایسے لوگ تو بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ ورنہ عموماً یہ دیکھتے ہیں۔ کہ واعظ یا داعی باوقعت ہے یا نہیں۔ اگر وقعت نہیں ہوتی تو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ جب ہمارے برابر کا ہو کے ہم کو نصیحت کرتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ترفع چاہتا ہے اور ہم سے بڑا بننا چاہتا ہے اور واقع میں اکثر ہوتا بھی یہی ہے۔

اس وجہ سے دعوت عامہ میں مقتداء ہونے کی ضرورت ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ امامت کبری میں حدیث الائمۃ من قریش میں قریش کی خصوصیت کی گئی ہے اس میں بھی یہی حکمت ہے کہ چونکہ قریشی خاندانی ہیں ان کی ماتحتی سے کسی کو عار نہیں ہوگی۔ اسی نص سے استثناء کر کے باجماع صحابہ امامت کبریٰ انہیں کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ اور یہی راز ہے کہ انبیاء علیہم السلام نہایت عالی خاندان ہوئے ہیں۔ وجہ یہ کہ نبی بھی امام عام ہوتا ہے۔ اگر چھوٹے خاندان کا کوئی نبی ہوتا۔ تو جو مدعی شرافت کے تھے وہ بوجہ کبر کے اسے خاطر میں نہ لاتے۔ اسی لئے تمام انبیاء علیہم السلام عالی خاندان ہوئے۔

عمومی دعوت کا اہل

اسی طرح دعوت عامہ میں داعی کو بھی مقتداء ہونا چاہیے جس کیلئے عالم ہونا بھی لازم ہے۔

دوسرے اس لئے بھی مقتداء کو عالم ہونے کی ضرورت ہے کہ خطاب عام کرتا ہوا یعنی وعظ کہتا ہوا دیکھ کر لوگ بھی یہی سمجھیں گے کہ یہ دین کے مقتداء اور عالم ہیں اور یہ سمجھ کے ان سے شرعی اور فقہی مسائل پوچھیں گے اور یہاں مسائل کے نام صفر ہوگا اور اتنی ہمت نہ ہوگی

کہ کہہ دیں کہ ہم کو معلوم نہیں اور ہر وقت ایسی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی۔ کہ ٹال دیا کریں۔ لامحالہ اس حدیث کا مضمون واقع ہوگا۔

فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا۔ یعنی بغیر علم کے جو جی میں آئے گا فتویٰ دے دیں گے۔ خود بھی گمراہ ہوں گے اوروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اور ٹالنے کی ترکیب پر ایک قصہ یاد آیا۔ ایک طالب علم تھا۔ کتابیں پڑھ کے اپنے گھر چلا تو استاد سے پوچھا کہ حضرت یہ تو آپ جانتے ہیں کہ مجھے آتا جاتا خاک بھی نہیں۔ مگر وہاں لوگ عالم سمجھ کے مسائل پوچھیں گے تو کیا کروں گا؟ استاد تھے بڑے ذہین۔ انہوں نے کہا کہ ہر سوال کے جواب میں یہ کہہ دیا کرنا۔ کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور واقع میں کوئی مسئلہ مشکل سے ایسا ہوگا جس میں اختلاف نہ ہو۔ سوائے عقائد توحید و رسالت وغیرہ تو ہر بات کا یہی جواب دے دینا کہ اس میں اختلاف ہے۔

جیسے تھیٹر میں ایک شخص نے اشتہار دیا تھا کہ آج ایک نیا تماشا ہوگا کہ حاضرین کسی علم اور کسی فن کا ہو۔ سوال کریں، ہم اس کا جواب دیں گے بس جناب لوگ بڑے بڑے مشکل سوال چھانٹ کے تھیٹر پہنچے۔ کوئی عربی میں، کوئی انگریزی میں، کوئی اردو میں، کوئی فارسی میں، غرض ہر زبان میں ہر فن کے سوالات ذہن میں لے کر پہنچے۔ وہ حضرت پلیٹ فارم تشریف لائے اور سب کے سوالات باری باری سننے شروع کیے۔ ساری رات ان سوالات میں ہی ختم ہوگئی۔

اور سوالات بھی ختم ہوئے۔ تو آپ نے کہا۔ سنیئے صاحب اب سوالات کا وقت ختم ہوگیا۔ اب میرا جواب سنیئے۔ لوگ نہایت اشتیاق سے متوجہ ہوئے، آپ فرماتے ہیں کہ وہ جواب یہ ہے کہ مجھے کسی کا بھی جواب معلوم نہیں۔ کیوں صاحب! کیسا ٹھیک جواب ہے۔ کہ نہ تو اس پر کوئی خدشہ وارد ہوتا ہے۔ نہ کسی اعتراض کی گنجائش ہے اور ہر سوال پر منطبق لوگ بے چارے جھنجھلا کے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ کہ مفت میں نیند بھی خراب ہوئی اور ٹکٹ کے دام بھی گئے۔

ایسے ہی انہوں نے ہر سوال کے جواب کے لئے یہ یاد کرلیا کہ اس میں اختلاف ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں لوگوں میں ان کی ہیبت بیٹھ گئی۔ کہ بڑا عالم متبحر ہے، بڑا وسیع النظر ہے مگر فوق کل ذی علم علیم (ہر علم والے سے بڑھ کر بڑا علم والا ہے) کوئی صاحب پرکھ گئے۔ کہ

اس نے سب کو بنا رکھا ہے آ کر کہا مولانا مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے انہوں نے کہا فرمائیے۔ کہا لا اله الا الله محمد رسول الله۔ اس میں آپ کی کیا تحقیق ہے۔ کہنے لگے کہ اس میں اختلاف ہے۔ بس آپ کی قلعی کھل گئی۔ تو غرض ایسی ترکیب ٹال دینے کی ہر وقت سمجھ میں نہیں آتی۔

ایسے ہی کسی نے ایک معقولی طالب علم سے مسئلہ پوچھا کہ گلہری کنویں میں گر پڑی ہے۔ پاک کرنے کیلئے کتنے ڈول نکالے جاویں۔ یہ بے چارے نری معقول جانتے تھے، فقہ کی خبر نہ تھی۔ اب آپ نے اپنا جہل چھپانے کے لئے اس سے پوچھا کہ گلہری جو گری ہے وہ حال سے خالی نہیں۔ یا خود گری یا کسی نے گرادی۔ پھر اگر خود گری ہے تو دو حال سے خالی نہیں۔ دوڑ کے گری یا آہستہ گری اور اگر کسی نے گرائی ہے تو دو حال سے خالی نہیں یا آدمی نے گرائی یا جانور نے۔ اور ہر ایک کا جدا حکم ہے تو اب بتلاؤ کیا صورت ہوئی۔ سائل نے پریشان ہو کر کہا کہ صاحب اس کی تو خبر نہیں۔ کہنے لگے پھر کیا جواب دیں اور یہ جھوٹ بولا کہ ہر شق کا جدا حکم ہے۔ جدا حکم کیا ہوتا۔ سب کا حکم ایک ہی ہے۔ وہ بے چارا گھبرا کے چل دیا۔ کہ ان کی منطق کا کیا جواب دے۔ تو یہ محض ترکیبیں ہیں اور یہ بھی بعضوں کو تو آتی ہیں اور بعضوں کو نہیں آتیں۔ جسے نہیں آتیں وہ کیا کرے گا کہ غلط سلط مسئلہ بتا دے گا۔ یہ خرابی ہوگی۔ جاہل کے داعی عامہ یعنی وعظ بننے میں۔ اس لئے فرمایا کہ **ولتكن منكم امة** الآیۃ۔ کہ تم سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے۔ یہ سب گفتگو خطاب عامہ میں ہے۔

بہر حال جن کو خطاب عام کی اہلیت حاصل ہے۔ وہ خطاب عام کریں۔ ورنہ خطاب خاص پھر خطاب عام کی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی، ایک حکمی، حقیقی یہ کہ وہ مخاطبین کو خواہ اہل اسلام ہوں یا غیر اہل اسلام ان کو وعظ سنا دے اور حکمی یہ کہ تبلیغ ونشر کرنے والوں کی اعانت کرے۔ تا کہ وہ حوائج سے مستغنی ہو کر تبلیغ کر سکیں۔ تو یہ اعانت بھی مقصود کے ساتھ ملحق ہوگی۔ اسی لئے اس کو دعوت حکمی کہا۔

انواع دعوت

یہ اقسام تو باعتبار دعوت کے عموم وخصوص یا مقصودیت والحاق تھے اب باعتبار نوع

دعوت کے داعی کی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ ہے جو جواب تحقیقی سے دعوت کرسکتا ہے اور ایک وہ ہے جو جواب الزامی سے دعوت کرسکتا ہے جواب تحقیقی کے یہ معنی ہیں کہ کسی نے جو کچھ پوچھا جواب میں اس کی حقیقت کو واضح کردیا اور جواب الزامی کے یہ معنی ہیں کہ جو اعتراض ہم پر کسی نے کیا ہم نے ویسا ہی اعتراض اس کے مذہب پر کردیا کہ جو جواب تم ہمیں دو گے۔بعینہ وہی جواب ہماری طرف سے تمہارے اعتراض کا ہوگا۔

اب ان دونوں میں سے ہر ایک کے لوازم وشرائط کو سمجھنا چاہیے، جواب تحقیقی کیلئے اپنے مذہب پر پورا عبور ہونے کی ضرورت ہے دوسرے کے مذہب پر پوری نظر ہونے کی ضرورت نہیں اور جواب الزامی کے لئے اپنے مذہب کے ساتھ ساتھ دوسرے کے مذہب پر بھی پوری نظر ضروری ہے اب اس اعتبار سے داعی دو قسم کے ہوئے۔ایک وہ جو اپنے مذہب پر پوری نظر رکھتے ہیں اور دوسرے وہ کہ دوسرے کے مذہب پر پوری نظر رکھتے ہیں چونکہ اس وقت مناظرہ میں مخالفین کے مقابلہ میں الزامی جواب زیادہ مؤثر ہوتا ہے اس لئے داعین میں جو جماعت دوسرے مذہب پر پوری نظر رکھتی ہو۔ وہ مخالفین سے مناظرہ کرے۔ان کی یہی دعوت ہے اور جو اپنے مذہب پر پوری نظر رکھتی ہو۔اسے چاہیے کہ وعظ وتلقین اپنے مذہب والوں کو کرے۔تو اس بناء پر داعین کی دو جماعتیں ہوئیں۔ایک واعظین کہ جو اپنے مذہب والوں کو تحقیق سے متنبہ کیا کریں اور ایک مناظرین کہ جو الزامی جواب سے مخالفین کو ساکت کیا کریں۔کیونکہ جواب تحقیقی مسلمانوں کو زیادہ نافع ہوں گے اور الزامی غیر مذہب والوں کو زیادہ مفید ہوں گے اور ان لوگوں کو بھی مفید ہوں گے جو مائل ہیں، غیر مذہب کی طرف،خلاصہ یہ کہ خطاب خاص تو سب کو یکساں اپنے اپنے گھروں میں کرنا چاہیے اور خطاب عام میں ایک تو ایسے لوگ ہوں کہ وعظ کہا کریں۔ جو اہل اسلام کے مناسب ہو،تا کہ مسلمانوں کی اصلاح ہو اور ایک وہ ہوں جو ایسے لوگوں کے مقابلہ میں تبلیغ کریں جن کو اسلام پر شبہ ہوگیا ہو یا اسلام سے تعلق کم ہوگیا ہو یا وہ غیر مسلم ہوں۔تا کہ اسلام کی طرف آجاویں۔

اب اس جماعت داعین عامہ کی کچھ ضروریات بشریہ بھی ہوں گے اس لئے ان کے علاوہ ایک اور جماعت مسلمانوں کی ایسی ہونی چاہیے جو اس جماعت کی ضروریات مہیا کریں

اور مبلغین کیلئے سامان جمع کریں تا کہ وہ اپنے فرض منصبی میں بے فکری سے مشغول ہوسکیں۔ اب چونکہ سرے سے دعوت الی اللہ ہی کا اہتمام نہیں ہے اس لئے کوئی جماعت بھی نہیں ہے نہ دعوت خاصہ والی کہ اپنے گھروں میں اصلاح کریں نہ دعوت عامہ کی۔ کہ اپنے بھائیوں کی فکر کریں یا جو تذبذب میں پڑ گئے ہیں ان کی خبر لیں۔ جو کہ ایک اعتبار سے اپنے بھائیوں سے بھی زیادہ قابل توجہ ہیں کیونکہ جو اپنے بھائی ہیں وہ تو آپ آ کر اپنی ضروریات پوچھ لیں گے مگر جو مذبذبین ہیں۔ ان کے گھر پر ہمیں جانا ہوگا اور خاص کر اس وقت جب کہ دوسرے لوگ انہیں اسلام سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ چنانچہ اس وقت بھی آپ نے سنا ہوگا کہ آگرہ وکانپور وغیرہ کے اطراف میں ایک جماعت نومسلموں کی ہے وہ مخالفین کے اغواء سے اسلام سے نکل رہے ہیں۔

افسوس! دوسروں کو تو ہم اپنے مذہب میں کیا لاتے۔ اپنے ہی بھائیوں کو اپنے مذہب میں نہیں رکھ سکتے۔ خدانخواستہ اگر یہی نوبت رہی تو آج تو نومسلموں پر مشق ہے اگر مخالفین کا حوصلہ بڑھ گیا تو کل وہ پرانے مسلمانوں کو بھی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کریں گے۔ (عیاذاً باللہ)۔ چنانچہ آپ نے قصے سنے ہوں گے کہ بعض پرانے مسلمان عیسائی ہو گئے۔ آریہ ہو گئے، اگر چہ وہ چند ہی سہی اور طمع زر یا طمع زن ہی سے سہی۔ مگر ہمارے رونے کے لئے تو ایک بھائی کا کم ہو جانا بھی کافی ہے تو اگر ان مغوین کو ان نومسلموں کے بارے میں خدانخواستہ کامیابی ہوگئی تو اندیشہ ہے۔ کہ وہ ہماری طرف بھی متوجہ ہوں گے۔

جوڑ کی ضرورت

مگر ان سب تدابیر میں سخت ضرورت باہمی اتفاق کی ہے مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں میں جہل کے ساتھ نااتفاقی بھی حد درجہ کی ہے اس حسد اور نااتفاقی کی بدولت اپنا آپ نقصان کئے لیتے ہیں۔ غضب تو یہ ہو رہا ہے کہ بعضے مبلغین دوسری جماعت مبلغین کی مذمت کر کے ان ناواقف بے خبر نومسلموں کو ان کی اتباع کرنے سے روک رہے ہیں۔ بھائی اس وقت تو مشترک تعلیم اسلام کی ضروری ہے۔ عقائد وفروع کا اختلاف پھر دیکھا جاوے گا یا تعلیم اسلام میں بھی دو حیثیت ہیں میرا سکھلایا ہوا اسلام حق اور دوسرے کا

سکھلایا ہوا باطل۔ جیسے کہ دو طالب علم تھے اور دونوں سگے بھائی تھے۔ آپس میں لڑے اور ایک نے دوسرے کو ماں کی گالی دی۔ کسی نے کہا کہ ارے کمبخت وہ تیری بھی تو ماں ہے۔ تو کہنے لگا کہ اس میں دو حیثیت ہیں۔ ایک یہ کہ میری ماں ہے۔ اس حیثیت سے تو معظمہ مکرمہ اور ایک یہ کہ وہ اس کی ماں ہے۔ اس حیثیت سے وہ ایسی اور ویسی کیا۔ اسلام میں بھی دو حیثیتیں بنالیں، ایک یہ کہ میں سکھاؤں اس حیثیت سے اسلام برحق ہے۔ ایک یہ کہ تو سکھاوے اس حیثیت سے برحق نہیں۔ اگر یہ ہے تو خیر تم ہی اسلام سکھاؤ۔ لیکن اگر خود ہمت نہ ہو تو دوسروں کو سکھلانے دو۔ یہ کیا خرافات ہے کہ نہ خود سکھاؤ اور نہ کسی اور کو سکھانے دو۔

اس پر عذر کی ایک حکایت یاد آ گئی۔ کہ کسی میدان میں بہت سے مقتول پڑے تھے۔ ان میں ایک زخمی بھی تھا۔ رات آتی ہوئی دیکھ کر اکیلے مردوں میں پڑے پڑے اس کا جی گھبرایا۔ کہ اندھیری رات مردوں کے ڈھیر، نہ کسی سے بات کے نہ چیت کے۔ ادھر سے جو آدمی نکلتا ہے یہ اس کو بلاتا ہے مگر کوئی نہیں آتا اور واقعی اس بھیانک منظر میں کون ٹھہرے۔ اتفاق سے ایک بنیا آتا ہوا معلوم ہوا۔ اس نے زور سے پکارا۔ اے لالہ جی۔ اے لالہ جی! آواز سن کر کہ لگا بھاگنے۔ سمجھا کہ کوئی بھوت ہے مگر کئی بار کے پکارنے میں دور ہی سے بولا کیا ہے۔ اس نے کہا ڈرومت، ادھر آؤ۔ میری کمر میں ایک ہمیانی روپوں کی بندھی ہے اسے کھول کے تم لے جاؤ۔ نہیں تو میں مرجاؤں گا اور معلوم نہیں کس کے ہاتھ آوے گی۔

یہ لوگ ہوتے ہیں لالچی۔ ٹھہر گیا اور ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔ جب نزدیک پہنچا تو اس نے کمر سے تلوار نکال کے پیروں پر اس زور سے ہاتھ دیا کہ ٹانگیں کٹ گئیں۔ مگر لالچ میں پھر بھی ہمیانی ٹٹولی۔ وہاں کچھ بھی نہیں ہے کہنے لگا ارے یہ کیا کیا؟ اس نے کہا کہ کیا کیا، جی گھبراتا تھا جس کو بلاتے تھے کوئی ٹھہرتا نہ تھا۔ اس ترکیب سے تم کو اپنے پاس رات کو رکھا ہے۔ اب ہم تم مل کے باتیں کریں گے۔ تو لالہ جی کیا کہتے ہیں۔ واہ بے اُوت کے اُوت مکا مکا نہ آپ چلے نہ اور کو چلنے دے۔

تو یہی حالت ہماری ہے کہ نہ آپ کام کریں اور نہ کسی کام کرنیوالے کو کرنے دیں۔ عیب نکالتے ہیں کہ یہ تو بدمذہب ہے، بدعقیدہ ہے اگر اس نے کسی کو مسلمان بنالیا۔ تو وہ ایسا ہی ہوگا

جیسا یہ۔ پھر ایسا مسلمان بنانے سے کیا فائدہ ارے بھائی: مسلمان تو بنا لینے دو۔ پھر تم جا کے اپنے عقائد سکھا دینا۔ بہر حال اتفاق کے ساتھ دعوت الی الاسلام کا کام کرنا نہایت اہم اور ضروری ہے۔ اور نہایت اہم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اور سب شعبے دعوت کے چھوڑ دو۔ سب کرو۔

اور اس کام کیلئے جنہیں مناظرہ میں مہارت ہو، وہ زیادہ موزوں ہوں گے۔ انہیں منتخب کرلو اور جو لوگ غیر مذہب کا علم نہیں رکھتے۔ انہیں مسلمانوں کے اخلاق کی اصلاح کیلئے رہنے دو اور جو بے علم ہیں کہ نہ اپنے مذہب پر نظر ہے نہ دوسرے کے مذہب پر۔ وہ دعوت حکمیہ کریں۔ یعنی مبلغین کیلئے وہ سرمایہ جمع کریں۔ تا کہ اس سرمایہ سے یہ کام کیے جائیں۔ یعنی ضروری چھوٹی چھوٹی کتابیں چھاپ کے ان لوگوں میں بانٹی جائیں اور قرآن اور روزمرہ کی ضروریات دین کے مدرسے قائم کیے جائیں، مبلغین کی تنخواہیں دی جاویں۔ اگر اس ترکیب سے انتظام کیا جاوے گا۔ تو نئی نسل تو یقیناً اچھی ہوگی کہ انہیں شروع ہی سے دین سے مناسبت ہوگی اور ان شاء اللہ تعالیٰ پرانی نسل پر بھی معتد بہ درجہ میں اس کا اچھا اثر پڑے گا۔

چنانچہ یہاں بھی یتیم خانہ میں دعوت حکمیہ کا انتظام کیا گیا ہے اور جب تک کوئی مستقل تحویلدار مشورہ سے معین ہو۔ اس کے متعلق تمام چندہ ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو دینا چاہیے اور چونکہ وہ ہر وقت نہیں ملتے۔ اس لئے انہوں نے یتیم خانہ میں اپنے معتبر نائب مقرر کر دیئے ہیں۔ وہ روپیہ لے کر رسید دیں گے اور دینے میں قلیل و کثیر کا خیال نہیں ہونا چاہیے جو ہو سکے وہ دو خواہ روپیہ ہو، خواہ پیسہ۔ بہر حال کچھ بھی ہو عنداللہ اس کی بھی بڑی وقعت ہے۔

دعوت کا آخری درجہ

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی تو ہے جس کے پاس نہ علم ہے نہ مال۔ پھر وہ کیسے اس دعوت میں حصہ لے، اس کا جواب یہ ہے۔

لا خیل عندک تھدیھا ولا مال فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

(نہ تمہارے پاس گھوڑا ہے نہ مال جسے ہدیہ دے سکو، پس زبان سے مدد کرو اگر مال سے مدد نہیں کر سکتے)

یعنی اگر علم اور مال نہیں ہے تو خالی زبان تو ہے۔ اس سے کام کرو، باقی یہ کہ زبان سے کیا کام کریں۔ تو زبان سے دعا کیا کرو۔ کہ اے اللہ! اسلام کو عزت دیجئے۔ اے اللہ اسلام کی نصرت کیجئے۔ اور اے اللہ مسلمانوں کے دین کی حفاظت کیجئے۔ اے اللہ حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کر دیجئے اور دین کے برکات کو عام اور تام کر دیجئے۔ تو بھائی یہ تو ایسی دعوت ہے کہ اس سے تو کوئی بھی نہیں گیا گزرا۔ مگر افسوس! بہتوں سے یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ بات کیا ہے کہ دل کو نہیں لگی۔

خلاصہ یہ کہ جب سب مل کے اپنی اپنی خدمت میں لگیں گے تب کہیں ثمرہ مرتب ہوگا اور بفرض محال ثمرہ نہ بھی مرتب ہو تو تم اپنے کام میں لگو۔ جو تمہارا کام ہے باقی دینا یا نہ دینا ان کا کام ہے۔ وہ یہ کہ ان آیات سے تو سب کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ داعی میں دعوت کے ساتھ عمل صالح اور عمل صالح کے ساتھ تواضع وافتقار بھی ہونا ضروری ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں اور دیکھ کر سخت شرم اور افسوس ہوتا ہے۔ کہ اسلامی کام اکثر ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جن پر عمل صالحاً تو کیا صادق آتا، آمن بھی مشکل سے صادق آتا ہے۔ یعنی مدعی تو ہیں خدمت اسلام کے اور کفر کے کلمے بکتے ہیں۔ علماء کی تضحیک وتوہین کرتے ہیں۔ دین کا استخفاف کرتے ہیں اور پھر اسلام کی خدمت کے مدعی بنتے ہیں۔ دین کے حامی بنتے ہیں۔ گھر میں تو یزید ہیں اور پلیٹ فارم پر بایزید۔

داعی کو متقی ہونا چاہیے

یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں فلاح نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ قیامت کب آوے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب کام غیر اہل کار کے سپرد ہوگا۔ میں خادمان اسلام کو خدمت چھوڑنے کے لئے نہیں کہتا بلکہ یہ کہتا ہوں کہ وہ خود بھی عمل صالح کے پابند ہو جاویں۔ مگر ریاء سے نہیں کہ مجمع کے دکھانے کو نماز پڑھ لی یا گھر میں بھی پڑھی مگر اس خیال سے کہ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ پھر جب اس خدمت کے عہدہ سے استعفیٰ دیا۔ اللہ میاں کو بھی نماز سے استعفیٰ دیا۔

جیسے ایک گنوار کی بھینس مرگئی۔تو جھٹ سے روزہ توڑ دیا۔ کہ لے اور روزہ رکھوا لے۔
نعوذ باللہ۔ ایک مقام پر ایک مدعی حمایت دین شطرنج کھیل رہے تھے۔ کسی نے دیکھ کے کہا، میاں، تم تو صدر ہو خلافت کمیٹی کے۔ تمہیں کیا ہوا۔ جو شطرنج کھیل رہے ہو۔ کہنے لگے میاں اس خلافت کمیٹی ہی کی وجہ سے سے داڑھی رکھ لی۔ نماز پڑھنا شروع کردی۔ اب کہتے ہو شطرنج بھی نہ کھیلو۔ تو گویا بالکل ہی بندھ جاوٗ۔ سلام ہے ایسی خلافت کمیٹی کو۔ تو جیسی ہماری دیانت ویسی ہی ہمارے کام میں برکت۔ میں سچ کہتا ہوں۔ اگر ہمارا اسلام واقعی اسلام ہوتا۔ تو کفار ہماری صورت دیکھ دیکھ کے مسلمان ہوا کرتے۔ جیسے ہمارے بزرگوں کے وقت میں ہوا کرتا تھا۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے ہاتھ میں دیکھی۔ فرمایا کہ یہ میری زرہ ہے۔ اس نے کہا میری ہے، دونوں میں حجت بڑھی۔ اس وقت حضرت شریح قاضیؒ تھے۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بالکل محکوم و ماتحت تھے اور پھر یوں بھی تابعی تھے۔ صحابی کے رتبہ کے نہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے اجلاس میں مستغیث ہوکر پہنچے۔ تو اب فرمائیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دعویٰ کریں۔ تو کون کہہ سکتا ہے۔ کہ دلیل و حجت لاوٗ۔ مگر شریح پوچھتے ہیں اس یہودی سے کہ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ ٹھیک ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ کا کوئی گواہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ ایک صاحبزادہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور ایک غلام قنبر جنہیں آپ آزاد کر چکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ مذہب تھا کہ باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت معتبر ہے اس لئے حسن رضی اللہ عنہ کو پیش کیا۔ مگر شریح کا یہ مذہب نہ تھا اور ان کے نزدیک نصاب شہادت پورا نہ تھا اس وجہ سے مقدمہ خارج کردیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نہایت بشاش اجلاس سے باہر چلے آئے۔

اس یہودی نے جو یہ رنگ دیکھا تو اس پر بڑا اثر ہوا۔ اس نے کہا کہ اول تو یہ بادشاہ صاحب اختیار اگر چاہتے تو مجھ سے چھین لیتے اور جوتیاں بھی لگاتے، مگر نہیں۔ ضابطہ کے موافق قاضی کے یہاں جاتے ہیں۔ جو ان کا محکوم ہے اور پھر وہ آپ کی شہادت کو رد کر کے مقدمہ خارج کردیتا ہے اور یہ ذرا بھی چین بجبیں نہیں ہوتے۔ ضرورت یہ مذہب حق ہے۔ فوراً زرہ کا اقرار کرلیا اور فوراً ہی تشہد پڑھ کر مسلمان ہوگیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوکر

آپ کے ساتھ جنگ صفین میں شریک ہوا اور وہیں شہید ہوا۔ تو اتنا بڑا دشمن اسلام ذرا سی بات میں مسلمان ہوگیا۔ تو بات کیا تھی۔ فقط حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اخلاق کو دیکھ کر اس پر اثر ہوا۔ اسی طرح اگر ہم بھی پکے مسلمان ہو جائیں تو بہت سے سلیم الطبع کافر ہم کو دیکھ دیکھ کے مسلمان ہو جائیں۔ تو عمل صالحاً کی اس لئے ضرورت ہے پس جن کے ہاتھ میں دین کی خدمتیں ہیں انہیں ضرور متقی بننا چاہیے شاید متقی کی حقیقت کوئی نہ سمجھے۔ تو میں مختصر کیوں نہ کہہ دوں کہ عمل کے اعتبار سے ملا بننا چاہیے۔

اکابر کا مذاق

پھر ملا بن کر بھی جو ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ اپنی خدمت پر فخر کرتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہونا چاہیے۔ جیسا کہ انني من المسلمین (بے شک میں فرمانبرداروں میں سے ہوں) سے معلوم ہوگیا۔ کہ سب کام خدا ہی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ اپنے اوپر نظر نہ کرنی چاہیے۔ خدا ہی پر نظر رکھنی چاہیے۔

تو گویا ملا کے ساتھ صوفی بھی بننا چاہیے۔ دیکھئے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت خالد کو اس حالت میں سرداری سے معزول کیا ہے جب کہ وہ کفار کے مقابلہ میں ملک شام میں دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ جس کی دو وجہ تھیں، ایک تو حضرت خالد کی بعضی سخاوتوں کو وہ بے موقع سمجھتے تھے۔ دوسرے وہ یہ فرماتے تھے کہ لوگوں کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر زیادہ نظر ہوگئی ہے، خدا پر کم نظر ہوگئی ہے یہ ٹھیک نہیں۔ غرض شام میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس پروانہ بھیجا کہ میں نے خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کیا اور ان کی جگہ تم کو مقرر کیا۔ یہ نرے عابد زاہد بزرگ تھے۔ نہ آداب جنگ کا خالد کے برابر تجربہ رکھتے تھے اور نہ ان کے برابر قواعد جنگ سے واقف تھے اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سیف اللہ اور بڑے مشہور شجاع اور ماہر جنگ تھے۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا بھی کہ حضرت یہ کیا کیا۔ آپ نے یہی فرمایا کہ لوگوں کی نظر خالد رضی اللہ عنہ پر پڑنے لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ تھے، مجھے ڈر ہوا کہ خالد رضی اللہ عنہ پر نظر کرنے سے کہیں نصرت میں کمی نہ ہو جائے یہ تھا ہمارے اکابر کا مذاق۔

اب تو اس قدر دہریت بڑھتی جاتی ہے کہ خدا پر نظر ہی نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تدبیر نہ

کرو۔ ہاں یہ کہتا ہوں کہ تدبیر کو قبلہ و کعبہ نہ بناؤ :

عقل در اسباب میدارد نظر　　　عشق می گوید مسبب رانگر

"عقل ظاہری اسباب پر نظر رکھتی ہے۔ عشق کہتا ہے۔ اسباب پیدا کرنیوالے پر نظر رکھ۔"

تدابیر میں اعتدال ہو، افراط نہ ہو۔ القصہ اب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس پروانہ پہنچا۔ اب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ مارے شرم کے ان کے سامنے جا کر نہیں کہتے کیونکہ اب تک تو ان کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے اب ان کو ماتحت ہونے کیلئے کیسے کہیں۔ اس لئے وہ خط حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا، حضرت خالد رضی اللہ عنہ خط پڑھ کر خود ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں ان شاء اللہ آج سے آپ کی اطاعت کروں گا۔ کیونکہ اب آپ ہمارے سردار ہیں اور میں اس عزل کو اپنے لئے حق تعالیٰ کی نعمت سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس سے قبل مجھے اپنی جان پیاری تھی کہ اگر میں نہ ہوں گا تو یہ خدمت کون کریگا۔ اس لئے بعض خطرات میں پڑنے سے احتیاط کرتا تھا اور اب تو بے فکری ہوگئی، اب آپ میرے قتال کی خدمتیں انشاء اللہ تعالیٰ دیکھئے گا۔

اصلاح نیت

اور صاحب اب تو یہ حالت ہے کہ جب تک صدر یا سیکرٹری رہے، نماز روزہ سب کچھ کرتے رہے جب دوسرا صدر ہوگیا۔ تو یہ اپنے شہر کو بھاگ گئے تو خود خدمت سے مقصود منصب ہوگیا۔ جو سرتاسر دین کے لئے اس قدر مضر ہے کہ ایک بزرگ کے ایک مرید تھے۔ ایک عرصہ تک ذکر و شغل کرتے رہے مگر کچھ نفع نہ ہوا۔ ایک دن شیخ سے اپنی حالت عرض کی۔ شیخ نے پوچھا، تمہاری نیت اس ذکر و شغل سے کیا ہے؟ کہا نیت یہ ہے کہ کچھ حاصل ہو جاوے گا تو لوگوں کو نفع پہنچاؤں گا۔ فرمایا توبہ کرو۔ یہ تو شرک ہے۔ جب ہی تو تم کو نفع نہیں ہوتا۔ پہلے ہی سے بڑے بننے کی نیت ہے۔ بس نیت یہ رکھو کہ مرتا ہوں، مٹتا ہوں، اپنی درستی چاہتا ہوں۔ پھر چاہے وہ تمہیں مرشد بنا دیں، چاہے نہ بناویں۔ تو محصرین کے نزدیک یہ نیت بھی مضر ہے کہ لوگوں کی اصلاح کروں گا جب دین کی نیت سے بھی بڑائی ناپسند ہے تو دنیا کے کاموں میں تو بڑائی کا ارادہ کب پسندیدہ ہوگا۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کے ساتھ عمل

صالح بھی اور تواضع وانکسار بھی ہو۔ چونکہ فتنۂ ارتداد کے سبب اس وقت بھی اس مضمون کی خاص ضرورت تھی اور آئندہ بھی عام ضرورت ہے اس لئے تفصیل سے اس کو بیان کر دیا۔

مکملات دعوت

اب آگے بقیہ آیات کا ترجمہ بھی بیان کئے دیتا ہوں۔ ولا تستوی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ۔ یعنی اچھائی اور برائی برابر نہیں ہے۔ یہاں سوال ہوتا ہے کہ اوپر تو دعوت الی اللہ کا ذکر تھا۔ یہاں یہ بیان ہے۔ کہ نیکی بدی برابر نہیں ہے، آخر اس جملہ کو سیاق وسباق سے کیا مناسبت۔ آگے ارشاد ہے ادفع بالتي هي احسن یعنی مدافعت کیجئے، اس طریقے سے جو اچھا ہو۔ یہ بھی بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اخلاق کی تعلیم ہو رہی ہے۔

جواب یہ ہے کہ اصل تعلق تو دعوت الی اللہ کے معمول سے ادفع بالتي هي احسن کا ہے۔ اس طرح سے کہ جو شخص دعوت کے لئے کھڑا ہوتا ہے عموماً اس کی مخالفت ہوتی ہے۔ لوگ برا بھلا کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس وقت اس میں بھی ہیجان پیدا ہوتا ہو اور یہ بھی بدی کے بدلے بدی کر بیٹھے، اس لئے ایسے واقعات کے پیش آنے سے پہلے ہی تعلیم فرماتے ہیں۔ کہ اخلاق درست کرو۔ اپنے میں ضبط اور صبر پیدا کرو۔ یہ معنی ہوئے۔ ادفع بالتي هي احسن کے۔ یعنی ادفع السيئة بالحسنة۔ کہ کوئی برائی کرے تو اسے نیکی کر کے دفع کر دو۔ پس اصل تعلق تو جملہ ادفع کا ہے۔ باقی لا تستوی الحسنة یہ اس کی تمہید ہے۔ یعنی بتلانا تو مقصود ہے ادفع بالتي کا مگر تمہید میں پہلے ایک قاعدہ کلیہ بتاتے ہیں۔ کہ دیکھو نیکی اور بدی اثر میں برابر نہیں ہوتی۔ یعنی اگر برائی کا انتقام برائی سے لے لیا۔ تو اس کا اثر اور ہوگا اور اگر ٹال دیا۔ تو اس کا اثر اور ہوگا۔ اور وہ اثر یہ ہوگا۔ کہ:

فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ.

جس شخص کے اور تمہارے درمیان میں عداوت تھی۔ وہ ایسا ہو جائے گا جیسے گاڑھا دوست۔ مطلب یہ کہ دعوت الی الاسلام کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے۔ کہ مخالفین بھڑکیں نہیں۔ کیونکہ اگر بھڑکے گا تو اس کا شر اور بڑھے گا۔ پہلے چھپی ہوئی عداوت کرتا تھا۔

تو اب کھلی ہوئی کرے گا۔ تو اس عداوت سے اور شر سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ ٹال دو اور انتقام لینے کی فکر نہ کرو۔ تو دشمن دوست بن جاوے گا اور پھر وہ اگر تمہیں مدد بھی نہ دے گا۔ تو تمہاری کوششوں کو روکے گا بھی نہیں۔ اور دعوت الی اللہ کا کام مکمل ہوگا۔

یہاں اس کے متعلق ایک شبہ ہے کہ ہم بعض جگہ دیکھتے ہیں۔ کہ باوجود اس رعایت کے بھی وہ دوست نہیں بنتا۔ بلکہ اپنے شر اور فساد میں اسی طرح سرگرم رہتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں باقاعدہ عقلیہ ایک شرط ملحوظ ہے۔ وہ یہ کہ بشرط سلامۃ الطبع کہ وہ شر سے اس وقت باز رہے گا جبکہ سلیم الطبع ہو۔ اور اگر سلامت طبع کی قید نہ ہو۔ تو اس وقت یہ جواب ہے کہ ولی حمیم نہیں۔ بلکہ کانہ، ولی حمیم فرمایا ہے۔ تشبیہ کا حاصل یہ ہوگا کہ کچھ نہ کچھ شر ہی میں کمی نہ رہے گی اور اگر تم انتقام لوگے۔ تو گو اس وقت وہ عدم قدرت کی وجہ سے خاموش ہو جاوے گا۔ مگر در پردہ کینہ مضمر رکھے گا اور حتی الامکان لوگوں سے تمہارے خلاف سازش کرے گا۔ جس کو غلطی سے آدمی کبھی یوں سمجھ جاتا ہے۔ کہ انتقام اصلح ہوا تو ایک ادب یہ بتایا تبلیغ کا کہ صبر وضبط سے کام لیا جائے اور جو ناگوار امور مخالفین کی طرف سے پیش آویں، انہیں برداشت کیا جاوے، اور یہ مدافعت سیئہ بالحسنۃ چونکہ کام تھا نہایت مشکل اس لئے اس کی ترغیب کیلئے فرماتے ہیں:

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ

اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے۔ تو اس مدافعت کی ترغیب دو وجہ سے دلائی گئی ہے ایک باعتبار اخلاق کے کہ ایسا کرنے میں صابرین میں شمار ہوگا اور ایک باعتبار اجر و ثواب کے ایسا کروگے۔ تو اجر عظیم کے مستحق ہو جاؤ گے۔

اب اس میں ایک مانع بھی تھا۔ یعنی دشمن شیطان جو ہر وقت لگا ہوا ہے۔ اس کا بھی علاج بتاتے ہیں۔

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ.

اگر آپ کو شیطان کی طرف سے وسوسہ آوے۔ تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے۔ یعنی بعض اوقات مخالفین کی باتوں پر شیاطین غصہ دلاتے ہیں اور اس وقت صبر کے چھوٹ جانے کا اندیشہ

ہے۔تو ایسے وقت کیسے فرماتے ہیں۔کہ **فاستعذ باللّٰہ** خدا کی پناہ میں چلے جاؤ یہ مطلب نہیں کہ صرف زبان سے **اعوذ باللہ** پڑھ لیا کرو۔مطلب یہ ہے کہ خدا سے دل سے دعا کرو کہ وہ شیطان کے وسوسہ کو دور کردے اور صبر پر استقامت دے۔**انہ ھو السمیع العلیم**۔بلا شبہ وہ خوب سنے والا، خوب جاننے والا ہے۔یعنی وہ تمہاری زبان سے پناہ مانگنے کو بھی سنیں گے اور دل سے پناہ مانگنے کو بھی جانیں گے اور پھر تم کو پناہ دیں گے اور مدد کریں گے اور شیطان کو دفع کردیں گے۔ان آیات میں حق تعالیٰ نے پورے پورے آداب اور مکملات دعوت الی اللہ کے اور اس کے طریقے سب بتا دیئے۔یہ ہے حاصل اس بیان کا یہ چونکہ ضروری مضمون تھا۔اس لئے میں نے بقدر ضرورت تفصیل سے بیان کردیا ہے۔اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم کو اس کے سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین فقط

☆..................................☆
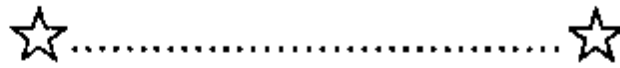
مفتی اور قیمتی

ایک مرتبہ منصب افتاء کے ذمہ داریوں کا ذکر ہو رہا تھا۔
فرمانے لگے کہ مفتی ہونا بھی قیمتی کا کام ہے مفتی کا نہیں۔
(از حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ)

آداب التبلیغ

آداب التبلیغ سے موسوم یہ وعظ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی درخواست پر دارالعلوم دیوبند میں بروز جمعرات ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ کو ہوا۔ جو ۲ گھنٹہ ۴۵ منٹ تک جاری رہا۔ کرسی پر بیٹھ کر حضرت والاؒ نے بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ جو زیادہ تر علماء اور طلباء تھے۔ مولانا اظہر علی صاحب سلہٹیؒ نے اسے قلمبند فرمایا۔

تبلیغ عام یعنی وعظ کہنا یہ علماء کا کام ہے۔ خواہ درسیات پڑھ کر عالم ہوا ہو یا کسی عالم سے مسائل سن کر عالم ہو گیا ہو۔ اس کو بھی تبلیغ عام کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ کسی بڑے نے اس کو اس کام کے لئے معین کیا ہو۔

چنانچہ صحابہؓ نے کہاں پڑھا تھا؟ وہ بھی تو سُن سُن کر تبلیغ کرتے تھے۔ مگر ہر شخص خود نہ سمجھے۔ کہ میں اس کے قابل ہو گیا ہوں۔ جب تک کوئی کامل نہ کہہ دے کہ تم قابل ہو۔

بقول ایک حکیم کے:

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

از حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا وخطبہ

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ.

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں کو سبیل رب کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ بلایئے اور (اگر مجادلہ کی ضرورت ہوتو) ان سے مجادلہ بھی کیجئے مگر احسن طریقہ سے، بے شک (آپ صلی اللہ علیہ وسلم) کا رب خوب جانتا ہے کہ کون راہ راست سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے)

نوعیت مضمون

جس مضمون کو اس وقت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کوئی نیا مضمون نہیں۔ مگر ایک اعتبار سے نیا بھی ہے یعنی اصل وحقیقت کے اعتبار سے تو جدید نہیں ہاں عارض کے اعتبار سے جدید ہے۔ یعنی واقعہ میں تو یہ پرانا ہے مگر اس کا جو مقتضا تھا اس میں آج کل کمی ہے اس کمی کو دور کرنے اور اس کے حقوق کما ینبغی پر آگاہ کرنے کے لئے یعنی جس درجہ اس کا اہتمام ہونا چاہیے تھا اور آج کل وہ نہیں ہے اس اعتبار خاص سے جدید بھی کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس کے تعین سے معلوم ہو جائے گا کہ اس میں آج کل کس قدر کمی ہے اور حقیقت میں اس میں کیسا اہتمام ہونا چاہیے تھا اور ہر چند کہ بیان میں کوئی نیا مضمون ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک اعتبار سے جدید ہونا مضر بھی ہے کیونکہ جدید وہ ہوگا، جو بدعت ہو

اور دین سے خارج اور زائد ہو اور جو پہلے سے دین کا جزو ہو وہ تو قدیم ہی ہوگا۔ لہٰذا انتظار مضمون جدید کا علی الاطلاق تو غلطی ہے مگر عام لوگوں کا طبعاً یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وعظ میں کوئی نیا مضمون ہونا چاہیے، کیونکہ اس میں جی لگتا ہے اس مصلحت کا لحاظ فی الجملہ کر کے جی چاہا کرتا ہے کہ بیان میں گونہ جدت ہو تو اچھا ہے۔ خواہ جدید اسا عتبار سے ہو کہ اب تک سامعین کو بالکل معلوم ہی نہیں ہوا۔ یا توجہ کے درجہ میں جدید ہو۔ یعنی معلوم تو ہے مگر ادھر توجہ نہیں رہی۔ اس لئے بیان میں اس جدت خاص کے اعتبار سے اس کی رعایت کی جاتی ہے کہ کوئی نیا مضمون ہو۔ ورنہ جدید ہونے کی ضرورت نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کسی قسم کی جدت بھی نہ ہو، خواہ بالذات یا بالعرض، بیان پھر بھی مفید ہوتا ہے۔

اگر یہ شبہ ہو کہ جب کسی قسم کی بھی جدت نہیں۔ تو اس بیان سے کیا فائدہ۔ یہ تو تحصیل حاصل ہے۔ سو یہ کہنا غلط ہے کیونکہ اگر اور کچھ فائدہ نہ ہو تو مکرر کرنے سے تاکید ہی ہو جائے گی اور تاکید کا مفید و مؤثر ہونا علم بلاغت میں ثابت ہے۔ تو یقیناً تکرار سے ایک نیا نفع ہوگا۔ یعنی تاکید کا اثر، جو کہ قبل از بیان نہیں تھا تو یہ کیا تھوڑا فائدہ ہے۔ تو تحصیل حاصل کہاں ہوئی۔ بلکہ یہ تو تحصیل غیر حاصل ہے مگر تاہم عموماً طبعی اقتضاء یہ ہے کہ ایسی بات بیان ہو۔ جو پہلے سے بالکل ذہن میں نہ تھی۔ خواہ حصول کے اعتبار سے کہ وہ چیز ذہن میں حاصل ہی نہ تھی یا ذہول کے اعتبار سے کہ حاصل تو تھی مگر اس سے ذہول ہو گیا تھا۔ اس کی طرف توجہ نہ تھی تو اس طبعی اقتضاء کو دیکھ کر بعض دفعہ جی چاہا کرتا ہے کہ اگر اس کی رعایت کی جائے کہ مضمون میں گونہ جدت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

تعین مضمون

چنانچہ اس وقت بھی اس کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ مضمون خاص اعتبار سے نیا ہے۔ اب اس کو متعین کرتا ہوں۔ اہل علم کو تو آیت کی تلاوت ہی سے اس مضمون کی تعیین ہو گئی ہوگی۔ کیونکہ مجمع اہل علم کا ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض لوگ جو اہل علم نہیں نہ سمجھے ہوں۔ ان کو ترجمہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا۔ اس لئے ترجمہ کرتا ہوں۔ تاکہ ان

کے نزدیک بھی متعین ہوجائے۔حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن ان ربک هو اعلم بمن ضل عن سبیله و هو اعلم بالمهتدین.

یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں کو سبیل رب کی طرف حکمت اور مواعظ حسنہ کے ساتھ بلائیں اور (اگر مجادلہ کی ضرورت ہو تو) ان سے مجادلہ (بھی) کیجئے۔ مگر احسن طریقہ سے ہو۔ ترجمہ سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ کہ کیا مضمون بیان کرتا ہے۔ وہ مضمون خدا کے سبیل کی طرف بلانے کا ہے۔ خدا کا سبیل کیا ہے سبیل رب وہ ہے۔ جس سے ان تک رسائی ہوجائے۔

اور ظاہر ہے۔ کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ وہ سبیل صرف اسلام ہے اگر انسان اسلام کے احکام بجالاتا ہے تو اس کو ان تک رسائی ہوسکتی ہے اور یہی سبیل رب ہے۔ اسی طرف لوگوں کو بلانے کا حضور کو امر ہوا ہے اور اسلام کے اندر احکام دو قسم کے ہیں۔ ایک اصولی، ایک فروعی، لفظ سبیل دونوں کو عام ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ لوگوں کو اصول کی بھی دعوت دیجئے اور فروع کی بھی۔ تو خلاصہ یہ نکلا کہ اصول اور فروع پر بلا کر ان کو اسلام کی طرف بلایئے۔ باقی دعوت کا ایک طریقہ ہے۔ وہ اس کے متعلقات سے ہے۔ یعنی اس کے آداب ولوازم جن کا ذکر اپنے موقع پر آجائے گا۔ مگر تعین مضمون کے واسطے اتنا ہی کافی ہوگیا۔ کہ وہ مضمون اسلام کی طرف بلانا ہے اور اسلام ہی دین حق ہے۔ وہی سبیل رب ہے، وہی صراط مستقیم ہے یہ اس کے القاب ہیں۔

دعوت میں کوتاہی

اور ظاہر ہے کہ گو یہاں ادع کا خطاب حضور کو ہے۔ مگر حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ رسول اور اتباع رسول سب اس کے مخاطب ہیں۔ ہاں حضور کو خطاب اولاً ہے۔ اور دوسروں کو ثانیاً۔

اب دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں ہماری کیا حالت ہے اور ہم کو اس حکم کی طرف توجہ ہے یا نہیں۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ادھر بالکل توجہ نہیں۔ اعتقاداً تو اس کو

مامور بہ سمجھتے ہیں۔ بلکہ اگر اس میں بھی غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کا یہ مامور بہ ہے، اس درجہ سے بہت کم سمجھا جاتا ہے اس کو درجہ وجوب میں سمجھنے والے تو بہت ہی کم ہوں گے۔ کوئی مستحب سمجھتا ہے، کوئی مستحسن اور غضب یہ کہ مستحسن سمجھنے میں بھی قید لگاتے ہیں کہ مستحسن بھی جب ہے کہ کسی مصلحت سیاسیہ[1] کے خلاف نہ ہو ورنہ وہ بھی ندارد۔ اول تو یہی غضب تھا۔ کہ بعض نے واجب کو مستحب کہا۔ پھر یہ دوسرا غضب ہے۔ کہ اس میں یہ قید لگا دی کہ اس مصلحت کے خلاف نہ ہو۔ وہ کیوں محض اپنے اغراض کے سبب کیونکہ دینی کاموں میں بھی لوگ اول اغراض کی طرف دیکھتے ہیں۔ کہ یہ اس کے بھی موافق ہیں یا نہیں۔ اگر ہوا فبہا ورنہ کھینچ تان کر اس کو اغراض کے تابع بناتے ہیں اور اغراض کو متبوع یعنی پہلے اغراض تجویز کر لئے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ ان اغراض کے موافق ہے یا مخالف۔ پھر وہ غرض جہاں فوت ہونے لگی۔ کہہ دیا کہ یہ اس وقت یہ کام مصلحت کے خلاف ہے۔ لہذا مستحب بھی نہیں رہا۔ اب اس کو اصلاً مامور بہ بھی نہیں سمجھتے۔ بلکہ عجب نہیں کہ ایک دن کسی مصلحت کی وجہ سے مامور بہ کو منہی عنہ بتلانے لگیں۔ افسوس! مسلمانوں سے یہ نہیں ہوتا کہ اغراض کو احکام کے تابع بنائیں۔ کہ اصل تو یہی ہے وہ سر انجام پا جائے، پھر اغراض خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں، مگر افسوس یہ نہیں کرتے۔ بلکہ بعض نے تو اغراض نفسانی کو پورا کرنے کے لئے دعوت الی الاسلام کا نام فتنہ اور فساد رکھا ہے اور یہی وجہ ہے بے توجہی کی کہ اس میں اپنی اغراض کی وجہ سے بے حد تساہل کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر اپنی آنکھ سے بھی دیکھیں کہ کسی نے نماز میں تعدیل ارکان نہیں کی اور ایسے بہت نکلیں گے۔ تو ہماری یہ ہمت نہیں ہوتی کہ اس سے اتنا کہہ دیں کہ صل فانک لم تصل۔ (نماز پڑھ بے شک تو نے نماز نہیں پڑھی)

اور اس کی وجہ صرف اتباع ہوئی ہے۔ اس لئے باوجود علم کے محض رکیک تاویلیں گھڑ لیتے ہیں۔ مگر خدا کے ساتھ حیلہ وتزویر چل نہیں سکتا۔

بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ ولو القیٰ معاذیرۃ

(بلکہ انسان اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا گو اپنے حیلے (حوالے) پیش لائے)۔

اگر انصاف سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اصل میں دنیا کو قبلہ وکعبہ بنا رکھا ہے امر

---

[1] اشارہ ہے پرستاران تحریکات جدیدہ کی معاملات کی طرف ۱۲۔ منہ

بالمعروف نہ کرنے کی وجہ فقط اتنی ہے کہ اس سے دنیوی اغراض فوت ہوتے ہیں۔ دوستی نہیں رہے گی، میل ملاپ نہ رہے گا، ہنسی خوشی جاتی رہے گی۔ اگر ہم نے کسی کو ٹوکا تو وہ ناخوش ہو جائے گا۔ پھر ناخوش ہو کے آزار کے درپے ہو جاوے گا۔ پھر آزار سے ہم کو تکلیف ہو گی اور یہ آزار و تکلیف بھی سب وہمی محض ایسے مواقع کے متعلق ذرا علماء سے تو دریافت کرلو کہ صاحب امر بالمعروف میں اگر ایسی ایسی باتیں پیش آویں تو ایسی حالت میں ہم معذور ہیں یا نہیں ان سے پوچھو تو کہ کون کون سی چیزیں مسقط وجوب امر ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس کا کوئی طریقہ ہی نہیں۔ اس کیلئے کوئی شرط وضابطہ ہی نہیں ہے اور ضرور ہے مگر شرائط وضوابط و آداب واعذار علماء سے دریافت کرو۔ خود مفتی بن کر کیوں فتویٰ لگا لیا۔ کہ ہم تو معذور ہیں۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ شرائط وآداب کا طالب حقیقی بھی وہی ہوگا جس نے پکا ارادہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کرلیا ہو۔ اس کو البتہ حق ہے شرائط وضوابط پوچھنے کا وہ اگر آداب واعذار معلوم کرے تو اس کو سب کچھ بتلایا جاوے گا۔ باقی حالت موجودہ میں جب کہ اس کی طرف توجہ اور التفات ہی نہیں۔ اس حالت میں آپ کو اعذار وشرائط پوچھنے اور سمجھنے کا بھی کچھ حق نہیں۔ جو شخص کام کا ارادہ ہی نہ کرے۔ اس کو نہ شرائط وضوابط بتلائے جائیں گے اور نہ اس کو آداب واعذار پوچھنے کا کوئی حق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ تو شرائط واعذار اس لئے تلاش کرے گا۔ تاکہ امر بالمعروف کرنا نہ پڑے بلکہ کسی طرح اس سے مخلصی اور رہائی مل جاوے۔ جب اعذار معلوم ہو جائیں گے تو کوئی نہ کوئی بات تراش لے گا۔ کہ مجھ میں یہ یہ عذر موجود ہیں۔ یہ شرطیں مجھ میں نہیں پائی جاتیں۔ ہم کیسے امر بالمعروف کریں۔

اس لئے علماء کو چاہیے کہ قبل از شروع عمل کسی کو اعذار وشرائط بتلایا ہی نہ کریں۔ جیسے کوئی شخص نماز کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو اور علماء سے پوچھتا ہے کہ نماز کے شرائط کیا ہیں۔ اس کے اعذار وموانع کیا کیا ہیں۔ ایسے شخص کو شرائط واعذار نہ بتانا چاہیے۔ ورنہ وہ تو مسقط صلوٰۃ کو ہر حالت میں تلاش کرے گا۔ ہر وقت اسی دھن میں رہے گا کہ کوئی بات ایسی ہو۔ جس سے نماز پڑھنے سے چھٹی مل جاوے۔ البتہ جس کا ارادہ ہو پڑھنے کا، وہ پوچھے تو اس کو بے شک بتلایا جاوے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جاوے کہ محض مخلصی کا متلاشی ہے تو مفتی کو چاہیے ایسے شخص کو ہرگز جواب

نہ دے۔ بلکہ میرے نزدیک ایسوں کو اعذار وموانع کی اطلاع کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔ یاد رکھو! ہر سائل کو یکساں جواب دینا مناسب نہیں۔ کیونکہ ہر شخص کا حال برابر نہیں۔

مجھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جواب بہت پسند آیا۔ ایک دن درس میں یہ حدیث آئی کہ:

من صلیٰ رکعتین مقبلا علیھما بقلبہ اِلیٰ آخرہ .(لم اجدالحدیث فی "موسوعۃ أطراف الحدیث النبوی شریف)

کہ جو شخص ایسی دو رکعت نماز پڑھے جن کی طرف سے دل متوجہ ہو کر حدیث نفس اور وسوسہ خطرہ عمداً بالکل نہ لاوے تو اس کے تمام گناہ معاف ہو جاویں گے۔ ایک طالب علم نے کہا، حضرت اس طرح نماز پڑھنا ممکن بھی ہے؟ نماز میں تو خیالات بہت ہی آتے ہیں۔ فرمایا تجھ کو شرم نہ آئی یہ سوال کرتے ہوئے۔ ارے کبھی اس کا قصد بھی کیا تھا جو محال نظر آتا ہو۔ بس پہلے ہی پوچھنے بیٹھ گئے۔ میاں کبھی ارادہ بھی تو کیا ہو۔ خدا کے بندے پہلے کرتے۔ پھر پوچھتے۔ کہ ہم نے کیا تھا مگر نہ ہوا۔ تو واقعی یہ جواب نہایت حکیمانہ و بزرگانہ ہے۔ واقعی جواب محض منطقیانہ نہ ہونا چاہیے بلکہ حکیمانہ جواب بھی دینا چاہیے۔ اس سے اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا کے ارشاد سے نفع یہ ہوا کہ سائل کو تنبہ ہوا۔ اپنی غلطی پر اسے ندامت و خجلت ہوئی۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ شرائط علماء سے پوچھنا جائز بھی ہے اور ان کو بتلانے سے بھی انکار نہیں۔ مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ مستفتی کون ہے۔ آیا وہ شخص ہے جو ارادہ رکھتا ہے امر بالمعروف کا جس کو اس کا اہتمام ہے عزم ہے، جس کو واقعی یہ حالات واعذار پیش آویں گے۔ اس کو بے شک ہر حالت کے آداب و اعذار معلوم کرنے چاہئیں کیوں کہ اس کو یہ امور پیش آویں گے یا مستفتی وہ ہے جس کا نہ کبھی ارادہ ہوا، امر بالمعروف کا اور نہ آئندہ ہوگا۔ بلکہ ظالم کا قصد یہ ہے کہ عمر بھر کبھی کسی کو کچھ نہ کہوں گا کیونکہ دوسرے کی دل شکنی کروں۔ محض اپنے بچاؤ کے واسطے شرائط معلوم کرتا ہے تاکہ ان کو آڑ بنادے۔ اس لئے صرف مسقطات کی فہرست جاننا چاہتا ہے تاکہ ہر حالت میں جی کو سمجھا لے۔ ایک تاویل کرے اور ہر حال کے لئے ایک من گھڑت عذر تراش لے۔

آدابِ دعوت

صاحبو! امر بالمعروف بھی ایک فرض ہے جیسے اور فرائض ہیں اور کوئی ایسی حالت نہیں جس میں فرائض ساقط ہوسکیں۔ بجز جنون واکراہ وغلبہ عقل اور خاص خاص اعذار کے باقی کسی حال میں فرائض ساقط نہیں ہوتے اور مغلوب العقل بھی وہی معتبر ہے جس کو شریعت مغلوب العقل تسلیم کرے، تمہاری من گھڑت تفسیر کا اعتبار نہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک قصبہ میں ایک شخص نے اپنی عورت کو طلاق مغلظہ دی تھی۔ عدت بھی گزر چکی تھی اس کے بعد ایک مفتی آئے۔ انہوں نے اس کو سمجھایا اور کہا کہ طلاق واقعہ ہونے کے لئے عقل شرط ہے اور تم تو اس وقت مغلوب العقل تھے۔ بس اس تاویل سے حرام عورت حلال کرلی اور ان کے نزدیک حلال بھی ہوگئی تو اس طرح تو جس کا جی چاہے دعویٰ کردے۔ مغلوب العقل ہونے کا پھر تو سارا جہان مغلوب العقل ہو جائے گا۔ مثلاً امر بالمعروف کرنے میں اصل تو تعلقات شگفتہ نہ رہنے کا خوف تھا مگر تاویل کرلی کہ میں بغض فی اللہ کے سبب ہوش باختہ ہوگیا تھا۔ اس لئے امر بالمعروف نہ کرسکا یا طمع تھی کسی چیز کے ملنے کی مگر وہاں بھی وہی تاویلیں گھڑ لی۔ صاحبو! اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ان تاویلات کا جو تمہاری تراشی ہوئی ہیں۔ کچھ اعتبار نہیں۔ تمہارے فتویٰ سے امر بالمعروف ساقط نہیں ہوسکتا۔ یہ نہیں کہ جو تمہارا دل چاہے وہی ہوجائے تمہاری رائے معتبر نہیں ہے۔ بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ:

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا　　عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(کسی صاحب نظر کو اپنا موتی دکھاؤ، چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں ہوسکتا)

کسی صاحب کمال سے پوچھنا چاہیے۔ اگر وہ کہہ دے کہ تم معذور ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ تمہارے خیالات کا یا جہلاء کے کہنے کا کچھ اعتبار نہیں۔ کسی صاحب بصیرت کی شہادت ہونی چاہیے۔ ورنہ اس طرح تو ہر شخص کوئی نہ کوئی عذر تراش لے گا۔ غرض پہلے ہر شخص قلب کو ٹٹول کر دیکھ لے۔ کہ امر بالمعروف کا قصد ہے یا کہ قصد نہیں۔ محض اس سے رہائی اور مخلصی ہی چاہتا ہے۔ اگر قصد ہو تو وہ بے شک اس کے آداب واعذار وشرائط سیکھے۔ علماء سے پوچھ

کر یا کتاب سے دیکھ کر اس لئے کہ امر بالمعروف کا حکم علی الاطلاق نہیں ہے کہ جس طرح ہو اندھا دھند دعوت و تبلیغ کرو۔ کہ نہ شرائط کی پروا۔ نہ آداب کی رعایت۔ بلکہ اس کے۔ لئے ضوابط اور طریق مقرر ہیں کیونکہ امر بالمعروف فرضیت میں نماز سے تو بڑھ کر نہیں بلکہ برابر بھی نہیں۔ اور اسی لئے قرآن میں اقامتِ صلوٰۃ کے بعد امر بالمعروف کا حکم ہے۔

اقم الصلوٰۃ و امر بالمعروف و انه عن المنکر (نماز قائم کرو اور نیک کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے منع کرو)

مگر پھر بھی نماز کے لئے کچھ آداب و اعذار و ضوابط ہیں۔ یہ نہیں کہ جو نماز پڑھنا چاہے اس کیلئے کوئی ضابطہ ہی نہیں۔ نہ وضو کی ضرورت۔ نہ ستر عورت کی، نہ قراءت کی۔ نہ پاکی کا خیال۔ نہ استقبال قبلہ کی ضرورت یہ نہیں۔ بلکہ اگر نماز پڑھنا ہے تو اول قرأت سیکھو، ناپاک ہو تو نہاؤ۔ قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر کھڑے ہو۔ یہ فرائض ہیں نماز کے۔ کہ بغیر ان کے نماز ہوتی نہیں۔ تو جیسے نماز فرض ہے اور پھر بھی اس کیلئے شرائط و ارکان وغیرہ ہیں۔ ایسے ہی امر بالمعروف کے لئے بھی کچھ قواعد و آداب ہیں۔ علماء سے ان آداب و ضوابط کو پوچھنا چاہیے۔ علماء محققین اس کو بتلا دیں گے۔ کہ اس کے لئے کیا شرط ہے اور کیا ضابطہ ہے۔

طرز دعوت

چنانچہ امر بالمعروف کی ایک قسم اصول کی تبلیغ کرنا ہے۔ اس کے الگ آداب ہیں۔ ایک فروع کی تبلیغ کرنا ہے۔ اس کے الگ آداب ہیں۔ علماء سب پہلوؤں کو جانتے ہیں۔ ان کا علم تم سے زیادہ محیط ہے۔ پس اس کا طریق ان سے سیکھو۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ بس جیسے ہو کرلو۔ نہ کوئی ضابطہ نہ قاعدہ۔ جو ملا اس کو امر بالمعروف اندھا دھند کر دیا۔ گویا ایک لٹھ سا مار دیا۔ مثلاً کوئی کافر ملا۔ اس سے کہا ابے! تو مسلمان ہو جا، اس نے جواب میں کہا ابے! تو کافر ہو جا۔ بس اب کیا تھا لٹھ چل پڑا۔ صاحبو! یہ کوئی معمولی کام نہیں بہت نازک کام ہے۔ اس کے واسطے بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ان میں اس کے آداب مذکور ہیں۔ یہ بھی ایک مستقل فن ہے۔ اس کو سیکھ کر پھر عمل شروع کرو۔ محقق علماء سے کام کرنے کا طریقہ سیکھو، اپنی

رائے سے کچھ نہ کرو۔ اپنی رائے کا شریعت میں کچھ اعتبار نہیں۔ بلکہ اہل علم کو بھی چاہیے کہ جو کام کریں۔ اپنے سے زیادہ عالم سے پوچھ کر کریں۔ بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں۔ کہ بڑوں کو بھی چاہیے کہ چھوٹوں سے مشورہ کرلیا کریں، (مشورہ کا لفظ میں نے ادب کیلئے استعمال کیا ہے) اگر چہ بڑوں کو اکثر چھوٹوں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر کبھی چھوٹے کو کوئی بات ایسی معلوم ہوتی ہے جو بڑے کو نہیں ہوتی، گو غالب ایسا نہیں ہوتا۔ اکثر تو بڑوں ہی کو زیادہ معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی مشورہ کر لینا چاہیے۔ اگر چہ ان کا علم زیادہ نہیں لیکن ممکن ہے کہ ان کو کوئی خاص مصلحت معلوم ہو، کوئی واقعہ معلوم ہو، بلکہ بکثرت واقع ہے۔ کہ واقعات چھوٹوں کو زیادہ معلوم ہوتے ہیں، بڑوں کو معلوم نہیں ہوتے اور واقعات کی لاعلمی سے ان کے کمال میں کوئی نقصان نہیں آتا۔ دیکھئے ہدہد جیسا کوئی جانور چھوٹا نہیں اور سلیمان علیہ السلام جیسا کوئی بڑا آدمی نہیں۔ مگر پھر ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہتے ہیں:

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَ جِئْتُکَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ. (کہنے لگا کہ میں ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں اور اجمالی بیان اس کا یہ ہے کہ میں آپ کے پاس قبیلہ سبا کے ایک ملک کی خبر لایا ہوں)

کہ میں سبا سے ایک خبر لایا ہوں جس کو آپ نہیں جانتے ہیں۔ اس پر سلیمان علیہ السلام نہیں نکیر نہیں کیا اور نہ اللہ تعالیٰ نے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو اہتمام کے ساتھ اس قصہ کو بیان فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ بڑوں کو کسی واقعہ سے لاعلمی ہونا یہ نقصان فی الکمال نہیں۔ کیونکہ واقعات امور غیر مقصود ہوتے ہیں۔ ہاں امور مقصودہ یعنی احکام کا علم بڑوں کو زیادہ ہوتا ہے اور اس میں ایک بات اور ہے وہ یہ کہ چاہے چھوٹے کے پاس کچھ علم نہ ہو۔ مگر مشورہ سے کم از کم اتنا فائدہ ہوگا کہ اس سے مزید اطمینان ہو جاوے گا۔ صاحبو! جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ لینے کیلئے مامور بہ ہیں۔ و شاور ھم فی الامر۔ (اور (اہم) امر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مشورہ کریں) تو ہم کو تو ضرور مشورہ لینا چاہیے۔ یہ سنت نبوی ہے اور ہمارے اکابر کا بھی یہی طرز تھا۔ وجہ یہ کہ مشورہ کرنے سے خواہ وہ چھوٹوں ہی سے ہو۔ بعض دفعہ کوئی کام کی بات نکل آتی ہے اور جب بڑے کو چھوٹے سے مشورہ کرنے کا حکم ہے تو چھوٹے کو بطریق اولیٰ

بڑوں سے پوچھنا چاہیے، پھر جس طرح اپنے اکابر اپنے مقتداء حکم دیں اس طرح کر لے۔ یہ طریقہ ہے کام کرنے کا۔ امر بالمعروف کے یہ معنی کہ بس جو کافر ملے، ہاتھ پکڑ کے اسے مسلمان بنانا شروع کر دے، بعض دفعہ یہ طرز مضر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا ڈھنگ اور طرز سیکھنا چاہیے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ قید لگائی ہے۔

ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ (اپنے پروردگار کے راستے کی طرف یعنی حکمت سے بلایئے۔ معلوم ہوا کہ اس میں حکمت کی ضرورت ہے۔ ورنہ مطلق فرماتے بالحکمۃ نہ فرماتے۔ بہر حال اس کے شرائط ضرور ہیں مگر وہ اسی کے لئے ہیں۔ جو کام کرنے کا قصد کرے، اب تو دیکھا جاتا ہے کہ لوگ قصد ہی نہیں کرتے اور عوام تو عوام خواص کو بھی ادھر توجہ نہیں۔

دعوت اور منازعت

اور خواص میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو مشائخ نہیں، ان کی تو کیا شکایت، کیونکہ عوام ان کے زیادہ معتقد نہیں ہوتے۔ ان میں جو مشائخ ہیں وہ مقتدائے وقت مانے جاتے ہیں۔ جن کے بہت لوگ معتقد ہیں۔ سب سے زیادہ کوتاہی انہی میں ہے وہ بس اسی کو کافی سمجھتے ہیں کہ ہاتھ میں تسبیح لے کر بیٹھ جاویں۔ جنت میں پہنچ جاویں گے۔ ان کو کسی کی اصلاح کی کچھ پرواہ نہیں۔ بلکہ اس کو تو شانِ مشیخت سے اس قدر بعید سمجھتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شیخ اس کام کو شروع کرے تو اس کو مشیخت کے دفتر سے خارج کر کے محض علماء کے دفتر میں داخل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ میں ایک دفعہ الہ آباد گیا تھا۔ والد صاحب کی بیمار پرسی کے لئے وہاں ایک درویش تھے۔ والد صاحب مجھے ان کے پاس لے گئے۔ جب درویش نے مجھے دیکھا۔ تو مجھ سے کہا۔ کہ اس آیت کا مطلب بتلاؤ۔

لِکُلِّ اُمَّۃٍ جَعَلْنَا مَنْسَکاً ھُمْ نَاسِکُوْہُ فَلَا یُنَازِعُنَّکَ فِی الْاَمْرِ.

میں نے ترجمہ کر دیا۔ تو کہنے لگے۔ دیکھو! حق تعالیٰ منع کرتا ہے منازعت سے۔ پھر ہم کسی کو روک ٹوک کیوں کریں۔

موسےٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود

(موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والا اپنا دین اختیار کرے اور عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والا اپنا دین اختیار کرے)

جو جس کے جی میں آوے کرے۔ ہمیں کسی سے تعرض کرنے کی ضرورت کیا پڑی۔ یہ تفسیر کی انہوں نے۔ اس وقت میرے ذہن میں کوئی تفسیر حاضر نہیں تھی۔ میں نے لفظوں ہی سے ان کو جواب دیا۔ میں نے کہا۔ حق تعالیٰ نے **لا ینازعنک** فرمایا ہے کہ وہ آپ سے منازعت نہ کریں **لا تنازعھم** نہیں فرمایا کہ آپ بھی ان کو روک ٹوک نہ کریں۔ بلکہ آپ کے لئے تو خود اس کے متصل ہی امر فرماتے ہیں:

وادع الٰی ربک انک لعلٰی ھدی مستقیم (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف بلائیے بے شک آپ صراط مستقیم پر ہیں)

"یعنی دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو باطل پرست تھے، حق سے ہٹے ہوئے تھے اور ایک وہ جو صراط مستقیم پر تھے۔"

تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اہل باطل کو اہل حق سے منازعت کرنے کی اجازت نہیں۔ پس حاصل آیت کا یہ ہے کہ آپ صراط مستقیم پر ہیں، آپ کو تو حق ہے۔ منازعت صوری یعنی دعوت کا۔ مگر ان کو حق نہیں کہ آپ سے منازعت کریں۔ میں نے کہا اس جگہ حضور کو تو عدم منازعت کا حکم نہیں۔ بلکہ ان کو حکم ہے کہ آپ سے منازعت نہ کریں۔ پس شاہ صاحب کا ذرا سا منہ نکل آیا اور ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ والد صاحب بھی میرے جواب سے بہت خوش ہوئے۔ پھر اکی لطیف لطیف تفسیریں بھی نظر سے گزریں۔ لیکن یہ تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ مگر یہ مطلب کسی نص کا معارض بھی نہیں۔

اور بعض نے جو اس آیت کی تفسیر میں **لا ینازعنک** کا مطلب **لا تنازعھم** لکھ دیا ہے کہ آپ ان سے منازعت نہ کریں۔ یقیناً شاہ صاحب کی اس تفسیر پر نظر نہ تھی۔ ورنہ وہ ضرور اس کو پیش کرتے۔ مگر میں اس وقت یہ جواب دیتا۔ کہ منازعت اور ہے۔ دعوت اور ہے۔ اگر منازعت حقیقیہ سے ممانعت ہے۔ دعوت سے تو ممانعت نہیں۔ پس تم منازعت نہ کرو۔ محض دعوت ہی کر دیا کرو۔

صلح کل

مگر غضب تو یہ ہے کہ آج کل تو درویش کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ بس کچھ نہ کرے اور کسی کو

کچھ نہ کہے۔ بلکہ سب کے ساتھ صلح کل ہو کر رہے۔ وہ تو درویشی ہے ورنہ نہیں اور اس کیلئے ایک شعر گھڑا ہے اور اس کو حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس لئے کہ اس کے اول میں حافظا آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملا لیا جائے کہ جس شعر میں حافظ آ جائے بس وہ حافظ شیرازی ہی کا ہے۔ مگر یہ محض مہمل دلیل ہے کیا کوئی دوسرا شخص اپنا تخلص حافظ نہیں کر سکتا۔ یا اپنا شعر رائج کرنے کو جعلی طور پر حافظ کا لفظ اپنے شعر میں نہیں بڑھا سکتا۔

پس ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ یہ شعر اول تو حافظ کا ہے نہیں اور اگر ہوتا بھی، تو چونکہ ہم کو ان سے حسن ظن ہے۔ ہم اس کی تاویل کرتے۔ ہاں جو خشک دماغ ہے وہ تو تاویل نہیں کرے گا بلکہ حافظ پر طعن کرنے لگے گا۔ مگر ہم ایسے بے ادب نہیں۔ پس یہی قاعدہ غلط ہے کہ جس شعر میں لفظ حافظ ہو۔ اس کو حافظ شیرازی کی طرف منسوب کیا جائے۔ اسی طرح جو کلام مثنوی کے وزن پر ہو تو اس کو مولانا روم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

اب سنئے کہ انہوں نے کون سا شعر گھڑا ہے اور اس کو حافظ کی طرف منسوب کیا۔ حالانکہ وہ حافظ شیرازی کا شعر کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

وہ شعر یہ ہے:

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام!

(اے حافظ اگر وصل چاہتے ہو تو ہر خاص و عام سے صلح رکھو، مسلمان کے ساتھ اللہ اللہ اور برہمن کے ساتھ رام رام)

بھلا جس کو ذرا بھی حافظ کی بلاغت و فصاحت کا ذوق ہے وہ تسلیم کر سکتا ہے کہ یہ ان کا کلام ہے۔ ہرگز نہیں۔ دوسرے حافظ شیرازی رام رام جانتے بھی نہ تھے۔ انہوں نے تو عمر بھر کبھی سنا بھی نہ ہوگا اور بڑی بات یہ ہے کہ حافظ کا دیوان موجود ہے اس میں دیکھ لو اور تماشا یہ کیا کہ باوجود یہ کہ دیوان کے اندر تحریفیں بہت ہوئی ہیں مگر یہ شعر تحریف کے بعد بھی اس میں موجود نہیں۔ پس یہ شعر دیوان حافظ کا تو ہے نہیں۔ ہاں کسی دیوانہ حافظ کا ہوگا۔

عرفی تصوف

ایک اور شعر بھی ہے جس سے آج کل کے صوفی اپنے مسلک صلح کل پر استدلال

کرتے ہیں اور وہ واقعی حافظ کا ہے:

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن　　　　که در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

(کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ اور جو جی چاہے کرو، کہ ہماری شریعت میں اس کے سوا اور کوئی گناہ نہیں ہے)

اس کو بھی صوفیوں نے اپنا مستدل ٹھہرایا ہے کہ بس کسی کو آزار نہ دینا چاہیے۔ دل دکھانا اچھا نہیں۔ پھر کیوں کسی کو امر بالمعروف کیا۔ میں کہتا ہوں کیا ایک متکبر کا دل دکھانا بھی منع ہے۔ اگر اس شعر میں ہر آزار کی ممانعت ہے۔ تو پھر ہر چہ خواہی کن کی بھی عام اجازت ہونی چاہیے۔ پھر کیا ہے، بس زنا کی بھی اجازت ہونی چاہیے، چوری کی بھی اور غصب، لوٹ مار اور ڈاکہ کی بھی پس جو چاہو کرو۔ سب کی اجازت ہے۔

اگر کہو کہ چوری سے تو آزار ہوتا ہے۔ لہذا وہ آزار کی ممانعت میں داخل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ زنا میں تو آزار نہیں۔ شاید کہو کہ شوہر اور خاندان کو آزار ہے۔ تو اگر کسی کو کوئی عورت ایسی مل جاوے کہ نہ اس کا خاوند ہے۔ نہ باپ ہے۔ نہ بھائی، کوئی نہیں ہے اور وہ خوشی سے یہ فعل کراتی ہے تو یہاں کسی کو آزار نہیں ہے۔ نہ اس کو نہ اور کسی کو۔ تو کیا اس کو اجازت ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں۔ تو پھر اس میں تخصیص کرو گے اور تخصیص کسی دلیل سے کرو گے یا بے دلیل۔ جیسے بھی ہو اگر تم ہر چہ خواہی کن میں تخصیص کرتے ہو تو ہم یہاں (یعنی آزار میں) بھی تخصیص کریں گے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ کسی کو آزار نہ دو اور در حقیقت در پے آزار ہونا یہی ہے اور جو شخص آزار بغرض اصلاح دے۔ جیسے طبیب اور ڈاکٹر آپریشن کرتا ہے۔ یا باپ، استاد، بچہ کو تادیباً مارتا ہے۔ اس کو ہرگز در پے آزار شدن نہیں کہہ سکتے۔ پھر امر بالمعروف کرنے والے سے اگر کسی کو آزار پہنچے بھی تو اس کو در پے آزار کہنا صحیح نہیں۔ لہذا وہ اس شعر کا مصداق ہی نہیں۔ پس امر بالمعروف سے رکنے کے واسطے اس شعر کو آڑ بنانا محض باطل ہے۔ دوسرے یہ کہ مباش در پے آزار میں اگر آزار ایسا ہی عام ہے تو پھر اس میں مخاطب ہی کی کیا خصوصیت ہے کہ صرف مخاطب ہی کو آزار نہ پہنچایا جاوے۔ غائب کو آزار پہنچ جاوے۔ سبحان اللہ! بلکہ اس کو بھی عام کہو۔ کہ صاحب آزار کوئی ہو، آزار میں تعمیم کر کے صاحب

آزار میں کیوں تخصیص کی جاتی ہے۔ بلکہ جیسے آزار میں تعمیم کرتے ہو، صاحب آزار میں بھی تعمیم کرو۔ اگر صاحب آزار میں بھی تعمیم کرو گے۔ تو پھر کوئی بھی معصیت ایسی نہ ہوگی۔ جس سے کسی نہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔ ایسا کوئی امر نہ نکلے گا۔ جو کسی نہ کسی کے لئے سبب آزار نہ ہو۔

شاید آپ سوچتے ہوں گے کہ ہمارے گناہوں سے کس کو آزار پہنچتا ہے تو آپ ایک حکایت سے اس کا اندازہ کر لیجئے۔ مرزا بیدل شاعر کی شکایت کی حکایت ہے۔ کہ ان کے اشعار تصوف کا رنگ لئے ہوئے ہوتے تھے۔ کسی ایرانی نے ان کے اشعار کو دیکھ کر پسند کیا اور ان کو بزرگ سمجھ کر ان کے پاس آیا جب ان کے پاس پہنچا تو یہ حجام سے داڑھی منڈا رہے تھے۔ اس کو یہ دیکھ کر غصہ آ گیا اور جھلا کر اس نے پوچھا آغا ریش می تراشی۔ (آغا صاحب ڈاڑھی منڈا رہے ہو)

شاعر نے جواب دیا۔

''آرے ریش می تراشم ولے دلے کسی نمی خراشم''

(جی ہاں ڈاڑھی منڈا رہا ہوں لیکن کسی کا دل نہیں دکھا رہا)

وہ بے چارہ مخلص تھا۔ اس نے آزادانہ جواب دیا'' آرے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می خراشی'' (جی ہاں تم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھا رہے ہو) مخلص تو درپے مصلحت کے نہیں ہوتا۔ اس کی بڑی مصلحت تو یہ ہے:

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار | بگذارند و خم طرہ یارے گیرند!

(میں بڑی مصلحت یہ دیکھتا ہوں کہ دوست، سب کام کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے)

شاعر نے تصوف مزعوم کے اعتبار سے اور اسی عرفی تصوف کے طور پر جواب دیا تھا۔ کہ دل کسے نمی خراشم۔

''ایرانی نے جواب دیا کہ ظالم تو تو سب سے بڑے دل کو چھیل رہا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ دل کسی نمی خراشم بلے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می خراشی'' تم یہ داڑھی پر استرہ نہیں پھرا رہے ہو۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر چھری چلا رہے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب اعمال پیش ہوتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوتا ہے کہ میری امت کا ایک شخص یہ

حرکت کرتا ہے۔ کیا اس سے آپ کا دل نہیں دکھتا اور کیا آپ کا دل دکھانا چھوٹی بات ہے۔ آپ کا قلب تو سید القلوب ہے۔ جب تم سید القلوب کو تکلیف دیتے ہو۔ پھر یہ دعوے کیسے کرتے ہو کہ ہم کسی کا دل نہیں دکھاتے ہیں۔ ارے تم درپے آزار تو ہوگئے۔ یہ سن کر مرزا کی آنکھ کھلی اور چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آیا تو توبہ کی اور بزبان حال یا قال یہ کہتا تھا۔

جزاک اللہ کہ چشم باز کردی — مرا با جان جاں ہمراز کردی

(اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے محبوب حقیقی سے ہمراز کر دیا)

''یعنی میں تو اندھا تھا۔ میری کبھی ادھر نظر ہی نہیں گئی۔ کہ مجھ سے اتنے بڑے قلب کو ایذا ہو رہی ہے۔ یہاں تک میرے ذہن کی رسائی ہی نہیں ہوئی۔ تو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ خدا تجھ کو اس کی جزا دے۔

اب اس حکایت سے سمجھ لیجئے کہ جب آپ سے کوئی امر غیر مشروع سرزد ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے آزار ہوگا یا نہیں؟ اس لئے ترک احکام شرعیہ کے لئے اس کو آڑ بنانا اور یہ کہنا کہ:

مباش درپے آزار — و ہرچہ خواہی کن

(کسی کو تکلیف نہ دو اور جو جی چاہے کرو)

بالکل واہیات ہے۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ سنار کی کھٹ کھٹ، لوہار کی ایک۔ ہم تمہیں ہر ہر بات کا کہاں تک جواب دیں، تم نے ایک بات نکالی۔ ہم نے اس کا جواب دیا، دوسری نکالی اس کا دیا۔ آخر یہ سلسلہ کہاں تک رہے گا، سیدھا جواب یہ ہے کہ نصوص کے مقابلہ میں سب اشعار ہیچ ہیں۔ پس ہم تو جانتے ہیں کہ یہ خدا رسول کا حکم ہے۔ اس کے سامنے کہاں کی مصلحت کہاں کی حکمت۔ نصوص کے اندر امر بالمعروف کا حکم موجود ہے اور نہ کرنے پر نکیر ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں بس اس کو کرو۔ البتہ شرائط و احکام کے ساتھ کرو۔ اندھا دھند لسٹم پسٹم مت کرو۔ فقہاء نے اس کی ایک مستقل بحث لکھ دی ہے۔ اس کے قوانین وضوابط کو مدون کر دیا ہے۔ اس کو سیکھو، علماء سے پوچھو۔ وہ تم کو راستہ بتا دیں گے۔ اور اس قسم کے اشعار سے نصوص کا مقابلہ نہ کرو۔

حاکمانہ جواب

اور جو کوئی جاہل نصوص کا مقابلہ ان اشعار سے کرے۔ اس کو ڈانٹ دینا چاہیے۔

حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنین کی دیت میں غرہ عبد یا امۃ کا حکم دیا تھا۔ مدعا علیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کے سامنے یہ کہا:

کیف اعزم من لا شرب ولا اکل ولا نطق ولا استھل ومثل ذلک بطل

یعنی ایسے بچہ کی کیا دیت جس نے نہ کھایا نہ پیا اور نہ بولا نہ چلایا اور ایسا معاملہ تو یونہی نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ **اسجع کسجع الکھان (الصحیح لمسلم' قسامۃ :۳۷' سنن النسائی ۸: ۵۲' بلفظ: " لسجع کسجع الأعراب")۔**

کیا واہیات ہے کاہنوں جیسی مسجع مقفی عبارت سے شریعت کا مقابلہ کرتے ہو۔ غرض حضور نے اس کو ڈانٹ دیا۔ تو بعض جگہ اس کی بھی ضرورت ہے۔ کہیں حاکمانہ جواب مناسب ہوتا ہے اور کہیں حکیمانہ۔ سب کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جاتا۔ عوام اسی سے بگڑ گئے۔ علماء کے حکیمانہ جواب ہی سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا۔ حتی کہ اب ہر بات کی علل واسرار پوچھنے کی جرأت ہوگئی۔ ایک شخص نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ حائض سے نماز تو ساقط ہوگئی اور روزہ کی قضا لازم۔ جواب دیا کہ وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کرو گے تو اتنے جوتے سر پر پڑیں گے۔ سر پر بال بھی نہ رہیں گے۔ اس جواب کی یہ وجہ نہ تھی۔ کہ مولانا کو حکمت معلوم نہ تھی۔ بلکہ اس کے لئے یہی جواب مناسب تھا۔ کیوں کہ ما بہ الفرق سمجھنے کی لیاقت اس میں نہیں تھی۔ چنانچہ اسی سوال کو دوسرے ایک فہیم نے دوسری ایک مجلس میں پوچھا۔ تو آپ نے اس کو مفصلاً بیان کر دیا۔ تو ہر مخاطب کا مذاق جدا ہے۔ ہر ایک کی حالت جدی ہے۔ اس کے رتبے کے موافق جواب دینا چاہیے۔

میرے پاس ایک سب انسپکٹر کا خط آیا۔ کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے۔ وہ اس کی علت دریافت کرنا چاہتے تھے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے۔ پھر انہوں نے لکھا کہ علماء کو ایسا خشک نہ ہونا چاہیے۔ میں نے دل میں جواب دیا

کہ جہلاء کو اتنا تر نہ ہونا چاہیے کہ ڈوب ہی جاویں۔ اس کے بعد وہ ایک جگہ سے ملے اور اپنا پورا پتہ بتلایا کہ میں وہی ہوں۔ جس کا ایسا ایسا خط گیا تھا اور تم نے یہ جواب دیا تھا۔ جب سارا قصہ بیان کیا۔ تو میں نے پہچان لیا اور کہا ماشاء اللہ آپ سے تو بڑا پرانا یارانہ ہے۔ پھر مجھ سے انہوں نے کہا کہ آپ نے یہ خشک جواب کیوں دیا تھا۔ میں نے کہا کہ انصاف سے بتلایئے۔ آپ سب انسپکٹر ہیں۔ مگر پھر بھی آپ کے تعلقات و معاملات سب کے ساتھ یکساں ہیں۔ یا کسی سے خصوصیت ہے اور کسی سے نہیں ہے۔ کیا آپ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ہیں یا مخصوص کے ساتھ خصوصیت کے برتاؤ سے پیش آتے ہیں اور غیر مخصوصین کے ساتھ ضابطہ کے برتاؤ سے۔ کہا سب سے یکساں برتاؤ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرق ضرور ہے۔ میں نے کہا، ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہے، جن سے خصوصیت ہے ان سے خصوصیت کا برتاؤ ہے اور جن سے نہیں ہے ان سے ضابطہ کا، مگر اب سے ایسا برتاؤ آپ کے ساتھ نہیں کیا جاوے گا، کیونکہ اب تعارف ہو گیا ہے، پھر میں نے یہ خیال کیا کہ ذرا ان کو بھی تو باندھنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ دل کھول کر ہر بات کے حکم اور علل پوچھنے لگیں۔ تو میں نے کہا اس ملاقات کا جیسا مجھ پر اثر ہوا ہے کہ میں آئندہ ایسا برتاؤ نہیں کروں گا۔ ایسا ہی اس کا آپ پر بھی یہ اثر ہو گا کہ آپ بھی آئندہ ایسی اینڈی بینڈی باتیں نہ پوچھیں گے۔

ایسا ہی ایک اور شخص کا خط میرے پاس آیا، کہ فلاں حکم میں کیا حکمت ہے۔ میں نے لکھا کہ سوال عن الحکمت میں کیا حکمت ہے۔ خدا کے حکم کی حکمت تو ممکن ہے بندہ کو معلوم نہ ہو۔ مگر سوال تو تمہارا فعل ہے، تم کو اپنے فعل کی حکمت ضرور ہی معلوم ہے۔ مہربانی کر کے ذرا بتلاؤ تو سہی۔ میں نے یہ خیال کیا تھا۔ کہ اگر وہ سوال عن الحکمت کی کچھ حکمت بتلا دیں گے تو میں اس کو باطل کر دوں گا۔ غرض کبھی اس قسم کے بھی جواب دینا چاہئیں۔ علماء نے عوام کا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔ نرم جواب دے کر۔

ایک اور شخص نے ایک سوال کیا تھا۔ میں نے کہا، اس کا جواب تمہاری سمجھ میں نہیں آوے گا، تو کہتے ہیں کہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے آپ کہیئے۔ میں نے کہا، میرا دماغ مفت کا نہیں۔ مگر وہ بڑا ہی ہٹی تھا۔ کسی طرح ٹلا ہی نہیں۔ جب بہت ہی تنگ کیا۔ تو میں نے کہا کہ ایک طالب علم کو بلا

لو۔ میں اس کے سامنے تقریر کردوں گا۔ اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم علماء کے متعلق جو آپ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لوگ ایسے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے۔ اس کا غلط ہونا معلوم ہوجاوے گا۔ گو ہم کسی مصلحت سے جواب نہ دیں اور میں نے یہ شعر پڑھا:

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ تو مجلس عارفین میں کوئی چیز ایسی نہیں جو نہ ہو)

یعنی یہ سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر نااہل ناجنس پر ظاہر نہیں کرتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تم دیکھ لوگے۔ کہ تم اس تقریر کو نہیں سمجھ سکتے اور جب نہیں سمجھ سکتے تو تم سے خطاب کرنا موت ہے۔ میری زبان ہی نہیں چلے گی۔ کیونکہ:

فہم سخن تا نہ کند مستمع قوت طبع از متکلم مجو

(جب تک سننے والا کلام کا سمجھنے والا نہیں ہوتا بولنے والے کی قوت گویائی کو تلاش مت کر)

اگر جہلاء کو اس طرح حاکمانہ جواب دیا جاوے تو ان کی جرأت نہ بڑھے گی۔

میں ایک دفعہ سہارن پور گیا تو ایک شخص نے وہاں بہشتی زیور کا ایک باریک مسئلہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے پوچھا تھا۔ مولانا نے اپنے حسن اخلاق سے اس کو سمجھا دیا تھا۔ مگر وہی مرغے کی ایک ٹانگ ان کی سمجھ میں کہاں آنا تھا۔ کیونکہ سمجھنا مطلوب ہی نہ تھا۔ جب میں گیا تو وہ سمجھے کہ یہ تو مؤلف ہی آ گیا، ان سے پوچھنا چاہیے، چنانچہ میرے پاس بھی آئے، پہلے آن کے تو زور سے کہا السلام علیکم، اسلام ہی سے خشونت اور اکھڑ پن ٹپکتا تھا۔ پھر کہنے لگے کہ یہ عبارت ہے بہشتی زیور کی۔ ذرا اس کو دیکھ لیجئے۔ میں نے کہا کہ میں نے تو سب دیکھ ہی کے لکھا ہے۔ آپ کہیئے کیا کہنا ہے۔ کہا یہ سمجھ میں نہیں آیا، میں نے کہا مطلب نہیں سمجھے یا علت نہیں سمجھے۔ مطلب تو ظاہر ہے، اردو میں سہل کر کے لکھا گیا ہے۔ کہا جی علت نہیں سمجھا۔ کہ اس کی علت کیا ہے۔ میں نے کہا، آپ کو کچھ اور بھی مسائل یاد ہیں۔ کہا جی ہاں بہت سے۔ میں نے کہا کہ کیا ان سب کی علت کو آپ نے معلوم کرلیا ہے۔ یا بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی علت اور حکمت معلوم نہیں۔ اگر سب کی علت معلوم ہوچکی۔ تو مجھے اجازت دیجئے کہ دو چار کی میں بھی علت دریافت کرلوں۔ کہا ہاں! غیر معلوم العلت بھی بہت سے ہیں۔

میں نے کہا، پھر اسے بھی اسی فہرست میں داخل کر لیجئے۔ اس جواب سے وہ ناراض تو بہت ہوئے۔ مگر بولے کچھ نہیں۔ پس کتاب بغل میں دبا جلدی سے اٹھ گئے۔

مولانا نے فرمایا۔ کہ تم نے تو بڑی جلدی ساکت کر دیا۔ میں نے کہا، حضرت میں آپ کی طرح خلیق نہیں۔ کہ ایک کوڑھ مغز کے ساتھ چار گھنٹے مغز ماروں۔ اخیر میں بزاخفش کی طرح وہ کہے۔ کہ میں نہیں سمجھا اور پھر میں تقریر کروں۔ قصہ بزاخفش کا طالب علموں میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے بکرے سے سبق کا تکرار کیا کرتے۔ تقریر ختم کرنے کے بعد اس سے پوچھتے۔ کہ سمجھا اور اس کو یہ تعلیم کر رکھا تھا کہ وہ نفی کے طور پر سر ہلا دیتا ہے۔ یہ پھر تقریر شروع کرتے۔ ایسے ہی مکرر سہ کرر تقریر کرتے۔ تو مجھ سے اخفش نہیں بنا جاتا۔

اس کے بعد اور ایک جنٹلمین صاحب آئے۔ وہ بھی اسی علت میں مبتلا تھے۔ مہذب عنوان سے کہنے لگے۔ کہ حضرت جب لوگ علماء کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو ہم کو برا معلوم ہوتا ہے۔ بہت رنج ہوتا ہے چنانچہ اس مسئلہ میں جہلاء اعتراض کرتے ہیں، جو ناگوار ہوتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں۔ تو میں ایک چھوٹا سا جلسہ جمع کروں۔ آپ اس میں ان چند مسائل کی تقریر کر دیں۔ میں نے کہا، میں آپ کی محبت کا نہایت ممنون ہوں۔ مگر عقلی قاعدہ ہے کہ الاہم فالاہم، جو کام سب سے اہم ہو۔ پہلے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ آپ کو مسلم ہے یا نہیں۔ کہا ضرور مسلم ہے۔ کیونکہ یہ مقدمہ تو عقل کے موافق تھا۔ اس کو بغیر تسلیم کئے تو چارہ ہی نہیں تھا۔ ان لوگوں کے عقلیات سارے مسلم ہیں، بس نقلیات ہی میں کلام ہے۔ میں نے کہا جو لوگ علماء کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر ایک طبقہ وہ ہے جو ائمہ مجتہدین کی شان میں گستاخی کرتا ہے وہ ان سے بھی گستاخ تر ہے۔ ان سے بڑھ کر ایک وہ فرقہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ اور سب سے بدتر وہ گروہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب وشتم کرتا ہے۔ تو ترتیب سے کام کرنا چاہیے۔ آپ اول ان لوگوں کی اصلاح کا انتظام کر دیجئے۔ جو اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ پھر ان کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کرتے ہیں پھر ان کی جو صحابہ رضی اللہ عنھم کو نہیں چھوڑتے۔ پھر ان کی جو آئمہ کو برا بھلا کہتے ہیں جب ان سب کا انتظام ہو جاوے گا۔ آخر میں یہ جماعت علماء کی شان میں گستاخی کرنے والی رہیگی۔ اس کا انتظام میں کر دوں

گا، اب وہ چپ، کیا جواب دیں، جب دیکھا کہ اس طرح کام نہ چلا تو گفتگو کا طرز بدلا اور کہا یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ اس وقت ان کی اصلاح کی ضرورت تو نہیں لیکن اگر کر دی جائے تو ضرر ہی کیا ہے۔ میں نے کہا کچھ ضرر نہیں، کہنے لگے، پھر ایسا کر دیجئے۔ میں نے کہا یہ مشورہ ہے یا حکم ہے۔ اگر حکم ہے تو آپ کو حکومت کا کوئی حق نہیں۔ میں آپ کا کوئی محکوم نہیں۔ نوکر نہیں، آپ کا شاگرد نہیں۔ مرید نہیں اور اگر مشورہ ہے تو مشورہ میں مخاطب کے ماننے کا انتظار نہیں ہوتا۔ آپ اپنے فرض منصبی سے فارغ ہو چکے۔ آگے ہمارا کام ہے۔ ہماری جو سمجھ میں آوے گا کریں گے۔ آپ کی کچہری کا وقت آ گیا ہے۔ تشریف لے جایئے۔ غرض یہ بھی چلے گئے، تمام دن یہی قصہ رہا۔ مگر میں نے کسی کو ایک منٹ میں ختم کیا۔ کسی کو دو منٹ میں اور پہلے ایک ہی آدمی نے کئی دن سے اکابر کو تنگ کر رکھا تھا۔ غرض یہ کہ ہر سائل کے ساتھ نہ تو مطلقاً خشکی برتے اور نہ ہر جگہ خلیق بنے۔ اصلاح اسی طرح ہوتی ہے۔ اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ اول تو حقیقت ظاہر کر دو اور اگر نہ سمجھے تو آخر میں کہہ دو کہ بس جاؤ یہ خدا کا حکم ہے۔ خدا کے حکم کے مقابلہ میں ہم تمہاری واہیات خرافات کو نہیں مانتے ہیں۔

اسی کے مناسب ایک اور حکایت ہے۔ کہ مولانا محمد یعقوب صاحب ایک بار ایک دعوت کے جلسہ میں رڑکی تشریف رکھتے تھے۔ اس جلسہ میں ایک عالی صوفی صاحب سماع جواز سماع کے دلائل بیان کر رہے تھے۔ مولانا کی وضع سادی تھی۔ اس لئے وضع سے کسی نے یہ نہیں پہچانا۔ کہ یہ کوئی عالم یا بزرگ ہیں۔ اس صوفی نے دلیل جواز سماع میں مولانا رومی رحمۃ اللہ کا یہ شعر پیش کیا:

بشنو از نے چوں حکایت می کنند   وز جدائی ہا شکایت می کنند

(بانسری سے سن ایک حکایت بیان کرتی ہے اور جدائیوں کی شکایت کرتی ہے)

اور کہا کہ اس میں بشنو امر ہے اور امر وجوب کے لئے ہے۔ اس کا حقیقی جواب تو یہ تھا کہ بے شک امر سے وجوب ثابت ہوتا ہے مگر کس کے امر سے۔ مولانا کے امر سے یا اللہ تعالیٰ کے امر سے، مگر یہ جہلاء لوگ تو اس کو کچھ نہ سمجھتے بس ان کو تو اڑتی ہوئی ایک بات ہاتھ لگ گئی کہ امر وجوب کیلئے ہے۔ وہ جہلاء ان باتوں کو کیا جانیں۔ کہ امر کے اقسام کتنے ہیں۔ اس لئے مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا۔ کہ مولانا رومی کا قول جب حجت ہو۔ کہ پہلے خود ان کا حجت ہونا ثابت کیا جاوے۔ سو سب سے پہلے تو تم ان کا مسلمان ہونا ثابت کرو۔ بس اس جواب سے ان

پر تو مٹی پڑ گئی اور سارے دلائل گائے خورد ہو گئے۔ غرض ہر جگہ جواب کا مختلف طریقہ ہے۔ کہیں نرمی کا جواب اچھا ہے۔ کہیں سختی کا اور کہیں جوتے کا جواب بہتر ہوتا ہے۔ مولا ناہی کا شعر ہے:

الوعظ ینفع لوبا لعلم والحکم　　　والسیف ابلغ وعاظ علی القَمَمِ

(وعظ نفع دیتا ہے اگر علم وحکمت سے معمور ہو لیکن تلوار سروں پر نصیحت گروں سے زیادہ بلیغ نصیحت ہے)

اور فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں چار کتابیں نازل فرمائی ہیں وہاں ایک پانچویں کتاب حدید بھی اتاری ہے۔ چنانچہ ارسال رسل و انزان کتب کے بعد ارشاد ہے۔ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ۔ (اور ہم نے لوہا نازل کیا اس میں بڑا خوف ہے) فرمایا کہ اس میں حدید سے مراد نعل دار جوتا ہے۔ کہ اس سے دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے۔ کہ یَعَظُ السِّنَانُ اَکْثَرُ مِمَّا یَعِظُ الْقُرْاٰنُ۔ یعنی بعض قرآن کی نصیحت اتنا نہیں روکتی۔ جتنا ایک نیزہ کی نوک روک دیتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اول دلائل بیان کرو۔ اگر ان دلائل کو نہ مانے تو صاف جواب دو۔ کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ احکام الٰہی کے سامنے کوئی چیز حجت نہیں۔ اس لئے یہ اشعار بھی کچھ حجت نہیں۔ غرض امر بالمعروف یقیناً واجب ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ اس طرف توجہ بالکل نہیں اور یہ ایک بڑی کوتاہی ہے۔ اسی کوتاہی کو رفع کرنے کے لئے یہ مضمون اختیار کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جاوے کہ نماز اور روزہ کی طرح یہ بھی فرض ہے۔

تدریس میں نیت تبلیغ

البتہ مختلف اوقات میں اس کے طرق مختلف ہیں۔ مثلاً اس وقت آپ لوگوں کا پڑھنا بھی تبلیغ ہے۔ اگر نیت اچھی ہے۔

"انما الاعمال بالنیات" (الصحیح للبخاری: ۱:۲، ۸:۱۷۵)

(بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے)

اگر آپ کی نیت میں یہ ہو کہ پڑھنے سے فارغ ہو کر امر بالمعروف کروں گا تو یہ پڑھنا بھی شعبہ تبلیغ ہی کا ہے۔ اگر یہ نیت نہ ہو تو پھر تبلیغ نہیں۔ دیکھو اگر کوئی شخص نماز کی نیت نہ کرے تو نماز نہیں ہوتی۔ ایسے ہی روزہ ہے۔ اگر نیت نہ کرے اور دن بھر فاقہ کرے۔ تو روزہ نہیں ہوتا۔ غضب کی بات ہے کہ ہم رات دن پڑھتے پڑھاتے ہیں مگر اعمال و طاعات کی نیت نہ کرنے کی وجہ سے ثواب سے محروم ہیں۔

غرض اچھی نیت سے اس وقت یہی کتابیں پڑھنا بے شک اصل تبلیغ ہے اور میں نے اس وقت کی قید اس لئے لگائی کہ پہلے زمانہ میں صحابہ و تابعین کو تدریس متعارف کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ ان کا تو بغیر اس کے کام چلتا تھا۔ کیونکہ حافظے اور اذہان کافی تھے اور تدین بھی تھا اور اس وقت اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ اگر کتابیں مدون نہ ہوں اور آج کل لوگوں کا نہ حافظہ ویسا ہے، نہ ویسا تدین ہے، نہ ان کے قول پر ان جیسا وثوق ہے پھر زبانی کوئی مضمون حدیث وفقہ کا بیان کیا جاتا۔ تو سامعین کو ہرگز تسلی نہ ہوتی اور خیال ہوتا کہ نہیں معلوم یہ کچھ کہتے ہیں، ٹھیک بھی ہے یا یوں ہی الٹ پلٹ ہانک رہے ہیں۔ اگر کتابیں مدون نہ ہوتیں تو بڑا اغلاط مبحث ہوتا۔ دین میں بڑا فساد پھیلتا۔ خدا کا بڑا احسان ہے۔ کہ اپنی عنایت و رحمت سے اس نے کتابیں مدون کرا دیں، مدرسے قائم کرا دیئے۔ اس کے سامان مہیا کر دیئے۔ منجملہ ان سامانوں کے ایک یہ ہے کہ مدرسہ کے لئے چندہ بھی کیا جاوے۔ مگر شرط یہ ہے کہ طیب خاطر سے ہو اور جب ان چیزوں کی ضرورت ثابت ہوگی کہ بغیر ان کے کام نہیں چلتا۔ چنانچہ اگر کتابیں نہ ہوں تو سلف کی باتیں ہم تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں اور بغیر مدارس قائم کیے تعلیم کتب ممکن نہیں لہذا یہ بدعت ہی نہیں ہے بلکہ سنت ہے کیونکہ اس درس و تدریس سے بھی مقصود تبلیغ ہی ہے خواہ بلا واسطہ یا بالواسطہ، چنانچہ تو تبلیغ مخاطب اول کو ہے، یعنی طلبہ کو اور بالواسطہ مخاطب ثانی کو۔ یعنی عوام کو۔ سو یہ درس و تدریس تبلیغ کا اتنا بڑا افرد ہے مگر ہم نیت تبلیغ نہ کرنے سے اس کے ثواب سے محروم ہیں۔ انما الاعمال بالنیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیت نہ کرنے سے اعمال کا ثواب نہیں ملتا۔ گو عمل متحقق ہو جاوے اور بعض اعمال تو بلا نیت متحقق ہی نہیں ہوتے۔ کیونکہ اعمال دو قسم کے ہیں۔ بعض اعمال تو ایسے

ہیں کہ ان کا تحقق بھی بلانیت نہیں ہوتا اور بعض ایسے ہیں۔ کہ ان کا تحقق تو ہو جاتا ہے مگر ثواب نہیں ملتا۔ جیسے پڑھنا اور پڑھانا کہ اسکا تحقق بلانیت بھی ہو جاتا ہے۔ مگر ثواب نہیں ملتا۔ بخلاف نماز روزہ کے۔ کہ ان کا تحقق ہی بلانیت نہیں ہوتا۔ چاہے یوں جہل سے کہہ لے کہ ہمارے یہاں تحقق نماز بدونیت بھی ہو جاتا ہے۔

جیسے کسی نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے دومیاں بی بی کے نکاح کے متعلق مسئلہ پوچھا۔ کہ ان کا یہ رشتہ ہے۔ ان میں نکاح ہو جاوے گا۔ یا نہیں۔ مولانا نے فرمایا نہیں ہوسکتا۔ تو وہ کیا کہتا ہے۔ کہ ہم نے تو کیا تھا ہو گیا تھا۔ اور جیسے ایک گنوار بے وضو نماز پڑھا کرتا تھا۔ کسی واعظ سے سنا کہ بلاوضو نماز نہیں ہوتی۔ تو وہ کہتا ہے کہ بارہا کردیم وشد۔ اسی طرح اس گنوار نے سمجھا کہ بس ایجاب وقبول ہو گیا تو نکاح ہو گیا۔ حالانکہ رفع موانع شرائط تحقق سے ہے مگر بعض اعمال بغیر نیت کے بھی ہو جاتے ہیں مگر اجر نہیں ہوتا۔ جیسے تعلیم وتعلم، سو ہم لوگوں کا کتنا بڑا حرمان ہے کہ چوبیس گھنٹہ ہم اس میں مشغول۔ مگر نیت نہ ہونے سے ثواب سے محروم۔

رہا یہ شبہ کہ اگر نیت بھی دین کی اور تبلیغ کی ہوتی۔ تب بھی ثواب نہ ملتا۔ کیونکہ اس کے ساتھ تنخواہ کی بھی تو نیت ہے اور یہ دنیا ہے۔ تو نیت تبلیغ کے بعد بھی ثواب کہاں ہوتا۔ کیونکہ خالص تبلیغ ہی کی تو نیت نہیں۔ بلکہ مدرسین کو تو تنخواہ بھی مطلوب ہے۔

جواب یہ ہے کہ اس میں تفصیل ہے۔ ایک تو وہ تنخواہ لینے والا ہے جس کو مقصود اصلی صرف نوکری اور تنخواہ سے ہے۔ ایک اور وہ جو تنخواہ نفقہ کے طور پر لیتا ہے۔ جیسے قاضی بیت المال سے تنخواہ لیتا ہے اور اصل مقصود اس کا خدمت دین ہے ان دونوں میں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ جس کو مقصود بالذات دنیا تھی۔ اس کو ثواب نہیں ملے گا۔ اور جس کو مقصود بالذات دین ہے مگر روپیہ گزر اوقات کے لئے لیتا ہے اس کو ثواب ملے گا۔ اگر یہ شبہ ہو کہ جب دین کے ساتھ دنیا کا بھی خیال ہے تو مجموعہ تو دنیا ہی ہوا۔ کیونکہ مرکب دین ودنیا سے دنیا ہے کیوں کہ نتیجہ تابع اخس کے ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ جس کو تنخواہ مدنظر نہیں، صرف گزر اوقات کے لئے لیتا ہے۔ اس کا مقصود تنخواہ کو کہا ہی نہ جاوے گا۔ خواہ بلاشرط ہو یا بالشرط۔ ورنہ قاضی، مفتی، بلکہ خلفاء راشدین کسی کو بھی ثواب نہ ملتا۔

اب اس کی علامت کیا ہے کہ اس شخص کو مقصود صرف دین ہے اور تنخواہ صرف رفع حاجت کیلئے۔ سواس کی علامت یہ ہے کہ جس کو تنخواہ ملتی ہے اس کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت تو یہ ہے کہ جتنی تنخواہ اس کو ملتی ہے وہ اس کے نان ونفقہ کو کافی نہیں۔ اس حالت میں تو دوسری کوئی بڑی نوکری تلاش کرنا اس کیلئے یہ علامت قصد دنیا کی نہیں۔ لیکن اگر وہ رفع حوائج کے لئے کافی ہے۔ معاش میں کوئی تنگی نہیں ہے اور پھر بھی اس کو بڑی ملازمت کی تلاش ہے۔ کہ اگر دوسری جگہ زیادہ تنخواہ ملے تو فوراً چلا جائے اور اس وقت محض ترقی ہی کی وجہ سے جاتا ہے۔ یہ تو علامت اس کی ہے۔ کہ اس کو دین مقصود نہیں۔ دنیا مقصود ہے اور دوسری حالت یہ ہے۔ کفایت کی صورت میں دوسری جگہ کی تلاش نہ ہو اور ملے بھی تو نہ جائے۔ یہ علامت ہے۔ کہ دین مقصود ہے۔

ہاں یہ بھی دیکھا جاوے گا کہ اس شخص سے دونوں جگہ دین کا نفع برابر ہے یا دوسری جگہ زیادہ ہے۔ اگر اس سے دوسری جگہ کو ترجیح ہے تو اور بات ہے۔ بشرطیکہ قصد دین کا ہو۔ ورنہ اگر دوسری جگہ کو نفع دینی زیادہ ہو مگر مقصود اس کا یہ نہیں۔ بلکہ مقصود تو ہے ترقی دنیا اور نفع دینی کو آڑ بناتا ہے۔ تو اس شخص کی نسبت کہا جاوے گا کہ یہ ملازمت محض دنیا کے لئے کرتا ہے دین کے لئے نہیں کرتا۔ دین کے لئے ملازمت وہ ہے جس میں عزم دین کا ہو۔ اس کو ہر شخص دل میں ٹٹول کر دیکھ لے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ محض لفظی نیت سے کام نہیں چلتا۔

جیسے ایک دفعہ کانپور میں میں مسافرانہ طور سے گیا ہوا تھا اور دوسری جگہ جانے کو تیار، ٹکٹ لینے کے لئے آگے آدمی کو بھیج دیا اور خود عشاء پڑھ کر جانے کو تھا۔ عشاء کی امامت کے لئے مجھے کہا گیا۔ میں نے کہا اگر کوئی مقیم پڑھا دے تو بہتر ہے شاید بعض مقتدی امامت مسافر کے مسائل سے ناواقف ہوں۔ تو ایک صاحب فرماتے ہیں کہ تم اقامت کی نیت کر کے پوری نماز پڑھا دو۔ تو ظاہر ہے کہ وہ نیت لفظی یا خیالی نیت ہوتی۔ حقیقی نیت نہ ہوتی۔ غرض محض تصور سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ تصور نیت نیت نہیں۔ جیسا تصور کفر کفر نہیں۔ بلکہ عزم کفر کفر ہے۔ اسی طرح تصور ریاء ریاء نہیں۔ بلکہ عزم ریاء ہے۔

بہر حال مقصود کو دیکھنا چاہیے اور ہر شخص اپنے وجدان کو دیکھے کہ اس وقت جہاں تنخواہ پر کام کر رہا ہے۔ اگر دوسری جگہ اس سے زیادہ ملے۔ تو چلا جاوے گا یا نہیں۔ اگر زیادہ ملنے پر بھی

نہ جاوے تو معلوم ہوگا کہ یہ شخص حسبۃً للہ کام کرتا ہے ورنہ اجیر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اجرت لینے میں گناہ ہو۔ کیونکہ امام شافعیؒ جواز کے قائل ہیں اور ہمارے علماء نے اس پر فتویٰ دے دیا ہے مگر گفتگو اجر و ثواب میں ہے۔ یہ میری رائے ہے۔ اگر غلطی ہو تو مجھ کو اطلاع کر دی جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص نفقہ قاضی کے طور پر تنخواہ لیتا ہے اس کو اجر ملے گا، ورنہ نہیں۔

اب صرف ایک شبہ اور رہ گیا۔ وہ یہ کہ جب یہ نفقہ قاضی کی مثل ہے تو پھر تنخواہ کا تعین کریں۔ جواب یہ ہے کہ تعین تنخواہ محض رفع نزع کے لئے ہے کیونکہ اصل معیار تو رفع حاجت ہے اور حاجت کبھی کم ہوتی ہے کبھی زیادہ، اور دراصل اس میں معتبر قول صاحب حاجت کا ہے۔ شاید کسی کو اس پر شبہ ہوتا۔ کہ ممکن ہے کہ حاجت پانچ روپے کی ہو اور اس نے بتلا دیئے دس روپیہ، پھر نزاع ہوتا۔ اس لئے مصلحت یہ ہے کہ تعین ہو جاوے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نفقہ زوجہ کو اس میں بھی اصل عدم تعین ہے کیونکہ وہ اجرت نہیں، بلکہ حق واجب ہے اور اصل معیار اس کا حاجت ہے چنانچہ قبل فرض قاضی بھی اس کا ادا کرنا واجب ہے لیکن بعض دفعہ مصلحت عدم نزاع کے لئے قاضی نفقہ کی مقدار معین کر دیتا ہے اور ظاہر ہے فرض قاضی کے بعد بھی وہ نفقہ ہی ہوتا ہے اجرت نہیں ہو جاتی۔ پس اگر تعیین منافی ثابت ہوتی تو چاہیے کہ نفقہ زوجہ بعد فرض کے نفقہ نہ رہے۔ بلکہ اجرت ہو جائے اور اس کا کوئی قائل نہیں۔ یہ اجمالی جواب ہے۔ واللہ اعلم بتفاصیلہ۔ اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو اصلاح کر دی جائے۔ غرض تنخواہ لینے کے بعد ہی بعض صورتوں میں اجر ملتا ہے۔ جب اجر ملتا ہے۔ تو پھر نیت تبلیغ کی کیوں نہ کی جائے۔ پس مدرسین وطلبہ تبلیغ کا ثواب سن کر پڑھنا پڑھانا نہ چھوڑیں۔ بلکہ وہ اس میں نیت تبلیغ کر لیں۔

اقسام تبلیغ

اور اگر تبلیغ کی قسمیں کر دی جائیں کہ ایک تبلیغ اصول وعقائد کی ہے۔ کفار کو۔ دوسری قسم تبلیغ فرد ہے مسلمانوں کو۔ تیسری قسم ایک جماعت کو تبلیغ کے قابل بنانا۔ پھر تو درس تدریس کا تبلیغ میں داخل ہونا بالکل ظاہر ہے اور جب تبلیغ کی مختلف قسمیں ہیں۔ تو اب یہ

ضروری نہیں۔ کہ ہر شخص ساری قسمیں ادا کرے۔ بلکہ اس کے لئے تقسیم خدمات ضروری ہے پس ان سب کاموں کو خاص خاص جماعت کے سپرد کیا جائے۔ یعنی قابلیت اور مناسبت کو دیکھ کر تقسیم خدمات کی جائے۔ کیونکہ ہر ایک آدمی ہر ایک کام کے قابل نہیں ہوتا۔ خود قرآن سے بھی تقسیم خدمات کا ضروری ہونا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ

(اور ہمیشہ کیلئے مسلمانوں کو یہ بھی نہ چاہیے کہ جہاد کے واسطے سب کے سب ہی نکل کھڑے ہوں پس ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تا کہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ حاصل کرتے رہیں)

اس میں حق تعالیٰ نے سب کو دفعتاً جہاد میں جانے پر عتاب فرمایا ہے بلکہ یہ فرمایا ہے۔ کہ ایک جماعت جہاد میں جاتی اور ایک علم حاصل کرتی۔ اس سے اس آیت میں بحث نہیں کی۔ کہ اس تقسیم کے لئے مرجع کیا ہے۔ کس کو علم حاصل کرنا چاہیے اور کس کو جہاد میں جانا چاہیے۔ مگر اتنی بات ثابت ہوگئی۔ کہ دونوں میں مشترک خدمات کو تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح جب تبلیغ کے اقسام ہیں۔ تو کسی کو کوئی خدمت کرنا چاہیے۔ کسی کو کچھ کرنا چاہیے۔ سب ایک ہی کام نہ کریں کہ اس سے دین کی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی۔ باقی یہ پھر کہوں گا۔ کہ جو کچھ کرو اپنے بڑے سے پوچھ کر کرو۔ وہ متعین کردیں گے۔ کہ کس کو کیا کرنا چاہیے۔ وہ جس کو پڑھنے کا حکم دیں۔ وہ پڑھیں۔ جن کو تبلیغ متعارف کے واسطے مقرر کریں۔ وہ مبلغ بنے، پھر تبلیغ کے اندر جس کو جو خدمت سپرد کریں وہ اسی کو انجام دے۔ مثلاً کسی کو مالی خدمت بتا دیں گے کسی کو جانی، کسی کو تصنیف و تالیف کی۔ پس یہ مت سمجھو کہ یہ تبلیغ نہیں ہے یہ بھی تبلیغ ہی ہے کیونکہ مقدمات تبلیغ ملحق بالتبلیغ ہیں۔ پس مال دہندہ بھی مبلغ ہے۔ اور احکام سنانے والا بھی مبلغ ہے اور مضامین لکھنے والا بھی مبلغ ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی سے پوچھو کہ تمہارے کھانے میں کیا صرف ہوتا ہے۔ تو وہ پانچ روپے بتا دے گا۔ مثلاً پھر اس کی تفصیل میں کوئلہ اور اپلہ کو بھی شمار کرے گا۔ مثلاً دو روپے کا اناج ہے اور ایک روپیہ کی دال اور چار آنے کے اپلے۔ اب اگر کوئی کہے کہ میاں ہم تو تم سے کھانے کا حساب پوچھ رہے ہیں۔ تم اپلے کو اس میں کیسے شمار کرتے ہو۔ تو کہا جاوے گا کہ یہ شخص معترض

احمق ہے۔ کیونکہ یہ بھی کھانے کے متعلقات میں سے ہے۔ کھانا بغیر لکڑی یا اپلے یا کوئلہ کے کیسے پک سکتا ہے۔ یہ تو عرف کے موافق کلام ہے اور قواعد شرعیہ سے بھی ثابت ہے کہ مقدمات شئے بھی اسی حکم میں ہوتے ہیں۔ جو اصل کا حکم ہے: چنانچہ ارشاد ہے:

تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی (تقویٰ اور پرہیزگاری کے کاموں میں مدد کرو)

معلوم ہوا۔ کہ معاونت بر بھی بر ہے۔ کیونکہ اس میں تعاون با مور بر کے اور ما مور بہ کا بر ہونا لازم ہے۔ بہرحال تبلیغ کے متعلق متعدد خدمات ہیں۔ پس ایک جماعت ایسی ہو۔ جو اشاعت اسلام کرے اور ایک جماعت ایسی ہو کہ مال سے ان کی امداد کرے وغیرہ وغیرہ۔

طلباء اور تبلیغ

میں نے اس کو مکرر اس لئے بیان کیا کہ ہم لوگوں میں کام کے وقت غلو ہو جاتا ہے کہ بس جدھر رخ کرتے ہیں۔ سب ایک ہی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس لئے تبلیغ کی ضرورت بیان کرتے ہوئے مجھے اندیشہ ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ مدرسین وطلبہ پڑھنا پڑھانا چھوڑ دیں۔ بلکہ اس کو اپنے بزرگوں سے پوچھو کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ آیا سبق چھوڑ کر چلے جاویں یا پڑھتے رہیں یا ایک وہاں سے چلا آوے، دوسرا جاوے۔ غرض اپنی رائے سے کچھ نہ کرو۔ ورنہ بجائے اصلاح کے فساد ہوگا:

میں نے اس کو قصداً عرض کیا ہے کیوں کہ میں یہ رنگ دیکھ رہا ہوں کہ آج کل وہ طلبہ بھی جو علم سے فارغ نہیں ہوئے، تبلیغ میں مشغول ہونا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کے لئے تکمیل علم اول ضروری ہے۔ کیونکہ اگر یہ پڑھنا پڑھانا نہ ہو تو تصنیف و تبلیغ وغیرہ بھی سب بے کار ہے۔ کیونکہ ناقص کی تبلیغ وغیرہ کچھ قابل اعتبار نہیں۔ بلکہ اس طرح تو چند روز میں علم بالکل معدوم ہو ہی جاوے گا تو تعلیم و تعلم بھی ایک فرد ہے۔ تبلیغ کی۔

درجات تبلیغ

اب دوسری بات کہتا ہوں کہ تبلیغ کی اس فرد کی طرف کچھ تو توجہ ہے۔ مگر اس کی جو

دوسری فرد ہے یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ اس کی طرف تو بالکل توجہ نہیں۔ حالانکہ یہ بھی ایک فرد اعظم ہے تبلیغ کی اور اس میں بھی ایک تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک خطاب خاص ایک خطاب عام۔ امر بالمعروف خاص تو آپ کے ذمہ ہے۔ یہ کسی فرد بشر سے ساقط نہیں ہوتا اور امر بالمعروف عام یعنی وعظ کہنا یہ سب کے ذمہ فرض نہیں۔ بلکہ یہ صرف علماء پر واجب ہے اور امر بالمعروف خاص کا مدار قدرت پر ہے۔ یعنی جس کو جس کسی پر جتنی قدرت ہے۔ اس کے ذمہ واجب ہے۔ کہ اس کو امر بالمعروف کرے۔ مثلاً ماں باپ کے ذمہ واجب ہے کہ اپنی اولاد کو نماز روزہ کی نصیحت کریں۔ خاوند پر فرض ہے کہ اپنی بی بی کو احکام شرعیہ پر مجبور کرے۔ آقا کے لئے لازم ہے کہ اپنے نوکر چاکر جو ان کے ماتحت ہیں ان کو امر بالمعروف کرے۔

حدیث میں ہے:۔

مروا صبيانكم بالصلوٰة اذا بلغوا، سبعاً واضربوهم اذا بلغوا عشرا

(مسند أحمد ۲: ۱۸۰، حلية الأولياء ۱۰: ۳۶)

(اپنے بچوں کو نماز پڑھنے کا حکم دو، جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور جب وہ دس برس کے ہو جائیں اور (نماز نہ پڑھیں) تو انہیں مارو)

غرض ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنے ماتحتوں کو حکم کرے۔ امور خیر کا اور خلاف شرع باتوں سے روکے۔ اس میں عالم ہونے کی ضرورت نہیں، ہاں جہاں علم درکار ہے۔ مثلاً کوئی مختلف فیہ مسئلہ ہے یا ایسا کوئی مسئلہ ہے جس کے بہت شقوق ہیں اور وہ ان شقوق کا احاطہ نہیں کر سکا یا احاطہ تو کر لیا مگر درجہ معلوم نہیں۔ کہ متفق علیہ مسئلہ ہے یا مختلف فیہ۔ مسئلہ مختلف فیہ میں گنجائش ہوتی ہے تو ایسا مسئلہ بتلانا ہر شخص کے لئے جائز نہیں بلکہ جس کی نظر کافی نہ ہو اس کو ایسا مسئلہ بیان کرنا بھی جائز نہیں۔ یہ علماء کے بتلانے کا ہے پس تبلیغ خاص کے لئے تو مسئلہ کی حقیقت کا پورے طور سے منکشف ہونا اور قدرت ہونا شرط ہے اور تبلیغ عام یعنی وعظ کہنا یہ علماء کا کام ہے۔ خواہ درسیات پڑھ کر عالم ہوا ہو یا کسی عالم سے مسئلے مسائل سن سن کر عالم ہو گیا ہو۔ اس کو بھی تبلیغ عام کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ کسی بڑے نے اس کو اس کام کے لئے معین کیا ہو۔ چنانچہ

صحابہ نے کہاں پڑھا تھا۔ وہ بھی تو سن سن کر تبلیغ کرتے تھے۔ مگر ہر شخص خود نہ سمجھے کہ میں اس کے قابل ہوں۔ جب تک کوئی کامل نہ کہہ دے کہ تم قابل ہو۔ بقول ایک حکیم کے:

بنمائے بصاحب نظرے گو ہر خود را　　　　عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اپنا موتی کسی صاحب نظر کو دکھلا دے کیونکہ چند گدھوں کی تصدیق سے تم عیسیٰ نہیں ہو سکتے)

جاہل مبلغ

جیسے آج کل بعض لوگ اردو کتابیں دیکھ کر وعظ کہنے لگے اور مسائل میں ایسی غلطیاں کرتے ہیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ ترجمہ تک غلط کرتے ہیں۔

ایک عالم حکایت فرماتے تھے کہ کسی مقام میں ایک واعظ آئے۔ وعظ میں **انا اعطیناک الکوثر** کا ترجمہ کیا۔ کہ اے محمد! دیا ہم نے تم کو مثل کوثر کے ان راوی عالم نے کہا کہ بھائی مثل کا ہے کے معنی ہیں۔ تو فرماتے ہیں کہ یہ کاف کے معنی ہیں۔ یہ کاف تشبیہ کا کہلاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت یہ کاف تشبیہ کا نہیں ہے۔ یہ کاف خطاب کا ہے تو کہتے ہیں کہ کیا دلیل ہے کہ یہ تشبیہ کا نہیں۔ خطاب کا ہے اب وہ چکرائے کہ اس جاہل کو کیسے سمجھائیں۔ سوچ کر کہا کہ وہ گول گول لکھا جاتا ہے۔ جب الف سے ملا ہوا ہو اور یہ ایسا نہیں۔ کہاں ہاں: مجھ کو معلوم نہ تھا پھر بھی غنیمت ہے کہ اس نے اتنا بھی مان لیا۔ ورنہ کہتا، کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ گول گول ہوتا ہے۔ اگر کہتے کہ استاد نے بتلایا ہے، کہتا کیا دلیل ہے کہ استاد نے بتلایا اور پھر استاد ہی کو نہ مانے تو کوئی کیا کر لیتا۔ مگر پھر بھی اس میں دین کی اہلیت تھی کہ اس نے اپنی غلطی کو مان لیا ورنہ اب تو یہ حالت ہے کہ جو بات منہ سے نکل جاتی ہے۔ خواہ وہ بالکل ہی غلط ہو مگر غلطی کا اقرار کبھی نہیں کریں گے۔ تو آج کل ایسے ایسے جاہل بھی وعظ کہنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

خود یہاں دیوبند ہی کی میرے سامنے کی حکایت ہے کہ ایک جاہل اندھا واعظ آیا۔ اس زمانہ میں مولانا رفیع الدین صاحب بھی تشریف رکھتے تھے ان ہی کی مسجد کا قصہ ہے۔ بعد مغرب وعظ شروع کیا۔ وعظ میں یہ آیت پڑھی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ.

(اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لئے اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد (نماز و خطبہ) کی طرف (فوراً) چل پڑا کرو اور خرید و فروخت چھوڑ دو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم کو کچھ سمجھ ہو)

آیت کے اول جز کا ترجمہ تو قریب قریب ٹھیک بیان کر گئے۔ آگے دوسرے جز میں تماشا کیا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم کو سمجھ ہو) کا آپ نے یہ ترجمہ کیا کہ یہ بہتر ہے تمہارے لئے کہ دوکان کو تالا لگا دو۔ آپ نے تعلمون کی گت بنائی۔ اس کو تالا موند سمجھا۔ مگر قرآن میں تو مون ہے موندنا کہاں۔ مگر شاید وہ کہتا کہ یہ مون مرخم ہے موند کا۔ حالانکہ موندنا۔ اس معنی میں مستعمل بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ کیواڑ بند کرنے کو موندنا کہتے ہیں نہ کہ تالا لگانے کو۔ مولانا کو غصہ آیا۔ پوچھا کہ یہ ترجمہ تو نے کہاں سے سیکھا۔ تو سیکری میں ایک شخص بہت ظریف تھے ان کا نام مولوی صادق علی تھا کہا کہ مجھ کو مولوی صادق علی نے یہ ترجمہ بتلایا ہے۔ مولانا نے فرمایا ارے اس نے تجھے چڑانے کو ایسا ترجمہ بتلایا ہے۔ تو اگر ایسے لوگوں کو وعظ گوئی کی گنجائش دی جائے تو بڑا مفسدہ پھیلے گا۔ مگر ہاں بعض ان پڑھ بھی صاحب کمال اور دیندار فہیم ہوتے ہیں۔ ان کا حافظہ بھی اچھا ہوتا ہے اور باوجود اسکے اگر کوئی بات ان سے پوچھی جاوے اور ان کو معلوم نہ ہو تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں۔ ان کو وعظ کہنا کسی عالم کی اجازت کے بعد جائز ہے۔ اب تو یہ مصیبت ہے کہ جو لوگ نام کے مولوی بھی ہیں اور بدوں تحقیق مسئلہ بتلانے کی وعید بھی جانتے ہیں ان کو بھی یہ کہتے ہوئے عار آتی ہے کہ ہمیں معلوم نہیں۔ بس ان سے جو بات بھی پوچھی جاوے فوراً بتلانے کو تیار اور گڑبڑ کر کے جواب دے دیتے ہیں۔ ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک بالکل بددین اور ایک کچھ دین دار ہیں وہ گول گول جواب دیتے ہیں۔ کہ مخاطب کو جواب کا کچھ پتہ ہی نہ چلے اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ان کو مسئلہ معلوم نہیں۔ وہ اس طرح اپنی جہالت کو چھپاتے ہیں۔

حضرت مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ گنگوہ میں ایک جاہل مفتی تھے۔ مولانا نے امتحاناً ان سے پوچھا کہ حاملہ سے نکاح کرنا کیسا ہے۔ مولانا نے مسئلہ بھی چھانٹ کر وہ پوچھا جو بہت ہی شقوق رکھتا ہے مگر وہ شخص تھا متدین۔ یہ جواب دیا کہ بیوہ حاملہ سے نکاح کرنا ایسا ہے جیسے گھیرا دے دینا۔ پوچھا کہ مطلب کیا ہے۔ کہا تم خود سمجھ لو۔ غرض وہ بڑا ہوشیار تھا۔ جواب ایسا دیا کہ مخاطب کو کچھ پتہ ہی نہ چلے۔ نہ حلت کا پتہ لگے نہ حرمت کا اور نہ عقیدہ بگاڑا۔ مگر سائل کو کیا حاصل ہوا بجز اس کے کہ متحیر رہے۔ مگر خیر پہلے کچھ تو اہلیت تھی۔ اب تو من گھڑت سے بھی باک نہیں۔ کوئی کچھ ہی پوچھے جواب تراش کر کہہ ڈالا خواہ غلط ہی ہو تو ایسوں کو تو وعظ کہنا حرام محض ہے۔ البتہ کوئی جاہل اچھے حافظہ والا ہو اور اس کے اندر تدین بھی ہو اور کوئی عالم اس کو اجازت دے۔ تو اس کو وعظ کہنا جائز ہے۔ مگر شرط یہ ہے۔ کہ وہ عالم پہلے اس کی متعدد تقریریں بھی سن لیں۔ پھر اجازت دیں۔

مولانا عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں ایک امی شخص وعظ کہتا تھا مگر اس کا حافظہ ایسا اچھا تھا کہ وہ شاہ صاحب کے وعظ کو از بر یاد کر لیتا تھا تو ایسے شخص کو اجازت ہے۔ جب کہ ہر پہلو سے یقین ہو جاوے۔ کہ قوی الحافظہ ہے، متدین ہے اور اس کے دین کی بھی جانچ کر لی ہو۔ جیسے ڈاک خانہ کے افسر اپنے ہاتھ سے ڈاک کے خانہ میں اپنے نام کے خطوط چھوڑ چھوڑ کر ڈاکیہ کی جانچ کے لئے دیکھتے ہیں کہ پہنچتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح مختلف جلسوں میں اس شخص سے مسائل پوچھواؤ۔ پھر دیکھو جو باتیں اس کو معلوم نہیں ہیں۔ ان کا کیا جواب دیتا ہے۔ اگر کہہ دے کہ معلوم نہیں تو سمجھ لو کہ اس میں تدین ہے۔ اسی طرح اگر کسی طالب علم کو وعظ کے لئے متعین کیا جائے تو جائز ہے۔ مگر اس کے لئے حدود مقرر کر دو۔ کہ اس حد تک کام کرو۔ آگے نہ بڑھو۔ آخر دنیا کے بھی تو ہر کام کی ایک ایک حد ہے۔ کہ اس حد سے تجاوز جائز نہیں رکھا جاتا۔

ہر فرد امت کے ذمہ دعوت

غرض اس طریقہ سے سب کو تبلیغ میں مشغول ہونا چاہیے جس سے جتنا ہو سکے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کسی کی تخصیص نہیں فرمائی۔ بلکہ ادع اِلٰی سبیل ربک میں عام حکم

دے دیا ہے اور یہاں جو بظاہر خطاب حضور کو ہے تو مقصود خاص حضور کو خطاب کرنا نہیں ہے ، بلکہ عام ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ

(اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے) کہ میں اور میرے متبعین اللہ کی طرف بصیرت کے ساتھ دعوت کرتے ہیں۔ اس تفسیر پر انا ضمیر ادعوا کی تاکید ہے اور من اتبعنی اس پر معطوف اور گو علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ میں بھی بصیرت ہوں اور میرے متبعین بھی۔ اس صورت میں یہ مستقل جملہ ہوگا۔ یعنی علیٰ بصیرۃ خبر مقدم اور انا مع اپنے معطوف کے مبتداء مؤخر اور ادعوا کا معمول نہ ہوگا۔ مگر چونکہ دوسری نصوص میں وعید عدم دعوت کی عام ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ایک حدیث ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف نہیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو عتاب عام کرے گا اور آپ نے استشہاد کے لئے یہ آیت پڑھی:۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً

"تو اس کے انضمام سے معلوم ہوا۔ کہ امت کا ہر فرد بھی وجوب دعوت کے حکم میں داخل ہے۔"

نیز حضور نے فرمایا ہے کہ پہلی امتیں امر بالمعروف کے ترک سے ہلاک ہوئی ہیں اور امم سابقہ کے حالات نقل کر کے اگر اس پر نکیر نہ کیا جائے تو وہ بھی حجت ہے۔

اور سنئے کہ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے صید کے قصہ میں فرمایا ہے:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا نِ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا.

یعنی بعض صلحاء نے دوسروں سے کہا تھا۔ کہ ان نافرمانوں کو نصیحت کیوں کرتے ہو۔ (جن کو اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والے ہیں یا سخت عذاب دینے والے ہیں) انہوں نے جواب دیا:۔

قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ.

کہ خدا کے یہاں عذر قائم کرنے کے لئے تاکہ معذور سمجھے جائیں۔ کہ ہم نے تو ان سے ترک معصیت کے لئے کہا تھا۔ مگر انہوں نے نہیں مانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت میں تخصیص کسی کی نہیں۔ بلکہ امتی کے ذمہ بھی امر بالمعروف ضروری ہے اور حکم سب کو عام ہے۔ ہاں اس میں وہ تفصیل کہ کس کے ذمہ کیا حکم ہے۔ یعنی تبلیغ خاص ہے یا عام ہے۔ سو

اس کو میں نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ تبلیغ عام علماء کا منصب ہے۔ تبلیغ خاص تو ہر جگہ اور ہر شخص پر ہے۔ بہرحال حکم عام ہے۔ باقی خطاب کا خاص ہونا خصوصیت مقام سے ہوتا ہے بلکہ اکثر جگہ قرآن میں خطاب خاص ہی ہے۔ لیکن جب آپ کسی کے حکم کے مامور ہیں۔ تو اور سب تو بطریق اولیٰ مامور ہوں گے۔ جب کوئی دلیل تخصیص کی نہ ہو۔

چنانچہ قاعدہ ہے کہ سلاطین کا خطاب اول بڑوں کو ہوا کرتا ہے اور چھوٹے ان کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ جب مقربین کو کسی بات کا حکم ہے۔ تو غیر مقربین پر تو فرض متحتم ہوگا۔

پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ. (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف بلایئے حکمت اور مواعظ حسنہ کے ساتھ اور (بوقت ضرورت) احسن طریق سے ان سے مجادلہ بھی کیجئے)

اس میں سبیل رب کی طرف بلانے کا حکم ہے۔

طریق دعوت

اب رہا یہ کہ طریقہ کیا ہے دعوت کا۔ سو اس کے متعلق حق تعالیٰ نے تین چیزیں بتلائی ہیں (۱) دعوت بالحکمۃ (۲) دعوت بالموعظۃ الحسنۃ (۳) اور ایک مجادلہ۔

یعنی ایک قسم تو دعوت کی یہ ہے کہ حکمت کے ساتھ کی جائے۔ دوسری قسم یہ ہے موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت کی جائے اور ایک یہ کہ مجادلہ حسنہ کیا جائے۔ اس کی توجیہ مختلف ہو سکتی ہے۔ جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ کہ جب کسی کو سبیل رب کی طرف دعوت ہوگی تو اس میں ایک تو دعویٰ خاص داعی کا مطلب ہوگا اور ایک اس کی نقیض ہوگی۔ جو کہ مذہب مخالف ہے۔ پھر گفتگو میں دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک اپنے دعویٰ کا اثبات اور دوسرے کے دعویٰ کا ابطال۔ تو حکمت یہ ہے کہ اپنے دعویٰ پر علمی دلائل قائم کئے جاویں اور مجادلہ یہ ہے کہ مخالف کے مدعی کو باطل کیا جاوے۔ اصل مقصود تو یہ دونوں ہیں۔ باقی تیسری ایک چیز اور ہے۔ وہ موعظہ حسنہ ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کو عباد کے ساتھ شفقت بہت زیادہ ہے۔ اس لئے موعظہ حسنہ بھی ایک طریق بتلا دیا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ناصح دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو ضابطہ کے ساتھ نصیحت کرنے والا وہ تو اپنے ضابطہ کی خانہ پری کر دیتا ہے، دوسرا وہ ناصح جس کو سامعین پر شفقت بھی ہے۔ مثلاً ایک تو منادی کا حکم سناتا ہے اور ایک باپ کا نصیحت کرنا۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ منادی کا کام تو ضابطہ کا ہے۔ نہ صرف حکم کا پہنچانا اس کا فرض منصبی ہے اب تم مانو یا نہ مانو اس سے اس کو کوئی بحث نہیں اور باپ محض سنانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی شفقت اس بات کو مقتضی ہوتی ہے کہ کسی صورت سے اس کو منوا لوں۔ اس لئے وہ ایسی صورت اختیار کرتا ہے کہ بیٹا مان ہی لے۔ تو دیکھئے دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی شفیق نہیں۔ پھر حضور جیسا کوئی خیر خواہ نہیں۔ تو محض شفقت ہی کے مقتضا سے اللہ تعالیٰ نے اولاً حضور کو اور ثانیاً آپ کی امت کو فرمایا ہے کہ دعوت میں صرف حکمت یعنی دلائل ہی پر اکتفا نہ کرو۔ بلکہ ساتھ ساتھ موعظہ حسنہ بھی کرتے رہو۔ جس کی حقیقت تقابل سے معلوم ہوتی ہے کہ حکمت سے جب علمی دلائل مراد ہیں۔ تو موعظہ حسنہ سے دلائل کے علاوہ کچھ اور مراد ہوگا۔ سو وہ ایسے مضامین مؤثرہ ہیں، جس سے مخاطب میں نرمی پیدا ہو، دل پگھل جاوے اور ان مضامین مرققہ کا مصداق ترغیب و ترہیب ہے کہ درجات جنت کی ترغیب اور درکات جہنم سے ترہیب کرنا و نحو ذلک۔ غرض اصل مقصود تو احکام کا سنانا ہے۔ خواہ اصل ہوں یا فروع۔

باقی ایک درجہ مخاطب کے متاثر کرنے کے لئے ترغیب و ترہیب کا بھی ہے۔ گو وہ بھی ایک حیثیت سے احکام ہی میں سے ہے۔ مثلاً جنت اور دوزخ کا مضمون عقیدہ کے درجہ میں تو احکام ہی میں داخل ہے اور اصول میں ہے۔ مگر دوسری حیثیت سے ترغیب و ترہیب ہے یعنی جہاں احکام سنانا اور جنت و دوزخ کا معتقد بنانا مقصود نہ ہو۔ صرف ترقیق قلب مقصود ہو۔ وہاں ترغیب و ترہیب ہے۔ مثلاً کسی کو کہا کہ اگر نماز پڑھو گے تو ایسی جنت ملے گی۔ جس کی یہ شان ہے۔ یہ حالات ہیں۔ اس کے اندر ایسی ایسی آسائشیں ہیں اور اگر نہیں پڑھو گے تو دوزخ میں جاؤ گے جس کے یہ واقعات ہیں تو یہ مضمون ترغیب و ترہیب کی حیثیت سے محض مرقق ہے قلب کا۔ اس سے مخاطب کے قلب میں صلاحیت احکام قبول کی پیدا ہوگی۔

پھر عمل کرنے کی توفیق ہوگی کیونکہ عمل اول اول تکلف سے ہوتا ہے۔ کیوں کہ طبیعت کے خلاف کام ہے۔ اس واسطے کوئی امر آمادہ کرنے والا اور ابھارنے والا ہونا چاہیے۔ طبیعت کے خلاف دنیا کا کوئی کام بھی بلا طمع یا بغیر خوف کے نہیں ہوتا۔ پھر عادت ہو جاتی ہے تو ترغیب وترہیب کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ اس لئے ترغیب کی بھی ضرورت ہوئی اور ترہیب کی بھی۔ شفیق کی تعلیم ایسی ہی ہوتی ہے۔ مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی مضر سے روکتا ہے تو اتنا کہہ دینا کہ یہ چیز مت کھانا، حاکمانہ حق ادا کرنے کے لئے کافی ہے۔ آگے اس کو اختیار ہے چاہے احتراز کرے یا بھاڑ میں پڑے۔ مگر باپ اتنی بات پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ شفقت کی وجہ سے کہتا ہے کہ بیٹا یہ چیز مضر ہے۔ دست آور ہے۔ اسے مت کھانا۔ یہ پیٹ میں درد پیدا کردے گی۔ اس کے کھانے سے پھنسیاں نکل آئیں گی۔ تو اتنا لگنا لپٹنا شفیق ہونے کی حیثیت سے ہے۔ ورنہ اس کو خوف دلانے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ اسی طرح کبھی طمع دلانے سے کام لیتا ہے کہ اگر یہ دوا پی لوگے۔ تو تم کو یہ دوں گا۔ وہ دوں گا۔

خود میرا ایک واقعہ ہے۔ بچپن میں ایک دفعہ بیمار ہوا۔ تو حکیم صاحب نے مسہل تجویز کیا۔ مگر میں پیتا نہ تھا۔ تو والد صاحب نے کہا اگر دوا پی لوگے تو تم کو ایک روپیہ دوں گا بس روپے کے لالچ میں پی گیا۔ تو اس واسطے ضرورت ہے ترغیب وترہیب کی۔ کیونکہ ایسے آدمی بہت کم نکلیں گے جو بلا ترغیب وترہیب کے امتثال امر کرلیں۔ گو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلا ترغیب وترہیب کے بھی کر لیتے ہیں۔ جیسے ایک صحابی کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **لو لم یخف اللہ لم یعصہ**۔ کہ اگر اس کے دل میں خوف خدا بھی نہ ہوتا۔ تب بھی خدا کی نافرمانی نہ کرتا۔ تو بعض کو تو فطری طور پر خدا سے تعلق ہوتا ہے مگر اکثر تو خوف ہی سے کچھ رکتے ہیں پھر وہ درجہ بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ لیکن اول ہی سے ایسے کم ہوتے ہیں مثلاً بچہ پہلے پہلے مار دھاڑ سے پڑھتا ہے اور پھر تو اگر سبق کے لئے اپنے پاس سے بھی خرچ کرنا پڑے، جب بھی نہ چھوڑے تو اس لئے ترغیب ترعیب کی ضرورت ہے۔ یہ موعظۃ حسنہ ہے۔

سبحان اللہ! حق تعالیٰ کی کتنی بڑی شفقت ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور امت کو یہ ترکیب بتلائی کہ آپ اس طریقہ سے کام کیجئے۔ کس قدر رحمت ہے کہ دشوار عمل کو کس طرح آسان کر دیا۔

رعایت مخالف

اس کے بعد ارشاد ہے۔ جادلھم یعنی اس نے مجادلہ کیجئے۔اس میں دو احتمال تھے، ایک مجادلہ حسنہ کا، ایک سیئہ کا۔ اس لئے احسن کی قید لگا دی اور مجادلہ سیئہ سے ممانعت کردی۔ رہا یہ کہ مجادلہ میں تو احسن کی قید لگائی اور حکمت کے ساتھ حسنہ کی قید کیوں نہیں لگائی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غیر حسنہ کا احتمال ہی نہیں۔ کیوں کہ اپنے دعوے کی دلیل بیان کرنے میں کسی کو ناگواری نہیں ہوتی اور دوسرے کے دعوے کو رد کرنے میں بھی اسے کبھی انقباض ہوتا ہے۔اس لئے وہاں قید نہیں لگائی اور یہاں قید لگائی کہ رد اگر ہو احسن طریقہ سے ہو۔جس سے کسی کو رنج اور کلفت نہ ہو۔سبحان اللہ! کس قدر شفقت ہے۔عباد پر کہ مخالف کی اتنی رعایت کہ اس کا رد اگر ہو۔ایسے طریقہ سے ہو کہ اس پر حقیقت تو منکشف ہوجائے، مگر برا بھلا کسی کو نہ کہا جائے۔

اور میں نے جو رد میں یہ قید لگائی۔کہ حقیقت ظاہر ہوجائے یہ اس لئے ہے کہ بعض دفعہ جواب ایسا گول مول ہوتا ہے کہ خصم پر حقیقت بھی ظاہر نہیں ہوتی اور یہ حسن مجادلہ کے خلاف ہے۔اس لئے چاہیے کہ کہے۔تو صاف صاف۔مگر احسن طریقہ یہ ہے چنانچہ فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ کا یہی مطلب ہے۔کہ کھول کے صاف صاف بیان کرو۔ورنہ جہل سے نجات نہیں ہوتی۔جو شخص گول مول بات کرتا ہے۔اس سے ہر شخص راضی تو رہتا ہے۔ مگر اس کا اثر برابر ہوتا ہے کہ مخاطب جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ بات صاف ہو۔مگر الفاظ سخت نہ ہوں۔

قُلۡ لِّعِبَادِیۡ یَقُوۡلُوا الَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ کا یہی مطلب ہے کہ سخت الفاظ سے بچو۔

باریک ادب

اب ایک باریک ادب تبلیغ کا اور رہ گیا۔وہ یہ کہ تبلیغ کرکے ظہور نتیجہ و حصول ثمرہ کی فکر میں نہ پڑنا چاہیے۔بعض دفعہ اس سے بہت برا اثر ہوتا ہے اور یہ بالخصوص مبلغ شفیق کو پیش آتا ہے۔جادلھم تک تو یہ معلوم ہوا کہ تبلیغ شفقت کے ساتھ ہو۔مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تبلیغ کے

بعد بھی شفقت کی وجہ سے اس کی فکر میں لگے رہو۔ اس میں ایک غامد ہے۔ جس کو لوگ کمال سمجھتے ہیں اور ہے واقع میں نقص اس سے تبلیغ کے اندر نقصان ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جب شفقت زیادہ ہوتی ہے تو نتیجہ عاجلہ پر نظر ہوتی ہے مگر اس نتیجہ کو اول سوچ لیتے ہیں کہ اس کا یہ اثر ہوگا حالانکہ اصل نتیجہ رضائے حق ہے اور وہ تبلیغ بطریق مذکور پر فوراً مرتب ہو جاتا ہے اور ثمرہ عاجلہ بھی اگر ہوتا ہے اسی کی برکت سے مرتب ہوتا ہے۔ مگر ہم لوگوں کے اندر عجلت زیادہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ جلدی اثر ہو جائے۔ گو اس میں نیت دین ہی کی ہو۔ مثلاً کسی کو نماز سکھاتے ہیں تو اس کا ثمرہ عاجلہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی آنکھ سے اس کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیں۔ اسی طرح تبلیغ اسلام میں یہ چاہتے ہیں کہ ہماری تحریک کے ساتھ ہی بہت سے مسلمان نظر آنے لگیں اور اس میں بعض وقت یہ مصلحت بھی نیت میں ہوتی ہے۔ کہ اس سے اہل حق کا مجمع زیادہ ہوگا اور حق بڑھے گا تو حق کو قوت ہوگی اور جب اہل حق کو قوت ہوگی تو اہل باطل مغلوب ہوں گے تو وہ مضر بھی نہ پہنچا سکیں گے۔ یہ مصلحت پیش نظر ہو تو یہ دین ہے۔ مگر اس میں غلو نہ چاہیے۔

اور اگر ثمرہ دنیا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہمارا نام ہوگا۔ کہ یہ خوب کام کرتا ہے تو وہ تو ہے ہی برا، اگر چہ بصورت نماز ہی ہو۔ غرض بعض وقت ثمرہ دینی ہوتا ہے اور کبھی دنیاوی۔ مگر یہ سب ثمرات عاجلہ ہیں۔ جن پر بعض مبلغین کی نظر ہوتی ہے۔ پھر اگر ان ثمرات کا ترتب نہیں ہوتا تو حزن و ملال ہوتا ہے اور بعض وقت یاس تک نوبت آجاتی ہے اور مخاطب پر غیظ پیدا ہوتا ہے اور حاضر یا غائب برا بھلا کہتے ہیں کہ جا نالائق! تجھے اس قدر سمجھایا، اتنی کوشش کی مگر تو نے سمجھا ہی نہیں۔ میری اوقات کو ضائع کیا۔ اپنی محنت ہی رائیگاں گئی اور اگر اس پر قدرت ہوتی ہے تو کبھی اس کو سزا بھی دے دیتے ہیں اور وہ بھی اعتدال سے زیادہ اور بعض وقت دل تنگ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ جا بھاڑ میں پڑا کام چھوڑ بیٹھتے ہیں یہ اثر ہوا ثمرات پر نظر ہونے سے۔

بظاہر تو جب مبلغ کو محزون اور غمگین دیکھا جاتا ہے۔ اس کا بڑا ہی کمال سمجھا جاتا ہے اور اعلیٰ درجہ کا مبلغ شمار کیا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا کمال ہوگا کہ ہمہ تن اس طرف متوجہ ہے اور دوسروں سے بھی کہہ رہے ہیں کہ بھائی اس کے لئے دعا کرو۔ کہ اس کی اصلاح ہو جائے۔ مثلاً اگر اپنا بیٹا نماز نہیں پڑھتا تو اس کو سمجھاتے ہیں۔ کڑھتے ہیں، دل سے دعا کرتے

ہیں، اوروں سے بھی دعا کراتے ہیں۔ کسی سے کہتے ہیں اجی: ایک تعویذ ہی کر دو۔ یہ سب افعال گو محمود ہیں مگر جب غلو ہو جاتا ہے تو اس کا اثر برا ہوتا ہے کہ اس کا انجام یاس اور یاس کا انجام تعطل ہوتا ہے۔ تو جس کو آپ نے تبلیغ کا فرد کامل سمجھا تھا۔ اب وہ مفضی الی التعطل و ترک التبلیغ ہو گیا اور تبلیغ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ تو یاد رکھو جو درجہ شفقت کا ایسا ہوگا۔ وہ کامل نہیں، بلکہ ناقص ہے، حاصل اس ادب کا یہ ہوا کہ ثمرات کے مرتب نہ ہونے سے محزون نہ ہو۔ ایک طبعی حزن ہوتا ہے اس کا تو مضائقہ نہیں۔ بلکہ اس میں ثواب ہوگا اور یہ کہ اس میں غلو اور مبالغہ ہو جائے۔ کہ ثمرہ مرتب نہ ہونے سے ہمت ہی توڑ دے اور روتے روتے آنکھیں پھوڑ دے یہ برا ہے۔ نصوص کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنے حزن وملال کی اجازت بھی نہیں۔

حق تعالیٰ جابجا فرماتے ہیں:۔

لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ.

(اور نہ ان پر غم کیجئے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو جایئے)

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اور لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ

(شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ایمان نہ لانے پر (رنج کرتے ہوئے)

(اپنی جان دے دیں گے) اور مَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر مختار ہیں) اور فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ. (تو اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو)

یہ سب آیات مبالغہ فی الحزن سے منع کرتی ہیں۔ یعنی اتنا حزن جس سے اپنی صحت ہی برباد ہو جائے یا کام سے تعطل ہو جائے۔ اس کی اجازت نہیں۔ کوشش کی ممانعت نہیں۔ اس کا تو حکم ہے۔ مگر عدم ظہور نتائج پر اس درجہ کا حزن مضر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں جادلھم کے بعد اس ضرر کا تدارک کیا عجیب فرماتے ہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ

(بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون صراط مستقیم سے

بھٹکا ہوا ہے اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی خوب جانتے ہیں)

یعنی تبلیغ کرکے نتیجہ کی فکر میں نہ پڑو۔ یہ خدا کے قبضہ میں ہے تمہارے اختیار سے باہر ہے۔ یہ بھی ایک درجہ ربط ہے۔ ماقبل کو مابعد سے اور ممکن ہے اور کوئی وجہ ربط اس سے بھی عمدہ کسی کی سمجھ میں آجاوے۔ تو گویا اس مقام میں اللہ تعالیٰ نے دونوں درجوں سے تعرض کیا ہے۔ یعنی ایک تو تفریط فی التبلیغ سے اس کے تدارک کے لئے فرمایا۔ **ادع الی سبیل ربک الایۃ** (آپؐ اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف بلائیے) اور ایک افراط فی التبلیغ سے اس کی ممانعت اس جزو میں مذکور ہے:۔

اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ

(بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون صراط مستقیم سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی خوب جانتے ہیں)

غرض تبلیغ کے اندر کبھی افراط ہو جاتا ہے، کبھی تفریط۔ یہ دونوں مضر ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں شفقت کی کمی کا تو احتمال ہی نہ تھا۔ یہ تو مجموعی انتظام ہم لوگوں کے واسطے فرمایا گیا ہے۔ کہ تبلیغ میں نہ افراط کرنا نہ تفریط، چنانچہ اول میں تفریط کا انسداد ہے اور آخر میں افراط کا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک درجہ تبلیغ کا یہ بھی ہے۔ آخر میں ناکامیابی سے اتنا غم سوار ہوتا ہے کہ یاس کی نوبت آجاتی ہے۔ اس کے بعد تعطل ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ آپ کو اس سے کیا بحث۔ ثمرہ ہو یا نہ ہو۔ آپ اپنا کام کئے جائیے۔ شرارت کا مرتب کرنا ہمارا کام ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کون ہدایت پر ہے اور کون ضلالت میں ہے۔

ایک اور جگہ لطیف عنوان سے اس کو بیان فرمایا ہے:۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُکْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی يَکُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ.

(اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے (جب یہ بات ہے تو کیا آپؐ لوگوں پر زبردستی کرسکتے ہیں جس میں وہ ایمان لے آئیں)

جن کے اندر شفقت ہے وہ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ مخاطب کے عدم تاثیر سے کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔ سو نفس حزن کی ممانعت نہیں۔ وہ تو طبعی اور غیر اختیاری ہے۔ اس میں انسان مجبور ہے۔ بلکہ ممانعت اس کی ہے جو حد ضیق تک پہنچے۔ اس لئے فرماتے ہیں:۔

اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَ ھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ

(بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون صراط مستقیم سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی خوب جانتے ہیں)

آپ کو اس سے کیا کہ کوئی مسلمان ہوا یا نہیں ہوا۔ اس کو اللہ جانتا ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ اس کو خدا کے سپرد کر دیجئے۔ اور جہاں اتنی شفقت نہ ہو اور اس لئے تیز لہجہ اور سختی سے تبلیغ کرنے لگیں۔ اس کی بھی ممانعت فرمادی ہے۔

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے (مسلمان) بندوں سے کہہ دیجئے کہ ایسی بات کہا کریں جو بہتر ہو)

غرض ایک ہی مقام کی آیتیں افراط تفریط دونوں کی ممانعت کے لئے کافی ہو گئیں۔ امید ہے کہ اب بقدر ضرورت یہاں کافی ہو گیا ہے۔

مسلمات سے جواب

ایک مضمون اور رہ گیا۔ اس کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے وہ یہ کہ مقدمہ مقصود کا مقصود ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ فقہی مسئلہ ہے۔ مقدمۃ الواجب واجب تو اس وقت جن چیزوں کا تبلیغ کے لئے موقوف علیہ ہونا ثابت ہو جاوے۔ خواہ لولاہ لامتنع کے درجہ یا مصحح لدخول الفاء کے درجہ میں۔ مثلاً وہ امور جن کو اہل بصیرت بتلادیں کہ تبلیغ کے لئے ان کی بھی ضرورت ہے تو ان کا اتباع کر کے ان مقدمات کو بھی جمع کریں۔ بشرطیکہ شرعی حدود سے باہر نہ ہو۔ چنانچہ اولاً خط کے ذریعہ سے معلوم ہوا تھا اور اب یہاں آ کر دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہاں مدرسہ میں سنسکرت کی تعلیم دی جارہی ہے۔ تو ہر چند کہ سنسکرت کا سیکھنا وجوب کے درجے میں نہیں۔ مگر تبلیغ میں بے حد مفید ہے۔ اس سے معاندین اسلام کے مذہب پر کماحقہ اطلاع ہوگی

اورانہی کی کتب سے ان کا جواب دیا جاوے گا تو بڑا کارگر ہوگا۔ خصم ہی کے مسلمات سے جواب دینا بڑا فائدہ مند ہوتا ہے۔ اس سے وہ ساکت اور دنگ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بہت جگہ دیکھا گیا ہے کہ الزامی جواب جس قدر مفید ہوتا ہے۔ تحقیقی معاند کے لئے اتنا شفا بخش نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک درجہ ہے تبلیغ کا۔ اس سے خصم بالکل ہی چپ ہو جاتا ہے۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے مجمع کے اوپر اثر زیادہ پڑتا ہے۔ عوام اس کو نہیں دیکھتے ہیں کہ کس کی تقریر کیسی ہے ان کے نزدیک تو جس نے ساکت کر دیا بس وہی جیتا۔ وہ تو مسکت ہونے کے وصف کو ہی دیکھتے ہیں۔ دلیل کی حقیقت کو نہیں دیکھتے ہیں۔ تو بر بنائے مقدمۃ الواجب۔ واجب یہ بھی ہو سکتا ہے اور اگر واجب نہیں تو آپ کے نزدیک استحباب ہی کے درجہ میں سہی۔ مگر مفید تو ہے اور یہ عذر کرنا کہ سبق کا حرج ہوتا ہے۔ اجی سبق کے وقت میں اس کا شغل نہ کیجئے۔ بلکہ فضول گوئی میں جو وقت صرف ہوتا ہے۔ اس میں اس کام کو کیجئے۔

تبلیغ میں اہل بصیرت سے رائے

اور ایک مقدمہ تبلیغ کا اور ہے یعنی تقریر کی مشق وہ بھی کیجئے۔ بحمد اللہ آپ کے اساتذہ اہل بصیرت ہیں اور سامان بھی مدرسہ میں موجود ہے۔ اس کو غنیمت سمجھیے اور ایسے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ ایسا سامان کہیں نہیں ملے گا۔

ایک حکایت یاد آئی ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی۔ کسی نے ان کے کمال کی تعریف کی تھی۔ تو آپ نے تواضعاً فرمایا کہ میاں ہماری مثال تو ایسی ہے جیسا رڑکی گودام کا کاریگر۔ کہ جب تک گودام میں ہے کاریگر ہے۔ جہاں باہر نکلا کچھ نہیں۔ کیونکہ اس گودام میں مشین کے ذریعہ سے سب کام ہوتے ہیں، ایک چیز ایک کل میں لگا دی۔ تو اس نے اسے کاٹا، دوسری کل نے اسے ہتھوڑا مارا، تیسری نے بنا بنایا ایک جگہ رکھ دیا۔ ایسے ہی ہمارا کمال ہے کہ جب تک مدرسہ کے اندر ہیں، سب کچھ ہیں اور جہاں باہر نکلے کچھ بھی نہیں، غیر مولانا کی شان تو ایسی کیوں ہوئی، مگر ہماری حالت تو واقعی یہی ہے کہ مدرسہ ہی ہمارے کمالات کا موقع ہے۔

صاحبو! ایسا سامان آپ کو اور کہیں میسر نہیں آوے گا اور وقت بھی نہیں ملے گا۔ اس وقت

کو غنیمت سمجھو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مقدمات ہی کے اندر سارے اوقات کو ضائع کردو۔ بلکہ ہر چیز کو اپنے درجے میں رکھ کر حاصل کرو۔ اصل مقصود تو دین ہے۔ مگر اس کے حاصل کرنے کے طریقے ہیں۔ قرآن کا صحیح کرنا بھی دین ہے۔ حدیث تفسیر پڑھنا بھی دین ہے۔ اسی طرح فقہ بھی دین ہے۔ سب پر نظر رکھنا چاہیے۔ مگر ترتیب سے کرنا چاہیئے۔ اور ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کس کو کتنی مقدار میں حاصل کرنا چاہیے اور یہ اساتذہ کی رائے پر ہے وہ جس کی استعداد جیسی دیکھیں گے، اس کی صلاحیت کو سمجھ کر خود رائے دیں گے، پھر وہ جو رائے دیں، ویسے ہی کرو۔ میرے پاس بعض طلبہ کے خطوط آتے ہیں کہ ہم کو منطق نہیں آتی۔ میں لکھ دیتا ہوں۔ اذا لم تستطع شیئا فدعه جس کو حمد اللہ نہ آوے۔ الحمد للہ پڑھ لے اور جس کے لئے منطق دین میں مفید سمجھی جاوے۔ اس کے لئے وہ بھی دین ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی نے فلسفہ منطق کی کتابیں درس سے خارج کردی تھیں۔ تو ایک طالب علم نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے کہا لیجیے۔ حضرت! معقول پڑھنا بھی مولانا نے حرام کردیا، اس نے اعتراض کے طور پر کہا تھا، مولانا نے فرمایا کہ بھائی مولانا نے حرام نہیں کیا، تمہاری طبیعتوں نے حرام کیا ہے، تمہارے فہم میں کجی آگئی ہے، اس لئے ممانعت کی جاتی ہے اور ہم تو جیسے بخاری میں ثواب سمجھتے ہیں، ویسا ہی امور عامہ میں، اتنا بڑا دعویٰ اطمینان کا یہ مولانا ہی جیسے کا کام ہے، غرض ہر شخص کا الگ حال ہے جس کو اساتذہ و کاملین سمجھتے ہیں۔ اس لئے سب کے ساتھ ایک برتاؤ نہیں کرتے۔ میرے پاس ایک خط آیا کہ مجھ کو عربی نہیں آتی۔ میں نے لکھا کہ چھوڑ دو۔ اردو میں مسائل پڑھو، پنجابی، کابلی، بنگلہ جو زبان بھی آوے اسی میں پڑھ لو۔ کوئی عربی پڑھنا فرض تھوڑا ہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ کس کو کیا کرنا چاہیے اور کتنی مقدار کرنا چاہیے۔ یہ اساتذہ کی رائے پر ہے۔ کیونکہ ہر ایک کی حالت جدا ہے۔ استعداد جدا ہے، سب کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جاتا۔

تبلیغ میں خود رائی

غرض اپنی رائے سے افراط تفریط مت کرو۔ ہمارے اندر بڑی خرابی یہ ہے۔ کہ یا تو کسی کام پر بالکل توجہ ہی نہیں اور یا متوجہ ہوئے، تو سب کے سب ایک ہی طرف ٹوٹ

پڑے، چھوٹے بڑے سب اس میں منہمک ہو گئے۔ اور سب کاموں کو چھوڑ بیٹھے۔

اسی کو مولانا فرماتے ہیں:۔

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی　　　چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

(جب بھوکا ہوتا ہے کتا بن جاتا ہے اور جب شکم سیر ہوتا ہے تو سخت اور ظالم بن جاتا ہے)

اور کسی اردو کے شاعر نے کہا ہے:

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی　　　تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

وہی مثال ہے ہماری کہ "کنویں سے نکلے کھائی میں گرے"۔ غرض ہمارے کاموں میں گڑبڑ بہت ہے۔ اعتدال اور استقامت بالکل نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اب خودرائی پھیل گئی ہے۔ یہ بڑا مرض ہے۔ اس لئے میں نے کہا ہے کہ جو کچھ کرے بڑے سے پوچھ کر کرے۔ بلکہ اکابر بھی چھوٹوں کو مناسب ہے۔ کہ مشورہ میں شامل کرلیا کریں اور یہ سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اس خودرائی کو صوفیاء تو سخت ہی مضر فرماتے ہیں۔ عارف شیرازی کہتے ہیں:

فکر خود ورائے خود در عالم رندی نیست　　　کفر ست دریں مذہب خود بینی وخودرائی

(اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں، اس راہ میں خود بینی اور خودرائی کفر ہے)

وہ تو اس کو کفر فرماتے ہیں۔ لیکن اس سے وحشت نہ ہونا چاہیے کیونکہ کفر کے بھی مراتب ہیں۔ یہ کفر دون کفر ہے۔

اور سبب کلی اس خودرائی کا یہ ہے کہ ہم لوگوں میں اصلاح اخلاق کی کمی ہے۔ چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں۔ ورنہ بزرگوں نے تو چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بغیر مشورہ نہیں کیا۔

اور سبب جزئی یہ ہے کہ ہم لوگ ہوش سے کام نہیں لیتے ہیں، نرے جوش سے کام لیتے ہیں۔ پس جوش میں مشورہ کا بھی تو ہوش نہیں رہتا اور جوش بھی فی نفسہ بری چیز نہیں۔ جوش ہو مگر ہوش کے تابع ہو۔ جب آپ ہوش سے کام لیں گے تو اس کو بھی سمجھیں گے کہ آپ لوگ مقتداء بننے والے ہیں۔ اس لئے آپ کے اندر سب شعبے دین کے ہونا چاہیئے۔ اگر کسی بات کی کمی ہو تو نقصان ہے۔ حسین وہ ہے جس کے آنکھ کان، ناک سب اچھی ہوں۔ سب

چیزیں موزوں ہوں۔ اگر سب چیزیں تو اچھی ہوں۔ مگر آنکھوں سے اندھا ہو۔ وہ حسین نہیں۔ یا ناک کٹا ہوا ہو۔ تو وہ بھی حسین نہیں۔ اسی طرح دیندار وہ ہے جو دین کے تمام شعبوں کا جامع ہو۔ عالم وہ ہے جو تمام شعب علوم کا جامع ہو۔ ان ہی شعبوں میں سے امر بالمعروف کے وہ آداب بھی ہیں جو بتلائے گئے ہیں۔ ان سب کو جمع کرنا چاہیئے۔ بحمد اللہ ضرورت کے موافق بیان ہو گیا ہے۔

باطل کے مقابلہ میں تبلیغ

اسی بیان کا ایک تتمہ یہ بھی ہے کہ اہل اضلال میں اس وقت دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو ارتداد کی صورت میں مرتد بنا رہے ہیں۔ اور ایک وہ جو اسلام کی شکل میں خود پہلے سے مرتد ہیں اور وہ دوسروں کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ یہ فرقہ زیادہ مضر ہے یعنی اس وقت ایک فرقہ تو آریہ کا ہے وہ علانیہ کفر کی دعوت کرتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو اسلام کے پردہ میں کفر کو پھیلا رہے ہیں۔ وہ مرزائیوں کا گروہ ہے۔ ان پر کفر و ارتداد کا فتویٰ ہو چکا ہے۔ مبلغین کو ان دونوں کی مدافعت کرنی چاہیئے، جیسے آریہ ہیں۔ ایسے ہی یہ ناریہ بھی ہیں۔ دونوں کافر ہیں۔

یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ پہلے شعبان میں کانپور میں میرا ایک وعظ ہوا تھا۔ اس کا نام دعوت الی اللہ ہے۔ وہ چھپ بھی گیا ہے۔ میں نے اس میں بیان کیا تھا کہ اب صرف آریہ کا مقابلہ کرنا چاہیے اور آپس میں جو فرقے ہیں۔ جیسے رضائی یا مرزائی، ان سے لڑنا نہ چاہیے۔ یعنی جب وہ لوگ یعنی نو مسلم یا جاہل مسلمان ہمارے گھر کے اندر لڑائی دیکھیں گے تو متحیر رہ جائیں گے کہ یہ سب ہی مسلمان ہیں اور ایک دوسرے کو اہل باطل سمجھتے ہیں۔ پھر ہم کدھر جائیں اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ اب مجھے تنبہ ہوا کہ یہ خیال میرا صحیح نہیں ہے پہلے مجھے واقعات معلوم نہ تھے۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ لوگ بھی صرف توحید و رسالت ہی کی اشاعت کرتے ہیں یعنی رسالت محمدیہ کی۔ اب معلوم ہوا کہ وہ رسالت مرزائیہ کی اشاعت کرتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ یہ سنا تھا کہ وہ ان سے الجھتے ہیں۔ تو اس وقت یہ رائے دی تھی کہ آپس میں نہ لڑو، اس سے جاہل مسلمان یا مرتدین پریشان ہوں گے، اسلام سے رک جاویں

گے۔ اسلام سے متوحش ہوں گے۔ پہلے ان کو کسی کے ہی ذریعہ سے مسلمان ہونے دو۔ جب وہ مسلمان ہوجاویں گے پھر بتلا دینا کہ یہ مذہب باطل ہے اور یہ حق ہے اور اسی دعوت الی اللہ میں یہ بھی کہا تھا کہ یہ جب تک۔ ہے۔ کہ وہ مرزائی وغیرہ اپنے مذہب سے تعرض نہ کریں۔ نہ اپنے عقائد کی اشاعت کریں اور اگر وہ اس سے تعرض کریں تو تم بھی دریغ نہ کرو۔

اب ایک دوست نے لکھا ہے کہ تمہارے وعظ میں جو یہ مضمون ہے اس سے تو لازم آتا ہے کہ ہم اور کفار ایک جگہ ہو کر اسلام کی اشاعت کریں اور اس خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لوگ اپنے عقائد کی اشاعت سے تعرض بھی کرنے لگے ہیں تو میں نے جواب لکھا کہ اس میں اس حالت میں عدم سکوت کی طرف خود اشارہ ہے اور یہ اجازت دی کہ اب شائع کردو کہ اگر وہ اپنے مذہب سے تعرض کریں تو ہم بھی ان سے ضرور تعرض کریں گے۔

پھر ایک دوست نے مجھ کو یہ لکھا کہ اب وہ تعرض نہ بھی کریں جب بھی ہم کو تعرض کرنا چاہیے۔ کیونکہ حقیقت میں گو وہ مسلمان نہیں۔ مگر ہمارے سکوت سے عام مسلمانوں کو تو یہ خیال ہوگا کہ یہ مسلمان ہیں۔ تو پھر تو چندے وہ انہی کو اپنے مقتداء اور پیر خیال کریں گے۔ پھر اس سے لوگوں کو ہٹانا مشکل ہوگا۔ اس وقت میری آنکھیں کھل گئیں۔ کہ بے شک میرا خیال غلط تھا۔ پھر میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ ہمارے مبلغین کو کیا کرنا چاہیے۔ ان سے تعرض کرنے میں تو ضرر یہ تھا کہ کہیں دعوت ہی نہ رک جائے اور بجائے مرتدین کو مسلمان بنانے کے کہیں مرزائیوں ہی کے مناظرہ میں سارا وقت صرف نہ ہوجائے۔

اور تعرض نہ کرنے میں یہ خیال ہوا کہ اگر لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا جائے، کہ وہ جس کے ہاتھ پر چاہیں اسلام لے آئیں، چاہیں ہمارے ہاتھ یا مرزائیوں کے تو بعد اسلام لانے کے بعض نو مسلموں پر ان کا اثر ہوجاوے گا۔ پھر ہٹانا مشکل ہوگا۔ اس لئے مشورہ کیا گیا۔ غرض اس مصلحت کا بھی خیال تھا کہ اگر اب نہ روکا جائے تو انجام میں اثر اچھا نہ ہوگا اور اس مفسدہ کا بھی خیال تھا کہ اس سے وہ مسلم پریشان ہوں گے کہ ہم کدھر جائیں۔ تو مشورہ پر بعض نے کہا کہ مقصود تو دعوت ہے۔ تو مرزائیوں سے تعرض کرنا بھی تو دعوت ہے

اس کو کیوں ترک کریں، مسلمان بنانا تو ہمارے ذمہ فرض نہیں۔ ہمارا کام دعوت ہے۔ خواہ اس تعرض کے بعد کوئی مسلمان ہو یا نہ ہو اس کی پرواہ نہ کرنا چاہیے۔

ثمرہ تبلیغ

اور اب یہاں آن کر بھی معلوم ہوا۔ کہ راجح یہی ہے کہ ان کا رد ضرور کیا جائے اور نتیجہ پر نظر نہ کی جاوے اور اسی کو تو فرماتے ہیں :۔

اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ ھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو جو اس کے راستہ سے گم ہوا اور وہی راہ چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے) اور وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ. (حالانکہ کسی شخص کا ایمان لانا بغیر اللہ کے حکم کے ممکن نہیں)

چنانچہ حضور کا بعض دفعہ جی چاہتا ہے کہ وہی معجزہ ظاہر ہو جائے۔ جو کفار چاہتے ہیں۔ تو اس کا کیا عجیب وغریب جواب ملا۔

وَ اِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکَ اِعْرَاضُھُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَھُمْ بِاٰیَةٍ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَمَعَھُمْ عَلَی الْھُدٰی فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْجَاھِلِیْنَ.

(اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا اعراض کرنا گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ ھ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو ان سب کو راہ پر جمع کر دیتا سو آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیے)

پوری آیت کا مطلب تو ظاہر ہے۔ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْجَاھِلِیْنَ۔ (پس آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیے) کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔ بظاہر ترجمہ دیکھنے والوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے ایسا سخت لفظ فرمایا ہے۔ یہ شبہ اصل میں غلط محاورہ سے ہوا ہے۔ ہمارے محاورہ میں جاہل بہت سخت لفظ ہے اور اسی کا اگر ترجمہ کیا

جائے تو آسان لفظ ہوجاتا ہے۔ جاہل کا ترجمہ ناداں ہے۔ یہ کتنا پیارا لفظ ہے اس سے توہین لازم نہیں آتی۔ بلکہ شفقت کے موقع پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ ہمارے محاورہ میں بھی کہتے ہیں۔ دیکھو میاں ناداں ایسی باتیں نہ کرو۔ دیکھو بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ تو دیکھئے ظاہر میں تو جاہل کا لفظ کتنا سخت ہے مگر ترجمہ کے بعد اس کی حقیقت بالکل آسان ہے۔ یہ اشکالات غلط محاورہ سے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وطن میں ایک شخص نے میرے سامنے ایک اشکال پیش کیا۔ اس طرح سے کہ پہلے مجھ سے پوچھا **وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدىٰ** کا ترجمہ کردو۔ پھر اشکال کروں گا۔ میں سمجھ گیا کہ کیا اشکال ان کو پیش آیا ہے۔

منشاء اشکال کا یہ تھا کہ قرآن مجید کے بعض تراجم میں ضال کے معنی گمراہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ بس شبہ یہ تھا کہ اس میں حضور کو گمراہ کہا گیا ہے میں نے کہا کہ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ پایا آپ کو ناواقف۔ پس واقف بنا دیا۔ اب وہ میرا منہ تکنے لگا۔ میں نے کہا میاں بتاؤ کیا اشکال تھا؟ کہنے لگا اب تو کچھ بھی نہیں۔

اس جگہ راز یہ ہے۔ کہ ضلالۃ کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے۔ ایک مذموم میں۔ یعنی **ولا الضالین** میں جو ضال کہا گیا ہے۔ وہاں تو مذموم میں مستعمل ہے۔ یعنی جو بعد وضوح حق بھی اتباع حق نہ کرے اور ایک غیر مذموم ہے۔ یہ کہ اب تک وضوح حق نہیں ہوا۔ اس کے معنی ناواقفی کے ہیں۔ جو نقص نہیں۔ کیوں کہ حضور پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے۔ جس میں آپ پر حقائق واضح نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

مَاكُنْتَ تَدْرِيْ مَاالْكِتَابُ وَلَاالْاِيْمَانُ. (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (نزول وحی سے پہلے) معلوم نہیں تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان کے بارے میں علم تھا)

یعنی نزول وحی سے پہلے آپ ان علوم کو کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدىٰ. (اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (شریعت سے) بے خبر پایا اور (شریعت کا راستہ) بتلایا)

میں یہی درجہ مراد ہے۔ کہ پہلے آپ پر وضوح حقائق نہیں ہوا تھا۔ جب ہم نے وحی

نازل کر کے حقائق کو واضح کر دیا اور ولا الضالین میں وہ درجہ مراد ہے کہ وضوح حق ہو چکا تھا مگر بعد وضوح حق بھی کجی اختیار کی۔ تو جس طرح ضلالت کے دو معنی ہیں، اسی طرح لفظ گمراہ بھی فارسی میں دونوں معنوں کو شامل ہے۔ اسی لحاظ سے بعض مترجموں نے ضال کا ترجمہ گمراہ کیا ہے مگر اب ہمارے محاورہ میں گمراہ کا لفظ زیادہ تر معنی ثانی میں مستعمل ہوتا ہے اس لئے اب ضرورت ہے ترجمہ بدلنے کی۔ کہ ایسے الفاظ سے ترجمہ نہ کیا جاوے۔ جس سے عوام دھوکہ میں پڑیں۔ اسی طرح فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ۔ کے معنی یہ ہیں کہ آپ نادانوں کی سی باتیں نہ کیجئے۔ اس سے کچھ بھی ابہام نہیں ہوتا۔ بلکہ پیار کا لفظ ہے۔ دیکھو اگر تم کسی کو کہو۔ کہ او مرغی کے بچے! تو وہ بھڑک اٹھتا ہے، غضب ناک ہوتا ہے، گویا آگ لگا دی اور اگر کہو او چوزے، تو ہنس دیتا ہے اور یہ لفظ کس قدر پیارا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اس کو گمان ہوتا ہے، کہ کہیں یہ مجھ پر عاشق نہ ہو گیا ہو تو دیکھئے لغت کے بدلنے سے اثر بدل جاتا ہے، اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ ترجمہ ایسا کیا جائے، جس سے سامعین کو وحشت نہ ہو۔

میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ حضور کا جی چاہتا تھا۔ کہ کفار کو وہی معجزہ دکھلایا جاوے۔ جس کو وہ چاہتے ہیں۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے دیا۔

فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقاً فِي الْاَرْضِ الاية.

(اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈیں)

حاصل آیت کا یہ ہے کہ ہم تو ایسا معجزہ نہیں دکھلاتے۔ اگر آپ کا جی چاہتا ہے تو زمین میں سرنگ لگا کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر لے آیئے ہم بھی دیکھیں کہ آپ کہاں سے لائیں گے۔ کس قدر خشک اور مایوس کن جواب ہے۔ تو اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ کام کرنے والے کو ثمرہ عاجلہ پر نظر نہ ہونی چاہیے۔ اور اس کے عدم ترتب سے محزون نہ ہونا چاہیے اور ایک تو طبعی حزن ہوتا ہے۔ اس میں تو آدمی معذور ہے، بلکہ ماجور ہے اور ایک مبالغہ فی الحزن ہے یعنی یہ سوچ سوچ کر محزون ہونا اس کی اجازت نہیں۔ میں ان دونوں کے جمع کا طریق بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ سعی میں نیت فقط رضائے خدا کی ہو۔ یہ نیت ہی نہ ہو کہ وہ مسلمان ہی ہو جائے۔ ہاں دعا کرتا رہے کہ یا اللہ اس کو مسلمان بنا دیجئے۔ اور اس کے دل کے اندر اپنا خوف

پیدا کردیجئے۔ دعا تو یہ کرے اور عمل وہ کرے کہ اپنے کام میں رضائے حق کو مدنظر رکھے۔ اپنا کام صرف تبلیغ کو سمجھے۔ خواہ ثمرہ مرتب ہو یا نہ ہو۔ وہ خدا کے اختیار میں ہے اور اگر کسی کے ذہن میں اور کوئی صورت جمع کی ہو۔ تو مطلع فرمادیں (اہل مجلس کی طرف سے جواب آیا کہ یہ بالکل صحیح ہے) ذوق گواہی دیتا ہے کہ یہ طرز کافی شافی ہے۔ اس سے تکلیف بھی نہیں ہوگی حزن و ملال بھی نہ ہوگا اور چونکہ دعا میں عرض و معروض ثمرہ ہی کے متعلق ہوگی۔ تو اس میں یہ نیت بھی ایک درجہ میں ہو جاوے گی کہ ثمرہ مرتب ہو بس اتنی نیت کافی ہے۔ ثمرہ مرتب ہونے کے لئے اس سے زیادہ مناسب نہیں اور نیت بھی ایسے طریقہ سے ہے کہ حق تعالیٰ سے عرض حاجت کی ہے امید ہے کہ وہ پوری ہوگی۔ قلوب ان کے ہاتھ میں ہیں۔ ان شاء اللہ وہ قلوب کو پھیر دیں گے اور اگر اس دعا کے بعد بھی کامیابی نہ ہو، بلا سے نہ ہو، تم اس کی پرواہ مت کرو، نیز دعا میں بھی یہ قصد نہ کرو کہ یہ ثمرہ ضرور مرتب ہو ہی جاوے۔

اگر کوئی کہے۔ کہ یہ تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال کرنا کہ مقصود پورا ہو ہی جاوے۔ یہ دعا میں محمود ہے۔ حدیث **ان الله يحب الملحين في الدعاء (فتح البارى لابن حجر ۱۱: ۹۵)** سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے اندر یہ قصد ہونا چاہیے، نیز **ادعوا الله و انتم موقنون بالاجابة (سنن الترمذی : ۳۴۷۹)**

اور تم اس سے منع کرتے ہو؟ تو یہ بات ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے۔ کہ دعا میں عزم تو یہی ہو کہ یہ مقصود پورا ہو جائے مگر اس کے ساتھ دوسری شق پر بھی رضاء ہے۔ یعنی دعا تو اسی نیت سے کرے کہ مراد پوری ہو ہی جائے۔ لیکن یہ بھی دل میں رکھے کہ اگر نہ ہو تو اس پر بھی راضی اور خوش رہوں گا۔ مثلاً تندرستی کے لئے دعا کرتا ہے۔ کہ یا اللہ ہمیں تندرست کردے۔ تو یہ نیت نہ کرے۔ کہ اگر آپ کا جی چاہے۔ تو کردیجئے اور مرضی نہ ہو تو نہ کیجئے۔ اس لئے کہ دعا کے اندر ان شئت کہنے کی ممانعت ہے۔

حدیث میں ہے کہ ان شئت مت کہو۔ کیونکہ ان کو مجبور کرنے والا کون ہے۔ وہ خود ہی جو مناسب ہوگا کریں گے۔ جو تمہارے لئے بہتر ہوگا وہی تجویز کریں گے تم اپنی طرف سے یہی عرض کرو کہ میری مراد پوری ہو جاوے۔ البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ جس چیز کی

دعا کرنا ہے وہ شریعت کے موافق ہو اور اس کے موافق سمجھنے میں اگر اجتہادی غلطی ہو جاوے تو عفو ہے۔ مثلاً جس چیز کی دعا کرتا ہے یہ اس کو قواعد سے شریعت کے موافق سمجھا تھا اور واقع میں شریعت کے مخالف تھی۔ تو اس پر دارو گیر نہ ہوگی۔ غرض مراد تو شریعت کے موافق ہونا چاہیے۔ خواہ واقع میں یا اس کے اجتہاد میں۔ مگر دعا تردد کے ساتھ نہ کرے جزم کے ساتھ کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سمجھے کہ اگر قبول نہ ہو۔ تو بھی میں راضی رہوں گا اور میرے لئے وہی بہتر ہوگا اور اسی میں خیریت ہوگی تو اس قضیہ ذہنیہ سے اس غیر معلقہ ملفوظ کی تعدیل ہو جائے گی۔ جب حقیقت دعا کی سمجھ میں آئے گی۔ تو اب شبہ رفع ہو گیا اور جزم بالدعاء وعدم قصد ثمرہ میں تعارض نہیں رہا۔

مقصود تبلیغ

خلاصہ یہ ہے کہ اصل مقصود سعی سے رضائے حق ہے۔ نہ کہ ثمرہ اور اس کے ساتھ ہی ثمرہ کے لئے دعا کی بھی اجازت ہے۔ مگر مبالغہ کے ساتھ اس کے پیچھے مت پڑو کہ ہو ہی جائے اور نہ ہو تو رنج کرنے بیٹھ جاؤ۔ چنانچہ **فانت له تصدی** (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی فکر میں پڑتے ہیں) اور **لست علیھم بمصیطر** (آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر مسلط نہیں ہیں) میں اسی کی تعلیم ہے۔ کہ آپ تبلیغ کرنے کے زیادہ پیچھے نہ پڑیئے۔ وہ قبول کریں یا نہ کریں، اس سے بحث نہ ہونا چاہیے۔ آپ اس کے درپے نہ ہوں۔ آپ کا کام رضائے حق حاصل کرنا ہے۔ نہ کہ ثمرات۔ کہ وہ نہ اختیاری ہیں نہ موعودہ۔ اسی لئے ہم کو کسی کے مسلمان بنانے کا حکم نہیں۔ کیونکہ وہ دوسرے کے اختیار میں ہے اور ظاہر ہے۔ قادر بقدرت الغیر کیسے قادر ہو سکتا ہے۔ اختیار تو دوسروں کا ہے اور اس سے کام لیں آپ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟۔ اس لئے ایسے امور کے مستعدی ہونے سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ بالخصوص سالکین کو ان کی تو ثمرات عاجلہ پر نظر کرنے سے گویا سوت آ جاتی ہے۔ کیونکہ اہل علم کو ثمرہ مرتب نہ ہونے سے بدحالی کا شبہ نہیں ہوتا اور سالکین کو ثمرہ عمل حاصل نہ ہونے سے بدحالی کا شبہ ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم کو ذوق شوق ہو۔ اگر یہ طاری ہو، میلان الی المعاصی نہ

ہو، معصیت کا وسوسہ بھی نہ ہو، ہر وقت محویت رہے۔ مگر انسان اس کا مکلف کب ہے۔ وہ تو صرف اس کا مکلف ہے اور اتنا ہی اس کے اختیار میں ہے۔ کہ معاصی کا مرتکب نہ ہو۔ جوارح اور قلب کو گناہ سے پاک رکھے، نہ ہاتھ سے گناہ کرے، نہ پیر سے نہ زبان اور دل کو معاصی میں مبتلا نہ کرے، خلاصہ یہ کہ اتقائے معصیت پر عمل نہ کرے۔ اگر تقاضے پر عمل نہ ہو تو پھر خواہ کتنا ہی میلان ہو، واللہ ذرہ برابر بھی نقص نہیں بلکہ ماجور ہے کیونکہ اس وقت مشقت زیادہ ہوتی ہے۔ نفس سے جہاد کرنا پڑتا ہے۔ بار بار تقاضا ہوتا ہے اور وہ اس کو روکتا ہے اور جو شخص یوں چاہتا ہے کہ میلان ہی نہ ہو۔ اول تو یہ اختیار میں نہیں، اس کا قصد بے معنی، پھر اگر ایسا کیا تو حقیقت میں وہ طالب حق نہیں۔ طالب راحت ہے پس اس میں تاکید نفس ہے کہ مشقت سے بھاگنا چاہتا ہے۔ مجاہدہ سے اکتاتا ہے پس میلان الی المعاصی کوئی نقصان کی بات نہیں، یہ تھوڑا بہت سب کو ہوتا ہے، حتیٰ کہ کاملین کو بھی ہوتا ہے۔ ہاں کسی کا نفس ایسا مطمئنہ ہو جائے کہ گناہ کا خطرہ ہی نہ گزرے۔ یہ اور بات ہے مگر یہ نادر ہے۔ غرض خطرات کا آنا کوئی مضر چیز نہیں۔ پس اس غم میں نہ پڑنا چاہیے گو غم میں پڑ جانا بھی فی نفسہٖ مضر دین نہیں۔ لیکن اس سے کلفت تو ہوتی ہے اور اس کلفت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ کوئی بیماری لگ جاتی ہے۔ پھر دین کے کاموں میں خلل پڑنے لگتا ہے:۔

چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں ایک شخص حاضر تھے۔ جو مجاہدہ بہت کرتے تھے۔ کھانا بہت کم کھاتے تھے اور اس سے ضعیف ہو گئے تھے۔ تو مولانا نے فرمایا۔ کہ حدیث میں ہے:۔

المؤمن القوی خیر من الضعیف و فی کل خیر (الصحیح لمسلم ، القدر: ۳۴)

یعنی اگر مومن تندرست طاقت ور ہے تو کسی کی کچھ خدمت کر دے گا کسی کے لئے پانی لا دے گا۔ اور اگر ضعف آ گیا تو بجائے خادم ہونے کے مخدوم بن جائے گا، دوسروں کا محتاج ہوگا کہ بھائی مجھے پانی پلا دو، لاؤ وہ لا دو، حتیٰ کہ بعض دفعہ نماز روزہ ادا کرنا بھی مشکل ہو جاوے گا۔ ہاں ضعف اضطراری الگ بات ہے، یہاں تو اختیاری کا ذکر ہے۔ مگر انہوں نے نہ مانا۔ اس کے بعد ان کے معدہ میں خشکی پیدا ہوئی۔ اس سے کچھ الوان اور روشنیاں نظر آنے لگیں۔ جن کو انہوں نے مولانا کی خدمت میں ظاہر کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ مقدمہ جنون ہے علاج کرو۔ مگر وہ اس

کو بزرگی سمجھے ہوئے تھے۔علاج نہ کیا آخر مجنون ہو گئے۔ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ برہنہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہتے تھے۔وظائف اور مجاہدہ تو الگ رہا۔فرائض بھی چھوٹ گئے،اس سے کیا نفع ہوا۔غرض امور غیر اختیاریہ کے درپے ہونے سے بہت کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت سے بیمار ہو جاتا ہے۔بعض اوقات مر جاتا ہے۔بعض لوگ خود کشی کر لیتے ہیں۔

چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں ایک طالب علم نے ایک حکایت بیان کی تھی کہ رام پور میں ایک شخص تھے۔ان کو ایسا ہی قبض طاری ہوا،ساری کیفیات جاتی رہیں۔وہ سمجھے کہ میں مردود ہو گیا اور کوئی دستگیر ہادی ملا نہیں،آخر خود کشی کر لی۔باقی یہ کہ اس سے مواخذہ ہو گا یا نہیں اس میں کلام کرنے کی ضرورت نہیں۔یہ مقدمہ ہمارے پاس نہیں آوے گا۔خدا جانتا ہے۔کہ وہ مغلوب الحال تھے یا نہیں۔مگر نقصان تو ہوا۔

عبدیت کا تقاضا

اور اس میں ایک باریک بات اور ہے۔وہ یہ کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہو،ایسی ہو،یہ شخص اپنے لئے خود تجویز کرتا ہے جو کہ خلاف عبدیت اور بے ادبی اور گستاخی ہے تمہیں کیا حق ہے تجویز کرنے کا۔تمہاری تو یہ حالت ہونا چاہیے:

چوں کہ برمیخت بہ بندو بستہ باش　　چوں کشاید چابک و برجستہ باش

(جب وہ باندھ دیں تو بندھے رہو اور جب کھول دے تو کھل جاؤ اور خوشی سے کودنے لگو)

چنانچہ ایک حکایت ہے حاجی صاحبؒ کی اس سے آپ کو اس کی حقیقت معلوم ہو گی۔کہ ایک طالب علم آپ کے پاس آیا اور مرض کی شکایت کی کہ اتنے دنوں بیمار رہا۔اس مدت میں حرم شریف میں نماز پڑھنا بھی نصیب نہ ہوئی۔دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ صحت وقوت بخشے۔اس وقت حضرت نے اس کے لئے دعا کی۔جب وہ چلا گیا تو فرمایا یہ شخص عارف نہیں ہے۔اگر عارف ہوتا تو نماز حرم کی غیر حاضری سے مغموم نہ ہوتا کیونکہ مقصود اصلی تو قرب ہے جس طرح بھی حاصل ہو اس کا طریقہ مختلف ہے۔ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بیمار ہو جائے اور اس پر صبر کرے۔شکوہ شکایت نہ کرے اور اس سے قرب ہو تو مقصود جس طریقہ سے بھی حاصل ہو اس پر راضی

رہنا چاہیے۔ حصول مقصود کے بعد کسی طریقہ کے فوت پر حسرت کرنا مقصود کی بے قدری ہے۔

اور اس کی ایک مثال بیان فرمائی کہ دیکھو لوگ جو حج کرنے آتے ہیں تو مقصود کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مقصود حضوری بیت اللہ ہے۔ کوئی خاص راستہ مقصود نہیں۔ کہ مثلاً بمبئی ہی ہو کر آوے۔ اب ایک شخص تو بمبئی ہو کر آیا۔ اس کو بہت سے حالات راستہ کے معلوم ہوئے اور ایک کراچی ہو کر آیا۔ جس کو وہ خاص حالات معلوم نہ ہوئے اب کوئی بے وقوف ہی ایسا ہوگا جو حج کو چھوڑ کر کراچی سے بمبئی آوے۔ تا کہ یہ حالات معلوم ہوں۔ صوفیا نے لکھا ہے طرق الوصول الی اللہ بعددِ انفاس الخلائق۔ کسی کے لئے کوئی طریقہ ہے۔ کسی کے لئے کوئی طریقہ ہے۔ کوئی طریقہ مقصود نہیں۔ مقصود رضا ہے۔ جب رضا حاصل ہے تو اب تمنا کرنا کہ یہ ہو وہ ہو یہ تجویز ہے جو ادب طریقہ کے خلاف ہے۔ صوفیاء تو اپنے ارادہ کو ایسا مٹاتے ہیں کہ یہاں تک کہتے ہیں

اريد و صاله و يريد هجرى　　　فاترک ما اريد الما يريد

(میں اس سے ملاقات کا متمنی ہوں وہ مجھ سے جدائی کا خواہاں ہے میں نے اس کے ارادہ پر اپنا ارادہ مٹادیا)

اور حافظ شیرازی نے اسی کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق　　　ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اور اس کی خواہش میری جدائی ہے میں نے اپنی تمنا چھوڑ دی تا کہ میرے دوست کی تمنا پوری ہو جائے)

پس عبدیت یہ ہے۔ کہ اپنی خواہش کو فنا کر دے جو ان کا ارادہ ہے اسی پر راضی رہے۔ بعض عارفین نے فرمایا ہے: اريد لا اريد واختار ان لا اختار

اس پر ابن عطا اسکندری نے ایک اشکال وارد کر کے خود جواب دیا ہے، اشکال یہ ہے کہ عدم ارادہ کا ارادہ یہ بھی تو ایک ارادہ ہوا۔ پھر ارادہ کا فنا کہاں ہوا۔ کسی معقولی کا اشکال معلوم ہوتا ہے۔ پھر خود جواب دیا ہے کہ مغلوب مطلق ارادہ کا فنا کرنا نہیں۔ بلکہ صرف ارادہ کا جو کہ رضا کے خلاف ہو اور عدم ارادہ کا ارادہ رضا کے خلاف نہیں۔ کیونکہ خداوند کریم بھی چاہتے ہیں کہ بندہ کسی ایسی بات کا ارادہ نہ کرے جو رضا کے خلاف ہو۔ پس عدم ارادہ کا ارادہ فناء ارادہ کے منافی نہ ہوا۔

خلاصہ یہ کہ اعمال اختیاریہ میں کمی کرے اور ثمرات غیر اختیاریہ میں تفویض کرے۔اس قدر ان کے درپے نہ ہو۔کہ فقدان پر غم کرنے لگے۔البتہ جوان میں محمود ہیں۔ان کے لئے دعا کا مضائقہ نہیں، پھر حاصل ہوں تب نہ حاصل ہوں،تب دونوں حال میں راضی رہو اور اختیاری اعمال میں لگے رہو۔کیونکہ غم تو جب ہوتا ہے۔جب ان ثمرات کا وعدہ ہوتا ہے۔یہ وعدہ کہاں ہے۔کہ ذوق وشوق بھی عطا کروں گا۔ہاں حدیث میں اس کی دعا آئی ہے۔تو ذوق وشوق کے واسطے دعا کرو۔اس سے کام میں سہولت ضرور ہوتی ہے۔اس لئے اپنے اہل طریق نے کہا ہے۔کہ یہ احوال مقصود نہیں ہیں۔ہاں محمود ہیں۔جب محمود ہیں۔تو دعا کرلو اور جب مقصود نہیں۔اس کے فقدان سے پریشان نہ ہو۔ان کا انتظار کرو جیسے مقولہ پر مشہور ہے:

الحائک اذا صلی یومین انتظر الوحی (جولاہا جب دودن نماز پڑھ لے پھر وحی کا انتظار کرتا ہے)

ایسے امور غیر اختیاریہ وغیرہ موجودہ کے متعلق حضرت حاجی صاحب سے کوئی شکایت کرتا۔کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا۔تو حضرت فرماتے کہ یہ تھوڑا نفع ہے کہ خدا نے تم کو اپنا نام لینے کی توفیق دی اور اکثر یہ شعر پڑھتے۔

یابم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم　　　　حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

(میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں میں اس کی جستجو کرتا ہوں مجھے یہ ملے یا نہ ملے اس کی آرزو کرتا ہوں)

یہاں ایک علمی اشکال ہے وہ یہ کہ یافتن حق تو نصاً مطلوب ہے اور اسی کے پانے کے لئے تو رات دن مستانہ وار پھرتے ہیں۔پھر نہ یافتن پر رضا جواب یہ ہے کہ قائل کی اصطلاح نہ جاننے سے یہ اشکال وارد ہوا۔ہر فن کی اصطلاح جدا ہے۔عشاق کی اصطلاح الگ ہے۔علماء کی جدا اصطلاح ہے تو ہر متکلم کی اول اصطلاح جاننا چاہیے۔یہاں یافتن حق سے مراد یافتن حقیقی نہیں یافتن مرغوب ہے جو اس نے اپنے ذہن میں تراش رکھا ہے کہ اگر یہ بات حاصل ہو جو میرے ذہن میں ہے تب تو یافتن متحقق ہوا ورنہ نہیں ہوا۔تو اس کو فرما رہے ہے کہ یہ خواہ حاصل ہو یا نہ ہو۔اس کو چھوڑ دو اور اپنا کام کئے جاؤ۔اسی کو عارف شیرازی دوسرے صاف عنوان سے فرماتے ہیں:

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　　　کہ حیف باشد از وغیر او تمنائے

(فراق و وصل کیا ہوئے رضائے الٰہی طلب کرو اس لئے کہ اس کے سوا کوئی طلب باعث صد افسوس ہے)

فراق اور وصل دونوں کی نفی کر کے رضا کو مطلوب فرماتے ہیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ وصال حقیقی مراد نہیں۔ وہ تو عین رضا، نہ کہ مقابل رضا کا۔ اسی طرح فراق حقیقی مراد نہیں۔ وہ تو منافی رضا کا ہے نہ کہ ممکن الاجتماع رضا کے ساتھ۔ بلکہ وصال و فراق مزعوم یعنی تم جس کو فراق یا وصل سمجھے ہوئے ہو۔ اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ تم اپنی نظر رضا پر رکھو۔ باقی حقیقی وصال اور رضا تو ملازم کا علاقہ ہے۔ یعنی رضا مستلزم ہے وصال کو یا یوں کہو کہ وصال مستلزم ہے رضا کو وصال میسر ہو تب بھی مطلوب حاصل رضا میسر ہو جب بھی مدعا حاصل اسی کو کہتے ہیں کہ:

سخت اگر مدد کند دامنش آدرم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(بخت اگر مدد کرے تو میں اس کا دامن پکڑ لوں اگر وہ مجھے اپنی طرف کھینچ لے تو باعث صد مسرت ہے اور اگر میں اسکو اپنی طرف کھینچ لوں تب بھی باعث صد خوشی ہے)

یعنی خواہ یہ لازم ہو اس کو یا وہ لازم ہو اس کو دونوں طرح مطلب حاصل ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وصال بلا رضا ہو جائے۔ جب یہ ہے تو پھر اس کے کوئی معنی ہی نہیں۔ کہ رضا کو طلب کرو اور وصال کے طالب مت بنو۔ تو اس سے صاف معلوم ہوا کہ وصال دو قسم پر ہے۔ ایک وصال مزعوم اور ایک واقعی نفی وصال مزعوم کی ہے اور طلب وصال واقعی کی۔ اب میں اس کے مصداق کی تعیین کرتا ہوں۔ اس لئے کہ اس غلطی میں سالکین بکثرت مبتلا ہیں۔ وہ وصال مزعوم بسط ہے اور فراق مزعوم قبض ہے جب قبض ہوتا ہے تو سالک کو بڑی تنگی ہوتی ہے اور اس کو یہ متوہم ہوتا ہے کہ میں مردود ہو گیا اور یہ کم و بیش سب کو پیش آتا ہے۔ الا ماشاء اللہ تو فراق سے یہ قبض مراد ہے اور وصل سے اس کا مقابل بسط اور یہاں قبض و بسط اصطلاحی مراد ہے نہ کہ لغوی۔ یعنی واردات واحوال کا فیضان وفقدان۔

پس عارف شیرازی اس کے متعلق تسلی فرماتے ہیں کہ قبض و بسط کیا چیز ہے جس کو تم فراق و وصل سمجھ رہے ہو اور اس کے پیچھے پڑے ہو تمہارا کام تحصیل رضائے حق ہے۔ اسی کے طالب بنو اور یہی معنی ہیں۔ یا بم اور ایا نہ یا بم کے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جستجو

میکنم کے بعد نیا بم کا احتمال رہے۔ حالانکہ حدیث میں ہے:

من تقرب اِلَیَّ شبراً تقربت الیه ذرا عا الحدیث (مسند احمد ۲:۴۱۳،۴:۴۰)

(جس نے میری طرف ایک بالشت قرب حاصل کیا میں اس کی طرف ایک ہاتھ قرب کیلئے آگے ہوتا ہوں)

خلاصہ یہ ہوا کہ صوفیاء کے نزدیک تسلیم ورضا روح سلوک ہے اور جتنے عقبات اس طرق میں پیش آتے ہیں اس میں بڑے حصہ کا حل یہی رضا ہے اور اسی کا تتمہ یہ ہے۔ کہ غیر اختیاری امور کے پیچھے نہ پڑے۔ یہ دونوں باتیں اگر سمجھ میں آ جائیں تو پھر کبھی پریشانی نہ ہوگی اور میں نے صوفیاء کا یہ قول کہ ثمرات کا مرتکب ہونا مقصود نہیں ہے، مقصود رضا ہے اپنے مضمون کی تائید میں پیش کر دیا۔ ورنہ یہ مضمون قرآن کی آیات میں موجود ہے۔ کہ تبلیغ میں ثمرہ مقصود نہیں۔ اصل مقصود رضا ہے۔ جس کا طریق عمل وسعی ہے۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو کجی سے بچاوے اور فہم سلیم وتوفیق عمل عطا فرماوے۔ آمین۔

و صلی اللّٰه تعالی وسلم علیٰ خیر خلقه سیدنا و مولانا محمد و علیٰ اٰله و اصحابه و اجمعین. واخر دعوانا ان الحمد للّٰه رب العلمین.

التواصی بالحق

اللہ تعالیٰ نے جس طرح ایمان وعمل صالح پر خسارہ سے بچنے کو موقوف کیا ہے۔ اسی طرح تواصی بالحق پر بھی موقوف کیا ہے۔ جس کے معنی ہیں ایک دوسرے کو دین کی نصیحت کرنا۔ دوسروں کو دین کی تبلیغ کرنا۔ پس آج کل جو فتنہ ارتداد پھیل رہا ہے اس کے متعلق حق تعالیٰ کا ہم کو تبلیغ کا حکم ہے۔ کہ ان مسلمانوں کو جو فتنہ ارتداد میں پھنسنے والے ہیں، یا ان پر اس کا خطرہ ہے، ان کو اسلام کی تبلیغ کریں۔ اسلام کے محاسن سے ان کو مطلع کریں اور اس طرح ان کو ارتداد سے بچائیں............... تبلیغ ہمارے اوپر فرض ہے۔ اصولاً بھی، فروعاً بھی............ اس کا فرض ہونا تو اسی سے معلوم ہو گیا۔ کہ حق تعالیٰ نے جس طرح ہم کو ایمان وعمل صالح کا امر فرمایا ہے۔ اسی طرح تواصی بالحق کا بھی امر فرمایا ہے اور اس مجموعہ پر خسارہ سے بچنے کو موقوف فرمایا ہے۔

(از حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

☆...... یہ وعظ پانچ شوال ۱۳۴۱ھ کی شب کو مظفر نگر بر مکان حافظ سخاوت علی صاحب سوداگر 3 گھنٹے تک کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔

☆...... سامعین کی تعداد آٹھ سو تھی۔

☆...... حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے قلمبند فرمایا۔

☆...... مستورات کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا وخطبہ

الحمدللّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ ط و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ للّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہٗ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ وبارک وسلم.

امابعد:۔ فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ.

(قسم ہے زمانہ کی (جس میں نفع ونقصان واقع ہوتا ہے) کہ انسان (بوجہ تضیع عمر کے) بڑے خسارے میں ہیں مگر جولوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے (کہ یہ کمال ہے) اور ایک دوسرے کو (اعتقاد) حق پر (قائم رہنے کی) فرمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو (اعمال کی) پابندی کی فہمائش کرتے رہے)

تمہید

یہ ایک مختصر سی سورت ہے۔اس میں حق تعالیٰ نے مثل دوسری سورتوں کے اور آیات کے ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے۔

اور میں نے مثل دوسری آیات وسورتوں کے جو کہا ہے یہ اس لئے تا کہ کوئی شخص تخصیص تلاوت سے یہ نہ سمجھ جائے۔ کہ اور آیات ضروری اور مفید مضامین پر مشتمل نہیں۔ سو تخصیص تلاوت کی یہ وجہ نہیں۔ کیوں کہ کوئی سورت اور کوئی آیت اور کوئی حدیث ضروری اور

مفید مضمون سے خالی نہیں۔ بلکہ وجہ تخصیص کی یہ ہے کہ ضروری اور مفید تو سب ہیں مگر ضرورت اور فوائد کی انواع مختلف ہیں۔ کسی آیت وحدیث میں ایک نوع کی ضرورت ہے۔ کسی میں دوسری نوع کی اور ان انواع میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس وقت اس نوع کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے اور دوسرے وقت دوسری نوع کا اہتمام ہوتا ہے۔ جیسے طب کے اندر نسخے بہت ہیں اور سبھی مفید وضروری ہیں۔ بے کار وفضول کوئی نہیں۔ مگر طبیب ان میں سے ایک کو ترجیح دیتا ہے۔ نہ اس لئے کہ اور فضول ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اس وقت یہی زیادہ مناسب وموافق ہے اور اس لئے دوسروں سے وہ زیادہ قابل اہتمام ہے۔ رہا یہ کہ کسی خاص وقت میں کسی خاص نوع کا اہتمام زیادہ ہے۔ سو اس کا فیصلہ مصلح کی رائے پر ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے کے نزدیک اس وقت کسی دوسری نوع کو ترجیح ہو۔ مگر یہ اختلاف اجتہادی مضر نہیں۔

وجہ ترجیح مضمون

اب سنیئے کہ میں نے اس وقت اس مضمون کو اختیار میں کیوں ترجیح دی۔ بات یہ ہے۔ کہ اس وقت ایک خاص حالت پیش آرہی ہے۔ جس کی وجہ سے اس مضمون کو اختیار کرنا ضروری ہوا۔ وہ حالت یہ ہے۔ کہ آج کل بعض اعداء دین[1] نے ایک کارروائی اختیار کر رکھی ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے زمانہ سابق کے کفار کا حال بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

وَدُّوْ لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً.

کہ یہ کفار یوں چاہتے ہیں کہ جیسے وہ خود کافر ہیں۔ اسی طرح تم بھی کافر بن جاؤ تاکہ سب برابر (یکساں حالت میں) ہو جائیں۔ اسی طرح آج کل بعض اعداء دین نے یہ کوشش جاری کی ہے۔ کہ مسلمانوں کو کافر بنایا جائے تاکہ سب ایک حالت میں ہو جائیں اور گو ایک حالت میں ہو جانے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ سب مسلمان ہو جاتے مگر کسی کوزہ پشت سے کسی نے پوچھا تھا۔ کہ آیا تو چاہتا ہے۔ کہ تیری کمر سیدھی ہو جائے یا یہ کہ

---

[1] مراد تحریک شدھی ہے۔ جو آریہ کی طرف سے شروع ہوئی۔ ۱۲ظ

اوروں کی بھی کبڑی ہو جاوے۔ کہا میں تو یہ چاہتا ہوں کہ سب کبڑے ہو جائیں:

شور بختاں بآرزو خواہند　　　مقبلاں راز وال نعمت وجاہ

(بدنصیب یہی چاہتے ہیں کہ مقبولوں کو زوال نعمت وجاہ ہو)

منحوس یہی چاہتا ہے۔ کہ میری طرح سب منحوس ہو جائیں۔ وہ دوسروں کی ترقی کو دیکھ کر جلتا ہے اور حسد کرتا ہے اور یوں چاہتا ہے۔ کہ ان کے پاس یہ دولت نہ رہے۔ چاہے مجھ کو بھی نہ ملے۔

ہر چند کہ اس مضمون کی ضرورت ہمیشہ سے تھی مگر اس وقت اس لئے اور زیادہ ضروری ہو گیا کہ اس وقت دوسری طرف سے خاص سعی ہو رہی ہے اور ممکن تھا۔ کہ اس مضمون کو کسی دوسرے جلسہ میں اختیار کیا جاتا۔ مگر اس وقت مجھے یاد آ گیا کہ رمضان سے پہلے میں یہاں آیا تھا اور اس وقت مجھ سے اس کے متعلق بیان کی درخواست کی گئی تھی اور میں نے اس کا وعدہ کیا تھا اس کے بعد حاضری کی نوبت ابھی آئی ہے۔ اس لئے میں نے اس جلسہ میں اس کو اختیار کیا۔ بہر حال مضمون کی حقیقت تو معلوم ہوگئی ہوگی اور اسی کے واسطے میں نے اس سورت کو اختیار کیا ہے۔ پس اس سورت کے مقصود کو انوکھا مضمون نہ سمجھا جائے اور نہ وہ فی نفسہٖ انوکھا ہے۔ بلکہ ایسا مضمون ہے۔ جس کو اسلام نے ابتداء سے ضروری بتلایا ہے۔ مگر ہاں ایک وجہ سے انوکھا ہو گیا اور اسی وجہ سے وہ قابل تنبیہ ہے۔ یعنی غفلت کی وجہ سے کہ ہم کو عرصہ سے اس کی طرف توجہ والتفات نہیں تھا۔ اس لئے وہ ذہن میں مستحضر تھا اور اس عارض سے کوئی مضمون نیا اور انوکھا ہو جاتا ہے۔ ورنہ جس قدر مضامین حقہ ہیں ان میں نیا اور انوکھا کوئی نہیں۔ بلکہ سب پرانے ہی مضامین ہیں۔ جو تیرہ سو برس[1] پہلے تئیس سال کے اندر اندر نازل ہو چکے ہیں اور تئیس سال کی مدت ایک مختصر مدت ہے۔ اس قلیل زمانہ میں نزول ہونا گویا سب احکام کا ساتھ ہی نزول ہے۔

جدت مضمون

غرض تیرہ سو برس پہلے سب احکام نازل ہو چکے ہیں۔ تو اب کوئی مضمون فی نفسہٖ نیا

---

[1] بحذف کسر۔۱۲

نہیں۔ البتہ غفلت اور عدم استحضار کی وجہ سے ان میں بعضے نئے اور انوکھے معلوم ہوتے ہیں اور سلامتی کی بات بھی یہی ہے کہ نیا مضمون بیان نہ کیا جائے۔ کیوں کہ اب نیا وہ ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہ ہوا ہو۔ نہ حقیقۃً نہ حکماً۔ بلکہ محض رائے سے گھڑا گیا ہو۔ اور یہی تو بدعت ہے۔ جو قابل ترک ہے۔

حسن مضمون

یہ میں نے اس لئے کہا کہ بعض لوگ نئے مضامین کے مشتاق ہوا کرتے ہیں۔ سو خوب سمجھ لیجئے۔ کہ جو مضمون وجود اور وقوع کے اعتبار سے نیا ہو وہ قابل ترک ہے اور جو استحضار کے اعتبار سے نیا ہو کہ اب تک اس کی طرف سے غفلت تھی۔ وہ البتہ قابل اشتیاق ہے۔

اور اس تفصیل سے قطع نظر کر کے یہ مضمون ایک اور اعتبار سے بھی نیا ہے۔ بلکہ اس جہت سے سب احکام نئے ہیں۔ وہ یہ کہ حدیث میں قرآن کی نسبت آیا ہے:۔

لا یخلق عن کثرۃ الرد

کہ قرآن بار بار تکرار کرنے سے پرانا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں ہر دفعہ نیا لطف آتا ہے۔ جیسے بعض محبوبوں کے دقائق حسن روزانہ نئے نئے مدرک ہوتے ہیں۔

شاعر کہتا ہے۔

یزیدک وجهه حسنا اذا ما زدته نظرا (جتنا غور سے بار بار دیکھو گے اتنا حسن اور زیادہ محسوس ہوگا)

یہی وجہ ہے کہ وصال کے بعد بھی ایسے محبوب کے عاشق کو چین نصیب نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ہمیشہ حسن کے نئے نئے شعبے مدرک ہوتے جاتے ہیں اور عاشق کو بے چین کرتے ہیں۔ یہی حالت ہے قرآن کی اولاً اور حدیث کی ثانیاً کہ اس کے حسن کا ادراک ایک دم سے نہیں ہوتا۔ بلکہ جس قدر تکرار کرو اسی قدر لطف بڑھتا ہے۔

هو المسک ما کررته یتضوع

بس وہ حال ہے:

داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار ... گلچیں بہار تو زداماں گلہ دارد

(نگاہ دامن تنگ ہیں اور تیرے پھول کثرت سے ہیں اس لئے تیری بہار کا گل حسن چیں اپنے دامن کی تنگی کا گلہ رکھتا ہے کہ اس کو تنگ دامن کیوں ملا)

حضرت شیخ شیرازی اسی کو فرماتے ہیں:

دل آرام در بر دلآرام جوئے | لب از تشنگی خشک و بر طرف جوئے
نگویم کہ برآب قادر نیند | کہ بر ساحل نیل مستسقیند

(محبوب سے ہمکنار اور محبوب کی تلاش، پیاس سے ہونٹ خشک اور لب دریا سیرابی کے طلب گار) (حسن اسی ناز و خرام اور کرشمہ کا نام نہیں ہے حسینوں کی بہت سی ادائیں ایسی ہیں جن کا نام نہیں ہے)

صاحبو! جب بعض لوگوں نے محبوبان مجازی کی نسبت عدم احاطہ حسن کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست | بسیار شیوہ ہاست بتارا کہ نام نیست

کہ بعض اداؤں کی لفظوں سے تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ وہ وجدانی امور ہیں۔ جن کو عاشق کا دل ہی سمجھتا ہے۔ تو اب محبوب حقیقی کے حسن کے متعلق خود ہی انصاف کر لیجئے کہ اس کے غیر متناہی حسن کا ادراک ایک دم سے کیوں کر ہو سکتا ہے۔

صاحبو! قرآن وحدیث کے علوم کا جو کہ محبوب کا ایک حسن ہے۔ سچ مچ یہی حال ہے کہ ان کی انتہا نہیں۔ اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری عبارت میں اس کو صاف طور پر ارشاد فرمایا ہے:

ولا تنقضی عجائبہ

کہ قرآن کے عجائب ختم نہیں ہو سکتے اور یہی حال حدیث کا ہے۔ مگر قرآن کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ پس یہ عجیب بات ہے۔ کہ قرآن وحدیث باوجود کہنگی کے تازگی لئے ہوئے ہیں۔

پس یہ سن کر گھبرایا نہ جائے۔ کہ مضمون تو پرانا ہے۔ خصوص و العصر کہ یہ تو ہم ہر روز پڑھتے ہیں۔ خصوصاً خدا تعالیٰ سلامت رکھے اختصار پسندوں کو کہ انہوں نے اختصار کی وجہ سے اسی سورت کو نماز میں قراءت کے لئے اختیار کر رکھا ہے۔ ان لوگوں نے تین سورتیں چھانٹ رکھی ہیں۔ **والعصر۔ انا اعطینک** اور **قل ھو اللہ احد**۔ بس سب نمازیں انہی سے پوری کر لیتے ہیں۔ یہ تو لفظی حیثیت سے اس مضمون کا پرانا ہونا تھا اور

معنوی حیثیت سے اس لئے کہ مسلمانوں کو قرآن کے الفاظ سے خاص انس ہے جس کی وجہ سے الفاظ کے ساتھ معنی بھی کچھ کچھ ذہن میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ سورہ والعصر میں عصر کے معنی زمانہ سب جانتے ہیں۔ ہاں واؤ قسمیہ کے معنی بتلانا پڑیں گے۔ کیونکہ اس کے معنی شاید معلوم نہ ہوں۔ مگر اس کی زیادہ ضرورت بھی نہیں۔ اس کے بعد ان الانسان لفی خسر میں انسان کے معنی سب کو معلوم ہیں۔ فی کے معنی اندر خسر کو بھی سب جانتے ہیں کیونکہ خسارہ محاورہ میں مستعمل ہے۔ الا کے معنی استثناء کے ہیں۔ لا اله الا الله سب بولتے ہیں۔ تو اس کے معنی بھی مخفی نہیں۔ الذین امنوا کوئی نئی بات نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو یاایھا الذین امنوا سے خطاب کیا جاتا ہے۔ تو الذین امنو کے معنی مسلمان ہوئے۔ و عملوا الصلحت میں عمل صالح کا ذکر ہے۔ یہ بھی محاورہ میں بولا جاتا ہے۔ آگے و تو اصو کے معنی شاید معلوم نہ ہوں مگر وصیت کو تو سب سمجھتے ہیں اور بولتے ہیں۔ حق اور صبر کو سب جانتے ہیں۔ تو اس کے معنی بھی نئے نہیں۔

ناقص کمال پر فخر

اس پر شاید آپ یہ کہیں۔ کہ جب کوئی نئی بات نہیں۔ تو ہم بھی مولوی ہو گئے۔ میں کہتا ہوں ہاں۔ مگر ایسے مولوی ہوئے جیسے ایک گاؤں والے کے سر میں درد ہوا۔ وہ گاؤں ہی میں ایک جھاڑنے والے کے پاس گیا۔ اس نے یہ کہہ کر جھاڑا۔ کل بلاھت (یہ قل ھو الله احد کو بگاڑا)۔ تو وہ درد والا کہتا ہے۔ کہ جا ساڑے کے ساڑے (یعنی سالے) توں تو (یعنی تُو تو) ہانچ ہی ہو گیا (یعنی حافظ ہی ہو گیا) تو جیسے وہ گاؤں والا حافظ تھا۔ ویسے ہی آپ بھی مولوی ہو گئے اور جو لوگ قرآن کا ترجمہ دیکھ لیتے ہیں۔ وہ تو شاید اپنے کو پورا ہی مولوی سمجھتے ہوں۔ مگر یہ ان کی غلطی ہے۔ ہم لوگ اپنے ناقص کمال پر مغرور ہو جاتے ہیں اور اس کو کمال سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ کمال کچھ اور ہی چیز ہے۔

صائب کہتا ہے:

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا   عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اپنا موتی کسی باکمال کو دکھلا لو کیونکہ چند گدھوں کی تصدیق سے تم عیسیٰ نہیں ہو سکتے)
کسی پرکھنے والے کو اپنا جوہر دکھلاؤ۔ تو وہ بتلائے گا۔ کہ یہ جوہر ہے یا کانچ ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند　　نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک تر زمو اینجاست　　نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(جو شخص اپنے چہرہ کو روشن کرے ضروری نہیں کہ وہ عاشقی بھی جانتا ہو اور جو شخص آئینہ بناتا ہو ضروری نہیں کہ وہ سکندری بھی جانتا ہو، اس میں ہزاروں بال سے زیادہ باریک نکات ہیں ہر وہ شخص جو سر منڈاتا ہو ضروری نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو)

لکھنوء میں ایک مدنی قاری آئے تھے۔ جو بے نظیر قرآن پڑھتے تھے۔ لوگوں نے ایک لڑکے سے ان کی قراءت کی نقل کرائی۔ چند روز میں وہ بھی انہی کی طرح اتار چڑھاؤ کرنے لگا اور بالکل ان کے لہجہ سے لہجہ مل گیا۔ تو جاہلوں کی نظر میں وہ بھی قاری ہو گیا۔ جاہلوں کو مخارج حروف اور دقائق قراءت کی کیا خبر۔ وہ تو صرف آواز اور لہجہ کو دیکھتے ہیں۔ تو یہ لوگ اس لڑکے کو مدنی قاری کے پاس لے گئے اور عرض کیا حضور! اس نے بھی کچھ آپ کا اتباع کیا ہے۔ ذرا اس کا قرآن سن لیجئے۔ انہوں نے سنا اور سن کر خاموش ہو رہے۔ لوگ تعریف کے منتظر تھے۔ جب قاری صاحب نے خود تعریف نہ کی۔ تو انہوں نے پوچھا۔ کہ حضور! اس نے کیسا پڑھا۔ فرمایا۔ اس نے ایسا پڑھا۔ جیسا ہم نے ایک اردو نعت نامہ بنایا ہے۔

الخیار ککری۔ العنکبوت ککری۔ الحطب ککری۔

کامل اور ناقص کا فرق

واقعی جیسے عرب والے اردو غلط بولتے ہیں۔ ایسے ہی ہم عربی غلط بولتے ہیں اور قرآن تو بہت ہی غلط پڑھتے ہیں۔ مولانا قاری رحمت اللہ صاحب سے ایک عرب نے کہا تھا۔ کہ اہل ہند قرآن غلط پڑھتے ہیں۔ فرمایا کہ جیسے اہل عرب اردو غلط بولتے ہیں۔ وہ عرب اردو زبان جانتا تھا۔ اس نے کہا بالکل غلط ہے۔ ہم تو اردو صحیح بولتے ہیں۔ فرمایا اچھا کہو ٹوٹھٹھا۔ تو وہ کہتے ہیں تو تتا۔ فرمایا یہ اردو نہیں ہے۔ تو جیسے ان عرب کو اپنی اردو دانی پر ناز تھا۔ اسی طرح

لکھنؤ والوں کو اس لڑکے کی قراءت پر ناز تھا۔ کہ یہ بھی قاری ہوگیا۔ حالانکہ اس کی قراءت ایسی تھی۔ جیسے ایک بندر نے حجام کا استرہ اٹھا کر یہ سمجھ لیا تھا کہ میں بھی نائی ہوں۔ حجام نے دوسرا استرہ نکال کر الٹی طرف سے اپنی ناک پر پھیرا۔ تو بندر نے بھی استرہ اپنی ناک پر چلا دیا۔ مگر سیدھی طرف سے انجام یہ ہوا کہ ناک اڑگئی اور استرہ پھینک کر بھاگا۔

اسی کو مثل میں کہا گیا ہے۔

آنچہ مردم می کند بوزینہ ہم

کہ جو کام آدمی کرتا ہے۔ بندر بھی اس کو نقل کرتا ہے۔ اسی طرح اس لڑکے نے قاری صاحب کی نقل کی تھی۔ آج کل نقل کا بازار بہت گرم ہے۔ لوگ حکیموں کی نقل کر کے حکیم بن بیٹھے ہیں اور جہلاء ان کے معتقد ہیں۔

چنانچہ حکیم محمود خاں دہلوی کے والد یا دادا سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضور آپ بھی علاج کرتے ہیں۔ نسخہ لکھتے ہیں اور فلاں پنساری بھی علاج کرتا ہے۔ آپ کے ہاتھ سے بھی لوگ اچھے ہوتے ہیں اور بعض مر جاتے ہیں۔ اس کے ہاتھ سے بھی بہت سے اچھے ہوتے ہیں اور بعض مر جاتے ہیں۔ تو آپ میں اور اس میں کیا فرق ہوا۔ انہوں نے اس کا نہایت مہذب جواب دیا کہ مجھ میں اور اس میں فرق یہ ہے۔ کہ مجھ سے آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا۔ کیوں کہ میں فن سے واقف ہونے کے بعد علاج کر رہا ہوں اور اس سے مواخذہ ہوگا۔ کیوں کہ وہ ناواقف ہو کر پیش قدمی کر رہا ہے۔ رہی شفاء و موت یہ خدا کے قبضہ میں ہے۔ نہ میرے اور نہ اس کے۔ اس پر مواخذہ کا مدار نہیں۔

ناقص کے لئے کامل کی احتیاج

بس یہی فرق ہے پورے عالم میں اور اس شخص میں جو محض ترجمہ قرآن دیکھ کر مسائل کا فیصلہ کرتا ہے۔ پس صرف ترجمہ دانی سے کوئی اپنے کو علماء سے مستغنی نہ سمجھے۔ جیسا کہ آج کل بہت لوگ ترجمہ دیکھ کر اپنے کو مجتہد سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ دو چار نسخے یاد کر کے کوئی شخص طبیب سے مستغنی نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی ایسا سمجھے تو اس کو مالیخولیا ہے اور اب تو اسکو طبیب کی

ضرورت پہلے سے زیادہ ہے کیونکہ پاگلوں کو طبیب کی زیادہ احتیاج ہے۔

ہمارے اکابر میں سے ایک بزرگ بہاول پور تشریف لے گئے اور وہاں ایک اندھے حافظ صاحب کو قرآن کا پورا ترجمہ یاد تھا اور اس میں ان کو دعویٰ کمال تھا۔ ان بزرگ نے ان سے پوچھا کہ حافظ صاحب مدھامتٰن کا ترجمہ کیا ہے۔ کہا بہت سبز۔ فرمایا کہ اس میں بہت کس لفظ کے معنی ہیں اور سبز کس لفظ کے۔ تو وہ کہتے ہیں۔ کہ مد کے معنی بہت اور ھامتٰن کے معنی سبز ہیں۔ اس جواب پر سب اہل علم ہنس پڑے۔ مجھے پھر صائب کا قول یاد آیا:

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اپنا موتی کسی صاحب نظر کو دکھلا دو کیونکہ چند احمقوں کی تصدیق سے تم عیسیٰ نہیں ہو سکتے)

ورنہ وہ مثال ہوگی جو ایک دیہاتی آنریری مجسٹریٹ کی ہوئی۔ جو واقع میں اناڑی تھا۔ مگر مالدار ہونے کی وجہ سے اس کو آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا تھا اب جو اس کے پاس مقدمات آئے تو بڑی فکر ہوئی۔ کہ فیصلہ کیوں کر کروں۔ تو وہ اپنے اجلاس سے اٹھ کر ایک دوسرے آنریری مجسٹریٹ کے اجلاس میں گیا کہ دیکھوں وہ کس طرح فیصلہ کرتا ہے۔ اتفاق سے اس وقت اس کے سامنے دو درخواستیں پیش کی گئیں۔ ایک کو اس نے سن کر کہا کہ منظور۔ دوسری کو سن کر کہا نامنظور۔ بس اناڑی صاحب یہ دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہ فیصلہ کرنا تو بہت آسان ہے۔ کہ جو ایک درخواست کو منجور اور دوسری کو نا منجور۔ ظالم نے منجور نا منجور یاد کر کے فیصلے کرنا شروع کر دیئے۔

صاحبو! خوب یاد رکھیئے۔ کہ ہر ناقص کو کامل سے رجوع کرنے کی احتیاج ہے اور ہر غیر ماہر کو ماہر کی احتیاج ہے۔ اگر ہم مولوی لوگ محکمہ زراعت میں دخل دینے لگیں۔ تو واقعی ہم سارے محکمہ کا ناس کر دیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی جج اور مجسٹریٹ چندروز کسی عالم کے پاس رہ کر دیکھے۔ تو اس کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ دین میں بالکل جاہل ہے۔ اس کو مسائل و احکام میں دخل دینے کا حق نہیں۔ یہ کام علماء ہی کا ہے۔

مجھے خوب یاد ہے۔ کہ ایک مرتبہ میں نے ایک کتاب قانون کی اردو میں دیکھ کر ایک وکیل کے روبرو اس کی ایک دفعہ کی تقریر کی۔ تو وکیل نے میری تقریر سن کر کہا۔ کہ یہ غلط ہے۔ پھر اس نے خود تقریر کی۔ تو مجھے معلوم ہوا۔ کہ واقعی میں نے غلطی کی تھی۔ تو جب قانون کی

کتاب کا اردو میں ترجمہ ہو جانا ہم کو وکلاء سے مستغنی نہیں کرتا اور اس کے سمجھنے میں ہم غلطی کرتے ہیں۔ تو قرآن کا ترجمہ ہو جانے سے علماء سے آپ کیوں کر مستغنی ہو سکتے ہیں اور آپ کو کیا اطمینان ہے۔ کہ آپ غلطی نہ کریں گے۔ اردو میں ترجمہ ہو جانے سے زبان کی دقت تو نہ رہی۔ مگر معانی تو آسان نہیں ہوئے۔

بربادیٔ شریعت کے ذمہ دار

چنانچہ ایک ملاجی میرے پاس مترجم قرآن لائے۔ (جس کو عام لوگ مترجم کہتے ہیں۔ جیسے میرے ایک عزیز دیوان متنبی کو دیوان متنبی کہتے تھے) وہ ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا تھا۔ جس میں محاورہ کی زیادہ رعایت کی گئی ہے۔ اس میں فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ کا یوں کیا گیا ہے۔ کہ دھوؤ اپنے مونہوں کو اور ہاتھوں کو اور ملو اپنے سروں کو اور اپنے پیروں کو۔ جس میں لفظ پیروں کو واقع میں مونہوں اور ہاتھوں کے ساتھ لگتا ہے۔ جو کہ وہ ہے نہ کہ اس فقرہ سے کہ "ملو اپنے سروں کو" جو کہ نزدیک ہے۔ مگر وہ ملاجی قریب کے سبب یہی سمجھے کہ یہ قریب سے متصل ہے۔ تو اب وہ ترجمہ دکھلا کر مجھ سے پوچھنے لگے۔ کہ قرآن سے تو پاؤں کو مسح ثابت ہوتا ہے۔ میں بڑا گھبرایا کہ اس جاہل کو کیوں کر سمجھاؤں۔ یہ نہ عطف کو سمجھے نہ اعراب کو۔ تو میں نے اس سے کہا کہ ملاجی تم نے یہ کیوں کر معلوم کیا۔ کہ یہ قرآن ہے اور خدا کا کلام ہے۔ کہا علماء کے کہنے سے۔ میں نے کہا اللہ اکبر۔ علماء اس میں تو ایمان دار رہیں۔ کہ وہ ایک عربی عبارت کو قرآن کہہ دیں اور اس میں ایماندار نہیں کہ وہ پاؤں دھونے کو فرض کہیں۔ بس علماء نے فرما دیا ہے کہ پیروں کا دھونا فرض ہے مسح کرنا جائز نہیں اور نیز یہ بھی کہا ہے کہ تم جیسوں کو قرآن کا ترجمہ دیکھنا جائز نہیں۔ خبردار! جو تم نے آئندہ کبھی ترجمہ دیکھا۔ بس قرآن کی تلاوت کیا کرو۔ ترجمہ ہرگز نہ دیکھو۔

اس سے بھی بڑھ کر ہمیں ایک بڑے میاں ملے۔ جو بڑے تہجد گزار اور پابند اوراد تھے مگر قرآن کا ترجمہ دیکھ کر گمراہ ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے۔ کہ جب میں قرآن

پڑھا کروں تو لفظ راعنا چھوڑ دیا کروں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا۔

جس کا ترجمہ یہ لکھا ہے کہ اے ایمان والو! راعنا مت کہا کرو۔ تو کیا تلاوت کے وقت راعنا کو نہ پڑھا کروں۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ راعنا کو تو مت چھوڑو۔ مگر آج سے قرآن کا ترجمہ دیکھنا چھوڑ دو۔ کیوں کہ تم کو سمجھنے کی قابلیت نہیں۔

صاحبو! ایسے ہی لوگوں نے شریعت کا ناس کیا ہے۔ جو ترجمہ قرآن وحدیث کا دیکھ کر مجتہدین بن گئے ہیں۔ اب اگر ان کو کم لیاقتی کے سبب ان کے شبہات کا جواب نہ دیا جائے۔ بلکہ ان لوگوں کو ترجمہ دیکھنے سے منع کیا جائے تو بعضے یوں کہتے ہیں کہ علماء کو ہمارے سوالات کا جواب نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں کہ افسوس آپ کو سمجھنا نہیں آتا۔ جواب تو ہر سوال کا ہے۔ مگر یہ بتلاؤ کہ اس کے سمجھنے والا کون ہے:

سیرف حداد یا لوئ بن غالب　　　　مراض ولکن این للسیف ضارب

۱۲ جامع

صاحبو! آپ یہ اعتراض علماء پر نہیں کرتے۔ بلکہ خود اپنی عقل پر اعتراض کر رہے ہیں۔ مگر آپ کو خبر نہیں:

حملہ بر خود مے کنی اے سادہ مرد　　　　ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

(اے سادہ لوح تو اپنے اوپر خود حملہ کرتا ہے جس طرح اس شیر نے اپنے اوپر خود حملہ کیا تھا)

جیسے ہمارے ایک عورت عید کا چاند دیکھنے کھڑی ہوئی اور اس سے پہلے اس نے اپنے بچہ کا پاخانہ کپڑے سے پونچھا تھا۔ جس میں سے کچھ نجاست اس کی انگلی کو لگی رہ گئی۔ عورتوں کی عادت ہے۔ کہ وہ ناک پر انگلی رکھا کرتی ہیں۔ اس نے جو ناک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھا۔ تو پاخانہ کی بدبو ناک میں پہنچی۔ تو وہ کہتی ہے۔ اوئی! اب کے چاند کیسا سڑا ہوا نکلا۔ کمبخت کو اپنی انگلی کی تو خبر نہ ہوئی۔ کہ اس میں کیا لگ رہا ہے۔ چاند پر اعتراض ہوا۔ کہ سڑا ہوا نکلا ہے۔

ترجمہ بینی کا نقصان

یہی حال ان جہلاء کا ہے۔ جو علماء پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہمارے سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ ان کو اپنی عقل کی خبر نہیں۔ کہ اس میں جواب کے سمجھنے کی اہلیت نہیں۔ بھلا اگر ایک سائیں کسی کالج کے پروفیسر سے کہے کہ مجھے اقلیدس کے پہلے مقالہ کی پانچویں شکل سمجھا دو اور وہ اس کی تقریر کرے اور سائیں نہ سمجھ سکے اور کہے نہ معلوم یہ کیا بکتا ہے۔ تو بتلایئے قصور کس کا ہے۔ یقیناً سائیں کی عقل کا قصور ہے۔ مگر جاہلوں کے نزدیک تو وہ پروفیسر ہی بکتا ہے۔

جیسے ہمارے یہاں ایک دفعہ زنانہ میں وعظ ہوا۔ ایک جولاہی بھی وعظ سننے آئی۔ وہ کچھ دیر تو خاموش رہی۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کہتی ہے جانے کیا کیا بھونکے ہے۔ واقعی اس کے نزدیک تو سارا بھونکنا ہی ہوا۔ فرمایئے اس نے یہ اعتراض اپنے اوپر کیا یا وعظ پر کیا۔ اسی طرح اگر میں ان ملا جی کو علمی قاعدہ سے نہ سمجھا سکا تو قصور کس کا ہے؟۔

ان کی عقل کی تو یہ حالت تھی کہ مہتمم مسجد نے ان سے یہ کہہ رکھا تھا کہ تاریکی کے وقت پاخانہ میں چراغ رکھ دیا کرو۔ ایک دن آپ چراغ لے کر گئے تو پاخانہ میں کوئی طالب علم تھا۔ آپ سے کہتے ہیں۔ میاں مولوی صاحب آنکھیں بند کر لینا۔ میں چراغ رکھوں گا۔ جی ہاں وہ تو آپ کو کپڑا پہنے ہوئے بھی نہ دیکھیں اور آپ اس کو ننگا دیکھ لیں۔ اب ایسے کم عقل کو کوئی کس طرح سمجھائے۔ کہ **ارجلکم** (تمہارے پاؤں) کا تعلق **وجوهکم** و **ایدیکم** (تمہارے چہرے اور تمہارے ساتھ) سے ہے۔ یہ منصوب پر معطوف ہے۔ مجرور پر عطف نہیں ہے۔ جس شخص کو قواعد نحو سے کچھ بھی مس نہ ہو۔ وہ اس جواب کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ بس ایسے شخص کا جواب یہی ہے کہ تم کو جس طریقہ سے قرآن کا قرآن ہونا معلوم ہوا۔ اسی طریقہ سے اسکے احکام بھی معلوم کرو۔ تم کو خود معانی سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے کی۔ تاکہ آپ ترجمہ قرآن دیکھ کو اپنے ماہر نہ سمجھیں۔ جو لوگوں میں بڑا مرض ہے۔ اور یہ مرض اس مرض کے علاوہ ہے۔ جس کے متعلق بیان کرنے کی ضرورت درپیش ہے۔

ترجمہ سورت

اب میں اصل مقصود کی طرف عود کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ اس جگہ قسم کھا کر فرماتے ہیں۔ کہ قسم ہے زمانہ کی۔ کہ انسان ٹوٹے میں ہے (اس کی تحقیق میں عنقریب عرض کروں گا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قسم زمانہ کی کیوں کھائی ہے) آگے ارشاد ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے۔

(چونکہ اس جلسہ میں سب مخاطبین مسلمان ہیں۔ اس لئے اجمالاً اتنا کہے دیتا ہوں۔ کہ بحمد اللہ آپ پورے خسارہ سے تو بچے ہوئے ہیں۔ مگر کسی قدر خسارہ میں ابھی مبتلا ہیں۔ کیوں کہ دولت ایمان سے تو آپ بحمد اللہ مشرف ہیں اور یہی وہ چیز ہے۔ جس کے نہ ہونے سے انسان پورے خسارہ میں پڑتا ہے۔ لیکن اعمال صالحہ وغیرہ میں ابھی ہم کوتاہی کر رہے ہیں اور خسارہ سے بالکل بچنا اس پر موقوف ہے کہ ایمان کے ساتھ عمل صالح وغیرہ بھی ہو اور چونکہ خسارہ تھوڑا سا بھی برا ہے اس لئے ہم کو شش کرنا چاہیے کہ خسارہ سے بالکل بچ جائیں) تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ مگر وہ لوگ خسارہ میں نہیں ہیں۔ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے اور باہم ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہے۔ حق کے معنی ہیں سچی بات، یعنی خبر مطابق واقع۔ مگر یہاں اس سے زید قائم وغیرہ مراد نہیں۔ بلکہ خاص اخبار صحیحہ مراد ہیں۔ یعنی دین کی باتیں۔ کیونکہ قرآن دین کی کتاب ہے اس میں حق سے مراد وہ اخبار صحیحہ نہیں ہو سکتیں۔ جن کو دین سے تعلق نہ ہو۔ آگے فرماتے ہیں کہ اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے ہیں۔ آگے حق اور صبر کا فرق بتلاؤں گا۔

فرضیت تبلیغ

اس وقت اس پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ایمان و عمل صالح پر خسارہ سے بچنے کو موقوف کیا ہے۔ اسی طرح تواصی بالحق پر بھی موقوف کیا ہے۔ جس کے معنی ہیں ایک دوسرے کو دین کی نصیحت کرنا، دوسروں کو دین کی تبلیغ کرنا۔ پس آج کل جو فتنہ ارتداد پھیل رہا ہے اس کے متعلق حق تعالیٰ کا ہم کو تبلیغ کا حکم ہے کہ ان مسلمانوں کو جو فتنہ

ارتداد میں پھنسنے والے ہیں، یا ان پر اس کا خطرہ ہے۔ان کو اسلام کی تبلیغ کریں۔اسلام کے محاسن سے ان کو مطلع کریں اور اس طرح ان کو ارتداد سے بچائیں، تبلیغ ہمارے اوپر فرض ہے۔ اصولاً بھی فروعاً بھی۔ اس کا فرض ہونا تو اسی سے معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے جس طرح ہم کو ایمان و عمل صالح کا امر فرمایا ہے۔اسی طرح **تواصی بالحق** کا بھی امر فرمایا ہے اور اس مجموعہ پر خسارہ سے بچنے کو موقوف کیا ہے۔

اب اپنی غفلت کا حال دیکھئے۔ کہ ہم لوگ اس سے کس قدر غافل ہیں۔ چوبیس گھنٹہ میں کتنی دیر ہم اس کام کو کرتے ہیں اور کتنا وقت اس فریضہ کی اداء میں صرف کرتے ہیں۔ جن پر ہمارا زور نہیں۔ ان کو تو رہنے دو۔ مگر جن پر زور ہے۔ان کے ساتھ بھی تو **تواصی بالحق** کا معاملہ نہیں کیا جاتا۔

اہل وعیال کو تبلیغ

مرد گھر میں آتے ہیں۔ تو سوائے اس کے کہ کھانے پینے پر بیوی پر عتاب ہوگا یا کرتہ نہ سینے پر غصہ ہوگا۔دین کی ایک بات بھی ان سے نہ کہی جائے گی۔

پھر ان میں جو لوگ تو تعلیم یافتہ ہیں۔ وہ بے چاری شریف زادیوں کو پھوہڑ بنائیں گے اور ان کے سامنے دل خراش الفاظ میں میموں کی تعریف کی جاتی ہے اور جو مرد خود دیندار نہیں۔ میں ان کی زیادہ شکایت نہیں کرتا۔ بلکہ مجھے زیادہ شکایت دینداروں کی اور نمازیوں کی ہے۔ کہ وہ بھی اپنے گھر والوں کو دین پر متنبہ نہیں کرتے، نہ اس کی خبر رکھتے ہیں۔ کہ آج بیوی بچوں نے نماز پڑھی یا نہیں۔؟ اور کوئی کام خلاف شرع تو نہیں کیا؟ بس ان لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم کو خود اپنی اصلاح کر لینا چاہیے۔اس طرح ہم خود جنت میں پہنچ جائیں گے۔ حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔آپ سے اس امر کا بھی مواخذہ ہوگا کہ تم نے اپنے گھر والوں کو دین کے راستہ پر کیوں نہیں چلایا۔صاف ارشاد ہے کہ:

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا۔

''اے مسلمانو! تم اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو نار جہنم سے بچاؤ''۔

اور حدیث میں ہے:۔ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہٖ

(الصحیح للبخاری ۲:۶،۳:۱۹۶، ۴:۶، ۷:۳۴، ۴۱، ۹:۷۷)

کہ تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحتوں کا ذمہ دار اور نگہبان ہے۔ اس سے اس کے ماتحتوں کے متعلق باز پرس ہوگی۔ تو یہ گھر والے تمہارا پیچھا کب چھوڑنے والے ہیں۔ اگر یہ جہنم میں گئے۔ تو تم بھی وہاں ان کے ساتھ ہی رہو گے۔

تعلیم نسواں

عورتوں کے متعلق اول تو باپ کے ذمہ تعلیم فرض ہے۔ کہ ان کو دین سے باخبر کرے۔ اگر وہ جاہل رکھے۔ تو شوہر کے ذمہ فرض ہے۔ کہ وہ اپنی بیوی کو تعلیم دے۔ بتلایئے اس فرض کو کتنے شوہر ادا کرتے ہیں۔ پھر شکایت کی جاتی ہے کہ عورتیں جاہل ہیں۔ اے صاحب! تم نے خود ان کو جاہل رکھا ہے اگر تم ان کو تعلیم دیتے۔ تو وہ کیوں جاہل رہتیں۔ اور اگر کسی کو تعلیم نسواں کا اہتمام بھی ہوا تو وہ ان کو انگریزی کی تعلیم دیتے ہیں۔ چنانچہ اب عورتیں بھی ایم اے ہونے لگی ہیں۔ ان کو تاریخ اور جغرافیہ پڑھایا جاتا ہے۔ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے اور کیا اس سے تواصی بالحق کا فرض ادا ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ ان علوم سے عورتیں تو کیا۔ اگر مرد بھی جاہل رہیں تو دین کا کچھ ضرر نہیں۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس پر فخر فرماتے ہیں:

نحن امۃ امیۃ لا تکتب ولا نحسب الشھر ھکذا و ھکذا و ھکذا (مسند أحمد ۲:۱۲۲)

''کہ ہم ان پڑھ لوگ ہیں۔ ہم کتاب و حساب نہیں جانتے۔ پھر انگلیوں کے اشارہ سے بتلایا کہ مہینہ کے دن اتنے اتنے ہوتے ہیں۔ یعنی کبھی تیس۔ کبھی انتیس۔

چنانچہ حضرات صحابہؓ میں بہت سے ایسے بھی تھے۔ جن کو لکھنا تک نہیں آتا تھا۔ اپنے دستخط بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ہم کو اس پر فخر ہے کہ بایں ہمہ تمام عالم کے فصحاء۔ بلغاء و حکماء و عقلاء کو انہوں نے نیچا دکھا دیا ہے۔ کیوں کہ دین کا علم ان کو پوری طرح حاصل تھا۔ آج جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے اور جس پر ہم تمام دنیا کو دعوت دیتے ہیں۔ کہ کوئی ایسی تعلیم

مقابلہ میں لائے۔ جیسی قرآن کی تعلیم ہے۔ کہ آج ایک ادنیٰ طالب علم دعویٰ کر سکتا ہے۔ کہ تمام عالم قرآن کی بلاغت وحکمت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بس یہی علم تھا۔ کہ جو صحابہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھا اور وہ بھی محض زبانی تھا۔ جو لکھنے پڑھنے سے حاصل نہ ہوا تھا۔ بلکہ محض سننے سنانے سے حاصل کیا گیا تھا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے اور اس زبانی علم ہی سے ان کا عقل وفہم اس قدر عالی ہو گیا تھا کہ امام ابو حنیفہ جو فقہ ومعانی کے امام ہیں فرماتے ہیں کہ صحابی کی تقلید واجب ہے۔ میں قول صحابی کے سامنے قیاس کو ترک کر دوں گا۔

ولنعم ما قال اکبر حسین الہ آبادی:

درفشانی نے تیرے قطروں کو دریا کر دیا — دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی ہو گئے — کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

(۱۲ جامع)

غرض محض زبانی تعلیم سے بھی اس فرض کی ذمہ داری ادا ہو جاتی ہے، گو کتابت وتعلیم بھی ایک درجہ میں ضروری ہو۔ مگر تاریخ وجغرافیہ کی تعلیم عورتوں کو دینا تو بالکل ہی فضول بلکہ مضر ہے۔ ان کو تو صرف دین کی تعلیم دینا چاہیے۔ شوہر صاحب بیوی میں عیب تو نکالتے رہتے ہیں۔ مگر وہ اس کی تعلیم کا تو اہتمام کریں۔

میں بقسم کہتا ہوں کہ عورتوں کو دین کی تعلیم دے کر دیکھو۔ کہ اس سے ان میں عقل وفہم و سلیقہ وانتظام دنیا کا بھی کس قدر پیدا ہوتا ہے۔ جن عورتوں کو دین کی تعلیم حاصل ہے۔ عقل و فہم میں ان کا مقابلہ وہ عورتیں کبھی نہیں کر سکتیں۔ جو ایم اے میمیں ہو رہی ہیں۔ ہاں بے حیائی میں وہ ان سے ضرور بڑھ جائیں گی اور باتیں بتانے میں انگریزی پڑھنے والیاں شاید بڑھ جائیں مگر عقل کی بات دیندار عورتوں ہی کی زبان سے زیادہ نکلے گی اور تعلیم دین کی آسان ترکیب یہ ہے کہ اگر عورتیں لکھ پڑھ نہ سکیں تو ان کو روزانہ دو چار مسئلے ان کی ضرورت کے بتلا دیا کریں اور کوئی کتاب عقائد کی اور موعظ ونصائح کی اور حکایات صلحاء کی ان کو سنا دیا کریں۔ ان شاء اللہ چند روز میں بدوں لکھے پڑھے ہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گی۔

غرض جن پر ہمارا اثر ہے۔ ان کو بھی تو آج کل خطاب نہیں کیا جاتا۔ پھر جن پر اثر نہیں ہے۔ ان کو تو کیا خاک تبلیغ کریں گے۔

ترک تبلیغ

شاید بعض لوگ یہ کہیں کہ ہم تو وعظ کہتے رہتے ہیں۔ تو تبلیغ ہوگئی جیسے مثلاً میں ہی وعظ کہہ رہا ہوں۔ سو میں وعظ کی حقیقت کو خوب جانتا ہوں۔ خود کوئی کسی جگہ جا کر وعظ نہیں کہتا۔ بلکہ اول ان سے درخواست کی جاتی ہے جس پر یہ سو بہانے کرتے ہیں۔ نخرے کرتے ہیں۔ کہ اس وقت سر میں درد ہے ناک میں درد ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ عذر خطاب طویل کے لئے تو ہو سکتا ہے۔ مگر اس میں دردسر کیا مانع ہو سکتا ہے۔ کہ کسی سے ایک دو بات کہہ دی جائے۔ بس شکایت اسی کی ہے کہ جو لوگ دیندار اور نمازی ہیں۔ جس طرح وہ نماز کو ضروری سمجھتے ہیں۔ کیا اسی درجہ میں تواصی بالحق اور تبلیغ کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ہرگز نہیں اگر کبھی نماز قضاء ہو جائے تو اس پر ندامت تو ہوتی ہے مگر ترک تواصی اور ترک تبلیغ پر ذرا ندامت نہیں ہوتی۔ انصاف سے کہیئے کیا کبھی بیوی کو نصیحت نہ کرنے پر بھی آپ کو ندامت ہوئی ہے یا کسی دوست کی وضع خلاف شریعت تھی۔ کیا اس کو نصیحت نہ کرنے پر بھی ندامت ہوئی ہے۔ کبھی نہیں۔

اور اگر کبھی اتفاقاً کسی کو نصیحت کر دیتے ہیں تو بجائے اس کے کہ اس پر شکر کریں کہ آج مدت کے بعد فرض کی ہم کو توفیق ہوئی۔ الٹا اس پر ناز کرتے ہیں۔ کہ ہم نے بڑا کام کیا۔ جیسے شب قدر کے جاگنے پر فخر ہوتا ہے مگر ظہر کی نماز پڑھ کر کوئی فخر نہیں کرتا۔ کھانا کھا کر کوئی ناز نہیں کرتا۔ پھر نصیحت کر دینے پر فخر کیوں ہے۔ راز وہی ہے کہ نماز ظہر کی تو اپنے ذمہ فرض سمجھتے ہیں اور فرض کا ادا کر دینا کچھ کمال شمار نہیں ہوتا اور تواصی بالحق کو فرض نہیں سمجھتے۔ اس کو زائد کام سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے اگر اس کی نوبت کبھی آجاتی ہے۔ تو اس پر فخر کرتے ہیں۔ اگر اس کو بھی فرض سمجھتے۔ تو اس پر فخر نہ ہوتا۔ بلکہ یہ سمجھتے کہ یہ تو ہمارے ذمہ ضروری تھا اور جس طرح نماز کے ترک پر ندامت ہوتی ہے۔ اسی طرح دو دن کو تواصی بالحق بھی ترک ہو جاتی۔ تو اس پر بھی اپنے نفس کو ملامت کی جاتی۔ مگر اس پر کوئی بھی اپنے کو ملامت نہیں کرتا۔ تو یہ تو ایسا ہوا۔ جیسے ایک آدمی عشاء کی نماز نہ پڑھے۔ صرف چار نمازیں پڑھے۔ تو یہ کوئی نمازی ہے۔ اس کو کوئی بھی نمازی نہ سمجھے گا۔ پھر آپ تبلیغ کو ترک کر کے اپنے کو دیندار کیوں کر سمجھتے ہیں۔؟ خوب سمجھ لیجئے کہ بدوں اس کے آپ دیندار نہیں ہو سکتے۔

تبلیغ صرف علماء کا کام نہیں

آج کل لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ کہ یہ تو مولویوں کے ذمہ ہے۔ سو اگر یہ کام تنہا مولویوں کے ذمہ ہے۔ تو پھر نماز روزہ کو بھی پیروں کے ذمہ سمجھو اور تم آزاد زندگی گزارو۔ جیسے بعض دیہات والوں کا خیال تھا اور شاید اب بھی کوئی موضع ایسا ہو جہاں یہ خیال ہو۔

چنانچہ ایک پیر گاؤں میں پہنچے۔ تو وہاں کا چودھری اس کو دیکھ کر کہنے لگا۔ کہ پیر توں تو (یعنی تُو تو) بہت دبلا ہو گیا۔ تیرا جی بھی اچھا ہے۔ پیر نے کہا۔ دبلا کیوں کر نہ ہوں۔ تم لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ تمہارے بدلے میں نمازیں پڑھتا ہوں۔ روزہ نہیں رکھتے۔ سب کے بدلے میں روزے رکھتا ہوں۔ اور سب سے مشکل کام یہ ہے کہ سب کی طرف سے پل صراط پر مجھے چلنا پڑتا ہے۔ جو بال سے بارک اور تلوار سے تیز ہے۔ چودھری نے کہا واہ رے (کلمہ تعجب کا ہے) تو تو بہت کام کرے ہے۔ جا میں نے تجھے مونجی کا کھیت دیا۔

پیر کو خیال ہوا۔ کہ گاؤں والوں کی بات کا کیا اعتبار۔ جلدی سے کھیت پر قبضہ کر لینا چاہیے تو چودھری سے کہا۔ کہ خان صاحب! پھر کھیت پر میرا قبضہ کرا دو۔ کہاں ہاں ہاں چل تجھے قبضہ بھی کرا دوں۔ تو وہ چودھری پیر کو ڈول ڈول لے گیا (یعنی کھیتوں کے درمیان جو پتلی پتلی مینڈ ہوتی ہے۔ اس راستہ سے لے گیا) یہ ڈول بہت پتلی ہوتی ہے۔ جس پر چلنا ہر ایک کو آسان نہیں۔ چنانچہ ایک جگہ پیر کا پیر پھسلا اور وہ کھیت کے اندر گرا۔ چودھری مرید نے پیر کی کمر میں ایک لات رسید کی۔ کہ تو تو کہے تھا کہ میں پل صراط پر چلتا ہوں۔ جو بال سے باریک، تلوار سے تیز ہے، تجھ سے ایک بالشت کی ڈول پر تو چلا نہ گیا۔ پل صراط پر کیا خاک چلتا ہو گا۔ تو جھوٹا ہے۔ جا ہم کھیت تجھے نہیں دیتے۔

تو گاؤں والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ نماز روزہ پیروں کے ذمہ ہے۔ ہمارے ذمہ کچھ نہیں۔ جیسے عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سب کی طرف سے کفارہ ہو گئے۔ اس کے بعد سونے پر سہاگہ یہ ہو گیا کہ بعض بزرگوں کو یہ منکشف ہو گیا تھا کہ تمہارے سلسلہ والے سب بخش دیئے جائیں گے۔ یہ بات ان پیرزادوں کے ہاتھ آ گئی۔ اس سے وہ مخلوق کو اور بہکاتے ہیں۔ حالانکہ اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد نماز کی

بھی ضرورت نہیں۔ روزہ کی بھی ضرورت نہیں۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی تو وعدہ ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی مغفرت کردی جائے گی۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ نماز وغیرہ کی امت کو کچھ ضرورت ہی نہیں رہی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے درخواست کی تھی کہ میں جنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مرافقت چاہتا ہوں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت اچھا:

ولکن اعنی علٰی نفسک بکثرۃ السجود (مسند احمد ۴: ۵۹)

کہ تم کو بھی اس میں کچھ سہارا لگانا چاہیے۔ اور وہ سہارا یہ ہے کہ تم نماز کی کثرت کرتے رہنا۔ یہ حدیث صاف بتلاتی ہے کہ بزرگوں کے سلسلہ سے جو نفع ہوتا ہے۔ اس میں یہ شرط ہے کہ ان بزرگ کے طریقہ پر چلتا رہے۔ بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر **تواصی بالحق** اور تبلیغ صرف علماء کے ذمہ ہے تو پھر نماز روزہ کو پیروں کے ذمہ کر کے آزاد ہو جاؤ۔ یہ علماء ہی سارا بوجھ لادنے کیلئے کیوں منتخب کیے گئے اور انہی پر لادا جائے۔

میں یہ نہیں کہتا۔ کہ اس کام میں علماء کو عوام سے امتیاز نہیں ہے۔ امتیاز ضرور ہے۔ مگر سارا کام انہی کے ذمہ نہیں ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ خطاب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خطاب عام، دوسرے خطاب خاص۔ دوسری تقسیم یہ ہے کہ ایک خطاب بالمنصوص ہے، ایک خطاب بالاجتہاد۔

پس خطاب عام بصورت وعظ تو علماء ہی کا کام ہے۔ انہی کے خطاب عام میں اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگ ان کو مقتداء سمجھتے ہیں اور عامی کو مقتداء کوئی نہیں سمجھتا۔ اس کے وعظ عام میں اثر نہیں ہوتا۔ مگر انفرادی خطاب میں علماء کی تخصیص نہیں۔ انفرادی طور پر ہر مسلمان ایک دوسرے کو نصیحت کر سکتا ہے۔ اسی طرح خطاب بالمنصوص علماء کے ساتھ خاص نہیں۔ (یعنی جو مسائل صاف صاف شریعت میں مذکور ہیں۔ ان کی تبلیغ صرف علماء سے خاص نہیں۔) ہر شخص با آواز بلند کہہ سکتا ہے۔ کہ ایمان لانا فرض ہے۔ نماز وروزہ اور زکوٰۃ و حج فرض ہے اور امور اجتہادیہ سے خطاب کرنا علماء کے ساتھ خاص ہے۔ عوام اس میں غلطی کریں گے۔ عالم کو اول تو جزئیات بہت یاد ہوں گے۔ وہ اس میں غلطی نہ کریگا۔ اور اگر جزئیات یاد بھی نہ ہوئے تو علم کی شان کے اعتبار سے اس کو **لا ادری** (کہ میں نہیں جانتا) کہنے میں عار نہ ہوگا۔ غرض ایسے امور کی تبلیغ کرنا جن کی حقیقت علماء ہی سمجھ سکتے ہیں یا خطاب عام کے ساتھ وعظ کہنا اور دین کے احکام

بیان کرنا تو علماء کے ساتھ خاص ہے۔اور انفرادی خطاب ایسے مسائل کے ساتھ جو منصوص اور مشہور ہیں۔علماء سے خاص نہیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ تو یوں فرمایا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ

کہ اے مسلمانوں! تمہارے اندر ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائیں۔یہاں تو دعوت کو ایک جماعت کے ساتھ خاص فرمایا اور اس کے بعد ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

کہ اے مسلمانو! تم بہترین امت ہو۔ جو لوگوں (کی ہدایت) کے لئے ظاہر کئے گئے ہو۔تم نیک کاموں کا حکم کرتے ہو۔ برے کاموں سے روکتے ہو۔

یہاں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو سب کے لئے عام کیا گیا ہے۔اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ایک درجہ ایسا بھی ہے۔ جو سب کے ذمہ ہے اور علماء کے ساتھ خاص نہیں۔اس کی تفصیل وہی ہے۔ جو میں نے اوپر بیان کی۔

تقسیم خدمات

ہاں اس جگہ ایک فرق اور ہے وہ یہ کہ ایک جماعت تو سارے کام چھوڑ کر صرف تبلیغ ہی کے واسطے مقرر ہونا چاہیے۔اس کا ذکر ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر میں ہے اور ایک جماعت دوسرے کاموں کے واسطے ہوگی۔فرصت و موقع کے وقت میں امر بالمعروف بھی کر لیا کرے۔اس کا ذکر دوسری آیت میں ہے۔اس کو اہل تمدن تقسیم خدمات کہتے ہیں اور کوئی قوم بدوں تقسیم خدمات کے ترقی نہیں کر سکتی۔پس علماء کے ذمہ تو تبلیغ اس شان سے ہے کہ وہ اپنے سارے اوقات میں یہی کام کریں اور دوسرے آدمی جستہ جستہ اوقات میں کبھی یہ کام کیا کریں کیونکہ اس سورۃ میں حق تعالیٰ نے تواصی بالحق و تواصی بالصبر کو خسارہ سے بچنے کی شرط قرار دیا ہے اور خسارہ سے بچنا سب کے ذمہ فرض ہے۔

عذرِ لنگ

اب اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب اگر کسی کو عذر ہو۔مثلاً ہم کسی کو نصیحت کریں اور وہ اس سے برا

مانتا، ناک منہ چڑھاتا ہے اور ہمارے درپے ایذا ہو جاتا ہے تو کیا پھر بھی امر بالمعروف کریں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے آپ امر بالمعروف شروع کردیں۔ جب کام شروع کر کے کہیں گاڑی اٹکے گی۔ اس وقت استفتاء کر لینا۔ ابھی سے اعذار کا حکم دریافت کرنے کا آپ کو حق نہیں۔ بلکہ اس وقت اعذار کا حکم دریافت کرنا۔ گویا جان بچانے کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔ سب مسلمان جانتے ہیں۔ کہ شریعت نے طاقت سے زیادہ کوئی حکم نہیں دیا۔ مگر پھر بھی اس قسم کے اعذار کو دوسرے کاموں کی بابت کوئی پیش نہیں کرتا۔ مثلاً وضو بعض دفعہ عذر سے ساقط ہو جاتی اور نماز میں قیام عذر سے ساقط ہو جاتا ہے مگر جس وقت نماز کے لئے کسی کو کہا جاتا ہے وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ پہلے مجھے یہ تو بتلا دو۔ کہ وضو اور قیام کن کن عذروں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہاں آپ نماز کے پڑھنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور عذر کو عارضی۔ اسی طرح کھانے میں بھی کسی نے طبیب سے یہ نہیں پوچھا کہ حکیم جی کھانے کے شرائط تو بتلا دو اور یہ بھی تو سمجھا دو۔ کہ کس وقت کھانا چھوڑ دیا جائے۔ کیوں کہ یہاں بھی کھانے کو ضروری اور نہ کھانے کو عارضی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رمضان میں جو لوگ روزہ رکھتے ہیں۔ وہ کبھی پہلے یہ نہیں پوچھتے کہ مولوی صاحب روزہ کن کن وجوہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ بلکہ اگر کبھی کوئی ایسا سوال کرے تو اس کی نسبت عام طور پر یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ شاید روزہ نہ رکھنے کے ارادے ہیں۔ صاحب! آپ کو چاہیے تھا کہ آپ امر بالمعروف شروع کرتے۔ پھر کسی وقت کسی باوجاہت آدمی کو خلاف شرع وضع پر نصیحت کرنے یا کافر کو تبلیغ اسلام کرنے میں گاڑی اٹکتی۔ اس وقت مولوی صاحب سے پوچھتے کہ اس موقع پر کیا کروں۔ یہ کیا کہ آپ نہ حاکم کو امر بالمعروف کریں، نہ محکوم کو، نہ مسلم کو، نہ کافر کو، نہ بیوی کو، نہ اولاد کو اور پہلے ہی سے لگے عذر کا حکم دریافت کرنے۔ شاید آپ یہ کہیں کہ نماز روزہ میں تو عذر کم پیش آتے ہیں اور امر بالمعروف میں تو اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے۔ اپنے گھر والوں کو امر بالمعروف کرنے میں کونسا عذر مانع ہے۔ بیوی نے نماز نہ پڑھی تھی۔ اس کو نصیحت کرنے میں کیا خوف تھا۔ کیا وہ آپ کو مار

ڈالے گی۔ یا لڑکا نماز نہیں پڑھتا۔ تو وہ آپ کا کیا کرلے گا۔

اگر آپ کہیں کہ وہ سنتا نہیں ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ اگر وہ کبھی امتحان میں فیل ہو جائے تو اس وقت آپ اس کو کیوں مارتے ہیں اور کیوں سزا دیتے ہیں۔ اس وقت وہ آپ کی بات کو کیوں کر سننے لگتا ہے۔ پس یہ سب بہانے لغو ہیں۔ اصل بات وہی ہے کہ آپ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ بھلا اگر کوئی آپ کا دوست آپ کے سامنے زہر کھانے لگے۔ تو کیا آپ اس کو نہیں روکیں گے۔ یقیناً ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دے کر زہر کو اس کے ہاتھ سے لے لیں گے۔ اگر آپ تنہا قادر نہ ہوں گے تو دوسروں کو امداد کے واسطے بلائیں گے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ دین میں جو افعال مضر ہیں۔ ان سے روکنے میں اس اہتمام سے کام نہیں لیا جاتا۔ معلوم ہوا کہ آپ دین کے ضرر کو ضرر نہیں سمجھتے اور یہ سخت مرض ہے۔ جس کا علاج بالضد ہے۔ مگر افسوس! اس قدر غفلت ہے کہ خدا کی پناہ۔ کسی کو بھی اس مرض کے علاج کی طرف توجہ نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ۔

کمال دین

سو اس سورت میں حق تعالیٰ نے اسی پر ہم کو متوجہ کیا ہے کہ جب تک تم دین کو کامل نہ کرو گے۔ خسارہ میں رہو گے اور دین کا کمال دو باتوں پر موقوف ہے۔ ایک اپنی تکمیل۔ پھر دوسروں کی تکمیل۔ دوسروں کی تکمیل تواصی اور تبلیغ سے ہوتی ہے اور اس کے دو محل ہیں۔ دونوں کو حق تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمایا ہے۔ ایک کو لفظ حق سے اور دوسرے کو صبر سے اوپر میں نے ان دونوں کے اندر فرق بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب اس کو پورا کرتا ہوں۔ حق کہتے ہیں امر مطابق للواقع کو اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی خبر ہے۔ سو سمجھ لیجئے کہ اس سے مراد عقائد ہیں اور عقائد حقہ جس قدر ہیں۔ وہ سب اخبارات ہی ہیں:

اللّٰہ احد الرسول صادق والقیامۃ اٰتیۃ لا ریب فیھا والجنۃ حق والنار حق والقدر حق وغیرہ وغیرہ۔ (اللہ ایک ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں اور جنت ودوزخ برحق ہیں اور تقدیر برحق ہے)

اور صبر سے مراد اعمال ہیں۔ کیونکہ صبر کے معنی ہیں۔ مضبوطی اور پختگی اور حبس علی من تکرہ ۔ کہ نفس کو ناگوار باتوں پر جمانا اور اس میں استقلال و پختگی پیدا کرنا اور مشقت وناگواری اعمال ہی میں ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں کچھ کرنا پڑتا ہے۔ عقائد میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ ان میں تو صرف چند سچی باتوں کو جان لینا اور مان لینا ہے۔ اگر مشقت ہوتی ہے تو اپنے پہلے عقیدہ کے چھوڑنے میں ہوتی ہے۔ عقیدہ حقہ کے اختیار کرنے میں کوئی مشقت نہیں۔ مشکل اور دشواری اعمال میں ہوتی ہے۔ اسی لئے ان کو صبر سے تعبیر کیا گیا۔

حاصل یہ ہوا کہ تواصی اور تبلیغ عقائد کی بھی کرو اور اعمال کی بھی۔ دوسری عبارت میں یوں کہیئے۔ کہ حق سے مراد اصول ہیں اور صبر سے مراد فروع ہیں۔ اسی کو میں نے پہلے کہا تھا کہ تبلیغ اصولاً بھی فرض ہے اور فروعاً بھی۔ یا یوں کہیے حق سے مراد علوم ہیں اور صبر سے مراد اعمال اور اس میں بڑا لطیفہ یہ ہے کہ لفظ حق امنوا کے مناسب ہے اور لفظ صبر عملوا الصلحت کے مناسب ہے۔ جس چیز کو پہلے ایمان وعمل صالح کے عنوان سے بیان فرمایا تھا۔ اسی کو اس جگہ دوسرے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ خسارہ سے وہ لوگ بچے ہوئے ہیں۔ جو خود بھی ایمان لائیں اور دوسروں کو بھی ایمان کی ترغیب دیں اور خود بھی عمل صالح کریں اور دوسروں کو بھی عمل صالح کی نصیحت کریں۔

طریق تبلیغ

رہا یہ سوال کہ جب مراد وہی ہے۔ جو امنوا و عملوا الصلحت سے مراد تھی۔ تو پھر عنوان کیوں بدلا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تفنن کلام کے لئے الفاظ کا بدلنا موجب نشاط ہوتا ہے اس کے علاوہ اور بھی نکات ہیں۔ چنانچہ یہاں تواصوا بالایمان وتواصوا بالاعمال اس لئے نہیں فرمایا۔ کہ تواصی میں دوسرے کو ترغیب ونصیحت ہوتی ہے اور دوسرے شخص کو شرعی اصطلاحوں میں نصیحت کرو گے تو اس کو وحشت ہوگی۔ اگر کافر سے دفعتہً یہ کہا جائے۔ کہ اسلام لے آؤ تو اس سے گھبرا جائے گا۔ پس حق تعالیٰ نے عنوان کو بدل کر واعظ کو وعظ کا طریقہ بتلایا ہے۔ کہ نصیحت کے وقت اول مخاطب سے یوں کہو کہ آؤ ہم تم کو ایک سچی بات

بتلائیں۔ کہ اس عالم کا ایک پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے وجود کو ماننا چاہیے۔ جب اس نے اس کو مان لیا۔ تو اب کہو کہ وہ ذات وصفات میں یکتا ہے۔ اس کا علم ایسا ہے۔ قدرت ایسی ہونا چاہیے۔ اس کو شرکت ومساوات اور جملہ عیوب سے پاک ہونا چاہیے۔ ان باتوں کو سب مانیں گے۔ اس کے بعد اس سے کہو کہ پھر دیکھو کہ صانع عالم کی توحید اور تعظیم اس کی شان کے لائق کس مذہب میں ہے۔ یقیناً اسلام کے سوا کسی مذہب میں یہ بات نہیں ہے، اب اس سے کہو کہ تم کو اسلام لانا چاہیے۔ کیونکہ اسلام ہی میں ان باتوں کی بخوبی تعلیم دی گئی ہے۔ اس طرح مخاطب کو ذرا وحشت نہ ہوگی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں صدرا میں مثناۃ بالتکریر کی بحث پڑھائی ہے تو شروع میں طلبہ کو اس کی خبر نہیں۔ اس بحث کا نام مثناۃ بالتکریر ہے۔ بلکہ اول سہل اور آسان لفظوں میں اصطلاحی الفاظ کو چھوڑ کر اس مقام کو حل کر دیا۔ جب سب سمجھ گئے۔ اس وقت میں نے کہا۔ کہ اسی مقام کا نام بحث مثناۃ بالتکریر ہے۔ جس کو طلبہ بہت دشوار اور مشکل سمجھتے ہیں۔ مگر کچھ بھی مشکل نہیں۔ تم خود دیکھ لو۔ کتنی آسانی سے تم نے اس کو سمجھ لیا ہے۔ اور میں نے یہ شعر پڑھا:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرہ خون نہ نکلا

مگر یہ باتیں میں نے ان کا دل بڑھانے کو کہہ دی تھیں۔ ورنہ جس مصیبت سے میں نے اس کو آسان کر کے حل کیا تھا۔ میرا ہی دل جانتا تھا۔

اور قاعدہ سمجھانے کا یہی ہے۔ کہ مصلح کو اپنے اوپر مشقت لینی چاہیے اور مخاطب کو آسان کر کے مطلب سمجھانا چاہیے۔ یہی طریقہ قرآن میں اختیار کیا گیا ہے۔ کہ مخاطب کو ایسے عنوان سے نصیحت کی جاتی ہے۔ جس سے وہ متوحش نہ ہو۔ چنانچہ ایک مقام پر حق تعالیٰ نے اسی طرز کی تعلیم فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَانُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ.

کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک بات سنو، جو ہمارے تمہارے نزدیک برابر (درجہ میں ماننے میں قابل) ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو

شریک نہ کریں اور آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں۔ یہ عنوان ایسا ہے۔ جس سے وحشت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ کفار بھی شرک کو برا سمجھتے تھے۔ گو اپنے شرک کو برا نہ سمجھتے تھے۔

اس کے بعد ارشاد ہے:

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔

(یعنی اگر وہ اس بات کو مان لیں) تب تو گویا اسلام کو مان لیا۔ کیونکہ اسلام کی تعلیم یہی ہے۔) اگر وہ اس سے اعراض کریں تو (صاف) کہہ دو۔ کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔ اس میں تالیف قلب کی رعایت نہیں جب کہ مخاطب کسی طرح سمجھنے پر آتا ہی نہیں۔ سبحان اللہ! اس آیت میں ایسی بات بتلائی گئی ہے۔ جس کا فیصلہ عقلاء ہزاروں برس میں بھی نہ کرسکتے تھے۔ کیونکہ عقلاء میں بعض کی رائے تو اصلاح میں تالیف قلب کی طرف مائل ہوئی ہے اور بعض کی رائے صفائی کی طرف مائل ہوتی ہے مگر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ بتلایا ہے کہ ابتداء میں تو تالیف قلب کرو اور انتہاء میں صفائی سے کام لو۔

چنانچہ اس آیت میں ابتداء تو ایسے عنوان سے ہے۔ جس میں تالیف قلب ہے اور انتہاء میں صفائی کی تعلیم ہے۔ مگر آج کل حالت یہ ہے کہ اگر مصالح کی رعایت ہے۔ تو عمر بھر مصالح ہی مصالح چلتے جائیں گے۔ کبھی صاف بات منہ پر نہ آئے گی اور اگر صفائی اختیار کرتے ہیں تو شروع ہی سے لٹھ سا مار دیتے ہیں۔

اسی طرح وتواصوا بالصبر میں اعمال کی ترغیب کا عنوان بتلایا ہے کہ ابتداء ہی سے یہ نہ کہو کہ نماز پڑھو۔ کیونکہ اس سے وحشت ہوگی۔ بھلا کفار کا تو کیا ذکر جو کہ آج کل تو مسلمان بھی اس کے نام سے متوحش ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک جنٹلمین نے اخبار میں لکھا تھا۔ کہ نماز کو اسلام کی برادری سے نکال دینا چاہیے۔ کیونکہ اس نے بہت سے کافروں کو اسلام سے روک رکھا ہے۔ جب وہ یہ سنتے ہیں کہ مسلمان ہوکر پانچ وقت کی نماز پڑھنا پڑے گی تو وہ اسلام لانے کی ہمت نہیں کرتے۔ یہ مسلمان صاحب ہیں جو اسلام کو کفر بنا کر کفار کو اس میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ بھلا جب اسلام سے نماز کو نکال دیا گیا تو وہ اسلام کہاں رہا۔ کیونکہ ایک فرض کا انکار بھی کفر ہے۔ یہ قصہ میں نے اس لئے بیان کیا تا کہ معلوم ہوجائے کہ دفعۃً نماز روزہ کا ذکر تبلیغ کے وقت

نہ کرنا چاہیے کہ اس سے مخاطب کو وحشت ہوگی۔ بلکہ ابتداء میں اعمال کی ترغیب اخلاق کے پیرایہ میں دینا چاہیے کہ نفس کو پابند کرنا اور آزادی سے روکنا اور اس میں استقلال وپختگی پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ انسان اور جانور میں کیا فرق ہوگا؟ مردانگی اسی میں ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو نفس کا تابع فرمان نہ ہو اور نفس کو تباہ کرنے والی سب سے بڑی چیز تکبر ہے۔ انسان کو تواضع اور عاجزی اختیار کرنی چاہیے جس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی سب سے بڑی عظمت والے کی عظمت اس کے پیش نظر رہے۔ اسلام نے اس کے لئے پانچ وقت کی نماز مقرر کی ہے۔ جس کو باقاعدہ ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا نقش اس کے دل پر جم جاتا ہے۔ کیوں کہ نماز میں ایسے ارکان ہیں جن سے انسان کی غایت درجہ ذلت ظاہر ہوتی اور نفس پامال ہو جاتا ہے۔

دوسری تباہ کرنے والی چیز نفسانی خواہشوں کی حرص ہے۔ مثلاً کھانے پینے اور عورتوں سے مخالطت کرنے کی حرص۔ اس کو بھی دبانا اور معتدل کرنا چاہیے۔ ورنہ آدمی انسانیت سے باہر ہو جاتا ہے اور جرائم پر اقدام کرنے لگتا ہے۔ اسلام نے اس کا علاج روزہ کی صورت میں فرض کیا ہے۔ جو سال میں ایک مہینہ کے اندر رکھا جاتا ہے۔

تیسری مہلک شے حب مال ہے۔ جس شخص کے دل میں حب مال کا غلبہ ہوتا ہے وہ ہر طرح اپنا ہی بھلا چاہتا ہے۔ گو دوسروں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو چنانچہ بہت لوگ غریبوں کے حقوق دبا لیتے ہیں اور ان کے مال وجائیداد پر غاصبانہ قبضہ کر لیتے ہیں اور اس کا ظلم وقبیح ہونا ہر عاقل پر ظاہر ہے۔ اس لئے حب مال کا علاج لازم ہوا۔ اسلام نے اس کے لئے زکوٰۃ کو فرض کیا ہے۔ جس سے مال کی حرص گھٹ جاتی اور دنیا کی محبت سے دل پاک ہو جاتا ہے اور تمام اعمال کا حاصل یہ ہے کہ نفس کو جانوروں کی طرح آزاد نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ اس کو پابند کیا جائے اور ناگوار امور کے استقلال وتحمل کا عادی کیا جائے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے وتواصو ابالصبر کے عنوان سے بیان فرمایا ہے۔ جس میں تمام اعمال کا مغز بتلا دیا گیا ہے۔ تو اس طرح نصیحت کرنے سے مخاطب کو وحشت نہ ہوگی۔

طرز نصیحت

مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی قدس سرہ کی حکایت ہے کہ آپ سے کسی نے ایک

رئیس خان صاحب کی شکایت کی کہ یہ نماز نہیں پڑھتے۔ مولانا نے ان سے پوچھا کہ خان صاحب نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ کہا، حضرت! آپ سے کیا پردہ۔ بات یہ ہے کہ "میں داڑھی چڑھانے کا عادی ہوں۔ یہ شوق مجھ سے نہیں چھوٹتا اور نماز کے لئے پانچ وقت وضو کرنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے بار بار داڑھی کا اتارنا چڑھانا مشکل ہے۔ اس لئے میں نماز نہیں پڑھ سکتا۔ مولانا نے فرمایا کہ بس آپ کو یہی عذر ہے۔ کہا ہاں۔ فرمایا ہم آپ کو اجازت دیتے ہیں کہ آپ بے وضو ہی نماز پڑھ لیا کریں۔ مگر نماز کو نہ چھوڑیں۔ خان صاحب نے کہا حضرت بے وضو کے نماز پڑھنے سے تو یوں سنا ہے کہ آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ فرمایا۔ تم کافر نہ ہو گے تم بے فکر رہو اور بے وضو ہی پڑھ لیا کرو (مولانا کو نور قلب سے پورا اطمینان تھا کہ بے وضو نماز نہ پڑھیں گے) چنانچہ خان صاحب بے وضو ہی نماز پڑھنے کھڑے ہوئے۔ مگر اندر سے دل نہ مانا۔ آخر نماز چھوڑ کر وضو کیا اور وضو سے نماز پڑھی۔ پھر ایک دو روز تک تو ہر وضو کے بعد داڑھی چڑھا لیا کرتے۔ اس کے بعد یہ بھی چھوڑ دیا اور اچھے خاصے پکے نمازی ہو گئے۔ دیکھئے مولانا نے کیسے عجیب طرز سے نصیحت کی۔ کہ مخاطب کو ذرا بھی توحش نہ ہوا۔

اسی طرح حضرت مولانا قاسم صاحب کے ایک معتقد پاجامہ ٹخنوں سے نیچا رکھتے تھے۔ کسی نے اس کے سامنے ہی حضرت مولانا سے عرض کیا۔ کہ یہ آپ کے معتقد ہیں اور پاجامہ ٹخنوں سے نیچا رکھتے ہیں۔ آپ ان کو منع نہیں فرماتے۔

مولانا نے فرمایا۔ کہ بھائی یہ اپنی وضع کے بڑے پختہ معلوم ہوتے ہیں۔ کسی کے کہنے سے نہ چھوڑیں گے۔ خود ہی جی میں آجائے گا تو چھوڑ دیں گے۔ اور جب چھوڑ دیں گے تو پھر دوسری وضع پر پختہ ہو جائیں گے۔ اس عنوان سے ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولانا نے امر بالمعروف کو ترک کیا۔ مگر سمجھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ مولانا نے عجیب طرز سے اس کو نصیحت کی ہے چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ اسی وقت سے وہ معتقد اس فعل سے تائب ہو گیا اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

(ایسے اسراروں کا دوسرے حکایات و تمثیلات میں بیان ہونا مناسب ہے)

امر بالمعروف کی ایک صورت یہ ہے کہ ظاہر میں ہر دیکھنے سننے والا سمجھ جائے۔ کہ اس نے نصیحت کی ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ ظاہر میں تو ترک امر ہو اور باطن میں امر ہو۔ بعض دفعہ یہ پہلی صورت سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ جب کہ نصیحت کرنے والا صاحب برکت ہو۔ پس بزرگوں کے ترک امر بالمعروف پر اپنے حال کو قیاس نہ کرو۔ تمہارے لئے وہی طریقہ لازم ہے کہ زبان سے نصیحت کرو۔

اور اہل باطن کبھی قال سے نصیحت کرتے ہیں۔ کبھی حال سے کبھی بال سے یعنی دل سے۔ کیونکہ ان کی توجہ قلبی میں بڑا اثر ہے کہ تمہاری زبان میں بھی وہی اثر نہیں۔

بزرگوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ان کے ادنیٰ غلاموں کی حالت یہ ہے کہ بعض دفعہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ مگر دوسرے پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ زبان سے کہنے کا وہ اثر نہ ہوتا ایک بار ریل سے سفر کر رہا تھا۔ میرے درجہ میں ایک جنٹلمین ڈپٹی کلکٹر بھی سوار تھے۔ ایک دوست نے ان سے تعارف کرایا اور میرے ساتھ وہ بہت دل کھول کر باتیں کرنے لگے۔ کہ اتنے میں مغرب کا وقت آ گیا اور میں نے اپنے ساتھیوں سمیت نماز کا اہتمام کیا تو ایک دوست کہنے لگے کہ یہ ڈپٹی صاحب آپ کے معتقد معلوم ہوتے ہیں ان کو بھی نماز کے لئے کہنا چاہیے۔ اگر آپ ذرا اشارہ کر دیں گے۔ تو وہ ضرور نماز پڑھیں گے۔ میں نے کہا۔ کہ میں کیوں کہوں۔ کیا نماز کا فرض ہونا ان کو معلوم نہیں۔ وہ خود کیوں نہیں پڑھتے۔ میرے کہنے سے پڑھیں گے۔ تو احسان مجھ پر ہوگا اور بھلا ان کا ہوگا۔ میں تو کچھ نہ کہوں گا۔ اگر آپ کو امر بالمعروف کا جوش ہے آپ کہہ دیکھئے۔ میرے اس جواب پر وہ دوست بھی خاموش ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر میں پھر ان کے پاس جا بیٹھا اور اسی بشاشت سے باتیں کرنے لگا۔ جیسے پہلے کر رہا تھا۔ اس کا ان پر اس قدر اثر ہوا کہ بعد میں میرے دوست سے انہوں نے بیان کیا کہ نماز پڑھ کر جب پھر مجھ سے اسی بشاشت کے ساتھ اس نے باتیں کیں۔ تو گویا میں ذبح ہو گیا۔ کیونکہ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ جب سب نماز میں لگ گئے اور میں نہ لگا۔ تو مجھے نہایت ذلیل سمجھا جائے گا۔ مگر جب اس طرح باتیں کی گئیں۔ کہ گویا میری حرکت پر التفات ہی نہیں ہوا۔ تو میں زمین کے اندر گڑھ

گیا۔ کہ افسوس! میں تو اس قدر نالائق اور ادھر سے یہ کرم۔ پھر وہ اس دن سے بڑے پکے نمازی ہوگئے اور بعد میں ملے۔ تو داڑھی بھی خوب بڑھالی تھی۔ تو بعض دفعہ ترک نصیحت زبانی نصیحت سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ تفسیر زبان روشن گرست　　　　لیک عشق بے زبان روشن ترست

بوئے آں دلبر چو پران می شود　　　　این زبانہا جملہ حیران می شود

(اگرچہ زبان کا بیان روشن گر ہے لیکن عشق بے زبان زیادہ روشن ہے، اس محبوب کی خوشبو جب اڑنے والی ہوتی ہے تو یہ تمام زبانیں حیران ہوجاتی ہیں)

مگر یہ وقائق ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔ عوام کے لئے اصل طریق وہی ہے جو عام ہے۔ کہ زبان سے نصیحت کرو۔

حکمت کے ساتھ دعوت

غرض وتواصو ابالصبر میں یہ بتلایا گیا ہے۔ کہ اعمال کی ترغیب اخلاق کے پرایہ میں دو۔ کیونکہ اخلاق حمیدہ کا استحسان سب کو مسلم ہے۔ اس سے وحشت نہ ہوگی اور نصیحت میں اس کی رعایت ضروری ہے۔ کہ مخاطب کو وحشت نہ ہو۔ جیسا دوسری آیت میں ارشاد ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

کہ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ دعوت دو۔ دفعتہً لٹھ سا نہ مارو، سبحان اللہ اس ایک لفظ میں کتنی باتوں کی طرف اشارہ ہے کہ اعمال کا مغز بھی بتلا دیا۔ نصیحت کا طریقہ بھی بتلا دیا اور یہ صاف دلیل ہے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر کس قدر شفقت ہے کہ نافرمانوں کی بھی اس قدر رعایت ہے کہ ان کو متوحش نہ کیا جائے۔ دیکھئے اطباء بخار میں کونین دیتے ہیں مگر ہر شخص کے لئے طریقہ جدا ہے۔ ایک تو اجنبی مریض کو دیتے ہیں۔ اس کے لئے کچھ اہتمام نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ویسے ہی پانی میں گھول کر اس کے سامنے کردیتے ہیں۔ اگر وہ تلخی کی وجہ سے نہ پی سکے۔ تو طبیب یہ کہہ کر الگ ہوجائے گا کہ نہیں پیتا تو میری بلا سے میں کیا کروں۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ حکیم صاحب اپنے بیٹے کو کونین دیں تو اس وقت مٹھائیں لپیٹیں گے اور اس تدبیر سے گلے کے نیچے اس کو اتاریں گے۔ پس پھر تو کونین کی حکومت ہے۔ ہم تو صرف اپنی اولاد کے لئے یہ تدبیریں کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کے واسطے بھی یہی تدبیر کرتے ہیں۔ کہ مٹھائی میں کونین لپیٹ کر دیتے ہیں۔ اسی لئے حکم ہے حکمت کے ساتھ دعوت کرنے کا اور اخلاق کے پیرایہ میں اعمال کی ترغیب دینے کا۔ اللہ تعالیٰ کی اس شفقت کا ظہور اہل اللہ میں بھی ہوتا ہے۔ اہل اللہ کو بھی مخلوق کے ساتھ بہت شفقت ہے وہ ایسے طرز سے نصیحت کرتے ہیں کہ جس سے مخاطب کو نفع ہی ہوتا ہے۔ اگر اس میں کچھ بھی ارادہ اور طلب ہے۔ ورنہ اگر وہ خود نہ چاہے تو ایسے شخص کا علاج تو انبیاء علیہم السلام بھی نہیں کر سکتے۔

چنانچہ ارشاد ہے:۔

اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ

کہ آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ہدایت کرتے ہیں۔ جسے چاہتے ہیں۔ اور یہ من یشاء کون ہے۔ وہی ہے جو خود بھی اپنی اصلاح کا قصد کرے۔

پھر اس شفقت کے ساتھ ایک بات سب سے بڑھ کر عجیب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ابتداء میں تو شفقت سے تبلیغ کرتے ہیں۔ لیکن بعد میں جب ناامیدی ہو جاتی ہے تو اب ان کو قطع شفقت کا امر ہوتا ہے پھر ان کو قوم کی بدحالی پر حزن نہیں ہوتا (**یعنی عقلاً و یمکن ان یکون طبعا کما یشیر الیہ قول شعیب علیہ السلام یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالٰتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ فَکَیْفَ اٰسٰی یدل علٰی حزنہ و انہ سلی نفسہ بھٰذا الکلام.** (۱۲ جامع)

چنانچہ اسی موقعہ کے لئے ارشاد ہے:

وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ یہ ہے ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

(ایک ہاتھ میں شریعت کا اور دوسرے میں عشق کا جام، ہر ہوسناک ان دونوں کے ساتھ نمٹنا نہیں جانتا)

اسلام کا نرالا طرز تبلیغ

اب میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ہے کوئی مذہب جس میں اتار چڑھاؤ کے ساتھ تبلیغ کا طریقہ تعلیم کیا گیا ہو۔ کسی مذہب کا منہ نہیں جو اسلام کے سامنے آسکے۔

اور اس میں راز یہ ہے کہ ابتداء میں شفقت نہ کرنے سے تو خود تبلیغ کا کام اٹکتا ہے اور نا امیدی کے بعد حزن کرنے سے تبلیغ کی ترقی رکتی ہے کیونکہ اب حزن کرنے سے مبلغ کی ہمت پست ہو جائے گی اس وقت اس کو یہ تعلیم ہے کہ ہدایت تمہارے قبضہ میں نہیں۔ بلکہ خدا کے قبضہ میں ہے بس تم کو اپنا کام کرنا چاہیے۔ تمہارا ثواب کہیں نہیں گیا اور جو کام خدا کا ہے اس کو خدا کے سپرد کرو۔

کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن

(اپنا کام کرو دوسرے کا کام مت کرو)

اب اس تعلیم سے اس کا دل بڑھے گا اور برابر تبلیغ کرتا رہے گا۔ سبحان اللہ! کیسی پاکیزہ اور عجیب تعلیم ہے اور یہ نکتے ہی نہیں۔ بلکہ سب باتیں قرآن میں مصرح ہیں۔

دوسرا راز وتوصوا بالصبر میں یہ ہے کہ جب اس عنوان سے اعمال کو اللہ تعالیٰ نے تعبیر کیا ہے اور تواصی وتبلیغ بھی ایک عمل ہے تو اس میں مبلغ کو تنبیہ ہے کہ جب تم دوسروں کو صبر کی (یعنی استقلال فی الاعمال کی) نصیحت کرتے ہو تو ذرا خود تبلیغ میں بھی صبر و استقلال سے کام لینا۔ کیونکہ تبلیغ میں بعض ناگواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ اگر صبر واستقلال سے کام نہ لیا تو تبلیغ دشوار ہو جائے گی۔

رہا یہ کہ اس عنوان کو تبلیغ عقائد میں کیوں اختیار نہ کیا گیا۔ تبلیغ اعمال ہی میں کیوں اختیار کیا۔ اس کی وجہ آئندہ معلوم ہو جائے گی۔ (جہاں والعصر کی قسم کی توجیہ شروع ہے۔ اس سے ذرا پہلے)۔

رہا یہ کہ تواصی بالحق کو مقدم اور تواصی بالصبر کو مؤخر کیوں کیا گیا۔ اس کی وجہ ایک تو ظاہر ہے کہ حق مفسر بالعقائد ہے اور صبر مفسر بالاعمال ہے اور عمل عقائد سے موخر ہے۔ دوسری بات ابھی میرے ذہن میں آئی ہے۔ وہ یہ کہ عقائد میں تو ہر شخص اسی عقیدہ کا معتقد ہوتا

ہے جس کو وہ حق سمجھتا ہے۔کوئی شخص اپنے نزدیک باطل عقیدہ کا معتقد نہیں ہوتا۔ کیونکہ عقائد میں کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ نہ ان میں کچھ لذت ہے۔ جو خواہ مخواہ لذت کی وجہ سے غلط اور باطل کا عقیدہ قائم کیا جائے۔اس لئے انسان اعمال فاسدہ کا بھی جان بوجھ کر مرتکب ہو جاتا ہے گو جانتا ہے کہ یہ عمل قبیح ہے۔مگر لذت عاجلہ کی وجہ سے اس کو اختیار کرتا ہے۔ جیسا کہ بہت لوگ زنا اور شراب خوری میں مبتلا ہیں اور اس کے قبح سے بھی واقف ہیں۔مگر عقائد میں یہ بات نہیں ہے۔ کہ لذت کی وجہ سے جان بوجھ کر کوئی غلط عقیدہ کا معتقد ہو۔کیوں کہ وہ تو پھیکی چیز ہے۔اس میں نفسانی لذت کچھ نہیں۔اس لئے عقائد میں ہر شخص اسی بات کا معتقد ہے جو اس کے نزدیک حق ہے۔پس اب عقائد حقہ شرعیہ کی جو لوگوں کو تعلیم کی جائے گی تو گویا مخاطب فاسد العقائد کو اس کے زعم میں طاعات سے چھڑایا جاتا ہے۔اسی لئے عقائد کی تبلیغ لوگوں کو ناگوار ہوتی ہے۔ نیز عقائد کا فساد محسوس نہیں صرف عقلی ہے۔اور اعمال کا فساد حسی ہے۔ان کے مفاسد کا مشاہدہ کرایا جاسکتا ہے۔اس لئے مخاطب کو اپنے عقائد کا فساد جلدی معلوم نہیں ہوتا۔بلکہ جو ان کو غلط کہے اس کی بات ناگوار گزرتی ہے۔ان وجوہ سے عقائد حقہ کی تبلیغ عام طور پر لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے۔ اور یہی ناگواری سبب ہے اس کا کہ ہم لوگ کفار کو اسلام کی تبلیغ نہیں کرتے۔

وقت ترک تبلیغ

بلکہ آج کل عموماً ہر قسم کی تبلیغ اسی لئے متروک ہے۔کہ مخاطب کو اس سے ناگواری ہوتی ہے اور عقائد کی تبلیغ میں یہ ناگواری زیادہ ہے۔تو لوگ سمجھتے ہیں۔کہ ناگواری خلائق کو کون اپنے سر لے۔مگر یہ کوئی عذر نہیں۔اگر ہمارے اسلاف بھی اس کا خیال کرتے۔تو آج ہم میں سے کسی کو بھی کلمہ شہادت نصیب نہ ہوتا۔آخر ہمارے آباؤ اجداد میں کوئی تو اول المسلمین ہوگا۔اس کو جس نے اسلام کی تبلیغ کی تھی۔کیا اس نے بھی ناگواری مخاطب کی کوئی رعایت کی تھی۔ہرگز نہیں۔یاد رکھو کہ محض ناگواری مخاطب کوئی عذر نہیں۔حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَفَنَضْرِبُ عَنْکُمُ الذِّکْرَ صَفْحًا اَنْ کُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِیْنَ.

”کیا ہم تم کو نصیحت کرنے سے اس لئے پہلو تہی کرلیں۔کہ تم لوگ حد سے نکلنے والے

ہو۔" حالانکہ حق تعالیٰ کے ذمہ تو امر بالمعروف واجب نہیں۔ وہ اس سے پاک ہیں کہ ان پر کوئی بات واجب ہو۔ لیکن پھر بھی وہ مخاطب کی ناگواری کی پرواہ نہیں کرتے۔ یہی امر ہم کو ہے۔

بس یاد رکھئے کہ ترک امر بالمعروف کے لئے عذر صرف یہ ہے کہ لحوق ضرر کا اندیشہ ہو اور ضرر بھی جسمانی محض فوت منفعت عذر نہیں۔ اب غور کیجئے کہ لحوق ضرر ترک تبلیغ کے کتنے مواقع میں ہوتا ہے۔ زیادہ تو یہ ہے کہ محض ناگواری مخاطب کا خیال مانع ہوتا ہے۔ تو اس شخص کی ناگواری کی پرواہ کیوں کی جاتی ہے۔ آپ کا مذاق تو یہ ہونا چاہئے کہ:

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد   فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

(ہزار رشتہ دار جو خدا تعالیٰ سے بیگانہ ہوں ایک ایسے بیگانہ شخص پر قربان ہیں جو خدا تعالیٰ کا عارف ہے)

جو شخص خدا سے بیگانہ ہے اگر اس کو احکام الٰہی کی تبلیغ ناگوار ہے تو ہماری جوتی سے ہم تبلیغ سے کیوں رکیں۔ بس ہم کو خدا پر نظر رکھنا چاہیے اور صرف اس کی رضا کا طالب ہونا چاہیے۔ چاہے تمام عالم ناراض ہو جائے:

دلآ رامے کہ داری دل درو بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جب محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے تو پھر تمام دنیا سے اپنی آنکھیں بند کر لو)

صاحبو! میں آپ کو ایک عبرت ناک کثیر الوقوع واقعہ سناتا ہوں کہ ایک چودہ برس کی ناقص العقل لڑکی جس نے ماں باپ کی گودوں میں پرورش پائی اور ان کے گھر کو اپنا گھر، ان کے دوست کو اپنا دوست، ان کے دشمن کو اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ دو لفظوں سے یعنی نکحت اور قبلت سے اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ کہ جہاں اس کے منہ پر سے ہاتھ اترا اب شوہر کا گھر اس کا گھر ہے۔ اس کا دوست اس کا دوست ہے۔ اس کا دشمن اس کا دشمن ہے۔ گو شوہر کا دوست اس کے باپ کا دشمن ہی کیوں نہ ہو اور شوہر کا دشمن اس کے باپ کا دوست ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ اگر کسی وقت اس کا باپ بھی اس کے شوہر کا دشمن ہو جائے۔ تو عموماً عورتیں اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہیں۔ افسوس اس لڑکی نے تو عقد کے ایجاب و قبول کو اس پختگی سے نبھایا اور ایسی مردانگی دکھائی اور ہم لوگ باوجود مرد ہونے کے خدا تعالیٰ سے معاملہ منعقد کر کے اس کو نہیں نبھاتے۔ کہ **لا الٰہ الا اللہ محمد**

رسول اللہ کہہ کر خدا تعالیٰ کے دوست کو اپنا دوست اور خدا کے دشمن کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے۔ غضب ہے کہ ناقص العقل لڑکی تو ایک انسان سے تعلق جوڑ کر صرف اسی کی ہو جاتی ہے اور ہم خدا سے علاقہ جوڑ کر صرف اس کے نہیں ہوتے۔ میں پھر کہتا ہوں۔ کہ آپ کا یہ حال ہونا چاہیے۔

دلآرامی کہ داری دل درو بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جب محبوب حقیقی سے اپنا دل لگا لیا تو پھر تمام دنیا سے اپنی آنکھیں بند کر لو)

بس تمام عالم سے کہہ دو کہ ہم نے ایک ذات سے علاقہ جوڑ لیا ہے۔ جو اس سے ملے وہ ہمارا دوست ہے جو اس سے الگ ہے، وہ ہم سے الگ ہے۔

اسوۂ تبلیغ

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو اسلام کی دعوت دی۔ جب وہ راہ پر نہ آئے۔ تو صاف فرما دیا۔

سَلَامٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا.

کہ بس میرا اسلام لو۔ اب تم سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا۔ اپنے خدا سے دعا کروں گا۔

صاحبو! ابراہیم علیہ السلام کا طرز اختیار کرو۔ اسلام کا مقتضیٰ یہی ہے۔

شاید اس پر کوئی یہ کہے۔ کہ وہ تو نبی تھے۔ ہم سے نبی کا طرز کیونکر اختیار ہو سکتا ہے۔ تو حضرت! یہ جواب دے کر تو آپ نے ذمہ داری کو اور بڑھا لیا۔ کیونکہ نبی تو مقتدا کو کہتے ہیں اور نبی کو حق تعالیٰ نمونہ بنا کر بھیجتے ہیں۔ تا کہ لوگ اس نمونہ کے مطابق ہو کر حق تعالیٰ سے ملیں اور نمونہ کا مقتضاء یہ ہے کہ اگر آپ درزی کے پاس اچکن کا نمونہ بھیج دیں اور وہ نمونہ کے خلاف کپڑا تیار کر کے لائے۔ آپ حشر برپا کر دیتے ہیں اور اس کی ساری محنت کو اکارت سمجھ کر ایک پیسہ بھی مزدوری کا نہیں دیتے۔ بلکہ اس سے کپڑے کی قیمت بھی وصول کرتے ہیں۔ اب سمجھ لو کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے نمونہ بنا کر بھیجا ہے۔ اگر تم اس نمونہ کے خلاف رہو گے تو یہی حشر تمہارا ہوگا۔ جو تم نے درزی کے ساتھ کیا۔

حق تعالیٰ نے انبیاء و رسل کو اسی لئے بھیجا ہے۔ تا کہ نمونہ دیکھ کر لوگوں کو عمل میں سہولت ہو۔ ورنہ حق تعالیٰ یہ بھی کر سکتے تھے۔ کہ روزانہ یا ہفتہ وار اخبار بھیج دیا کریں۔ جو ہر شخص کے گھر

میں گر پڑا کرتا۔ جس میں ہر کام کی تصویر بھی ہوتی۔ جیسے بعض لوگوں نے نماز وغیرہ کے رسائل میں آدمی اور بوٹا وغیرہ کی تصویر بنائی ہے۔ تو حق تعالیٰ کو ایسا کرنا کیا مشکل تھا۔ مگر اس سے زیادہ سہولت زندہ نمونہ میں ہے۔ جو تبلیغ بھی کرے۔ احکام کو سمجھا بھی دے اور عمل کر کے دکھلا بھی دے۔ اس لئے انبیاء بھیجے گئے۔ پس آپ کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام تو نبی ہیں۔ حقیقت میں اپنے ذمہ الزام قائم کر لینا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ط اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرَاهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ط (تمہارے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام میں اور ان لوگوں میں جو کہ (ایمان وطاعت میں) ان کے شریک حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے جب کہ ان سب نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بے زار ہیں، ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت و بغض (زیادہ) ظاہر ہو گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتنی بات تو اپنے باپ سے ہوئی تھی کہ میں تمہارے لئے استغفار ضرور کروں گا اور تمہارے لئے استغفار (سے زیادہ) مجھ کو خدا کے آگے کسی بات کا اختیار نہیں)

(ترجمہ) تمہارے لئے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں میں اچھا نمونہ ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا۔ کہ ہم تم سے بیزار ہیں اور تمہارے ان معبودوں سے بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ ہم تم سے الگ ہیں اور ہمارے تمہارے درمیان عداوت و بغض ہمیشہ کے لئے قائم ہو چکی ہے۔ جب تک کہ تم اللہ وحدہٗ پر ایمان نہ لاؤ۔ پس ہم کو کسی کی ناگواری کی پرواہ نہ کرنا چاہیے۔ اور ناگواری مخاطب کی وجہ سے تبلیغ میں کوتاہی نہ کی جائے۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ ناگواری زیادہ عقائد کی تبلیغ میں ہوتی ہے۔ اس لئے تواصی بالحق کو اہتمام کے لئے مقدم کیا گیا اور تواصی بالصبر کو مؤخر۔

مبلغ کو صبر واستقلال کی تعلیم

رہا یہ کہ تواصی بالصبر کے عنوان سے مبلغ کو بھی صبر واستقلال کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ تعلیم تبلیغ عقائد میں کیوں نہیں دی گئی۔ اس کے دو جواب ہیں۔ اول یہ کہ تبلیغ عقائد بھی عمل ہے۔ تو وہ بھی تواصی بالصبر میں داخل ہے۔ پس یہ کہنا ہی صحیح نہیں۔ کہ تبلیغ عقائد میں مبلغ کو صبر کی تعلیم نہیں۔ دوسرے بعد تسلیم کے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ گو تبلیغ عقائد میں مخاطب کو ناگواری زیادہ ہوتی ہے۔ مگر جب وہ اپنے عقائد سابقہ کی غلطی سمجھ کر عقائد حقہ اختیار کر لیتا ہے تو اب اس کے لئے بار بار تبلیغ کی ضرورت نہیں رہتی۔ بخلاف اعمال کے۔ کہ ان کی تبلیغ ابتداء میں تو دشوار نہیں۔ نہ مخاطب کو اس میں زیادہ ناگواری ہوتی ہے۔ مگر اس میں تبلیغ کی بار بار حاجت ہوتی ہے۔ کیوں کہ انسان اپنے اعمال فاسدہ کو ایک بار چھوڑ کر بوجہ لذت نفسانی کے پھر اختیار کر لیتا ہے۔ تو اس میں ابتدائی تبلیغ کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ بقاء تبلیغ کی بھی حاجت رہتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ تبلیغ عقائد کی ابتداء دشوار ہے۔ مگر بقاء سہل ہے اور تبلیغ اعمال میں ابتداءً آسان ہے۔ مگر بقاء دشوار ہے۔ اس لئے یہاں ایسا عنوان اختیار کیا گیا۔ جس میں مبلغ کو بھی استقلال وصبر کی تعلیم ہے۔ واللہ اعلم باسرار کلامہ۔

توضیح قسم زمانہ

اب قسم کی توجیہ بتلاتا ہوں۔ جس کا میں نے شروع میں وعدہ کیا تھا تو سمجھیے۔ کہ قسم کے ساتھ تاکید کلام کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے۔ اس کے نام کی عظمت کی وجہ سے قسم کھانے والا جھوٹ سے رکتا اور ڈرتا ہے۔ کہ اگر اس کا نام لے کر جھوٹ بولوں گا تو وبال میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ یہ صورت تو قرآن میں اللہ تعالیٰ کی کھائی ہوئی قسموں میں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ مخلوق میں کوئی ایسا معظم نہیں جس کا نام لینا خدا تعالیٰ کو کسی امر سے مانع ہو۔

دوسری صورت تاکید بقسم کی یہ ہے کہ مقسم بہ سے جواب قسم کی توضیح مقصود ہو۔ میں نے جہاں تک غور کیا۔ تو اقسام قرآن میں یہی صورت معلوم ہوئی کہ مقسم بہ کو جواب قسم کی

توضیح میں بڑا دخل ہے اور یہ بہت بڑا علم ہے لیکن ہر مقام پر سیاق وسباق کو دیکھنا اور غور کرنا پڑتا ہے اور غور کرنے سے قسم و جواب قسم میں ارتباط معلوم ہو جاتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا. (اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے (قرب وثواب) کے ضرور دکھائیں گے)

مگر غور کرنے کی اس کو اجازت ہے۔ جس کے پاس آلات اعتبار ہوں۔

چنانچہ اس کی ایک مثال اس وقت ذہن میں آئی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی.

(قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جب وہ قرار پکڑ لے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردگار نے آپ کو چھوڑا نہ آپ سے دشمنی کی)

یہ سورت ایک بار کی فترۃ وحی کے بعد نازل ہوئی ہے اور فترۃ وحی قبض کی صورت ہے اور نزول وحی بسط ہے تو حق تعالیٰ دن اور رات کی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ آپ کو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ نے نہ چھوڑا نہ وہ آپ سے ناراض ہے۔ اس قسم کو جواب قسم کی توضیح میں اس طرح دخل ہے کہ بتلا دیا۔ کہ قبض کو علامت غیر مقبولیت نہ سمجھو۔ جیسا کہ بعض سالکین اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کہ نزول واردات کو علامت رضا اور انسداد احوال و کیفیات کو علامت رد سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ دنیا والے قبض وبسط رزق کو بھی علامت رضا وعدم رضا کی سمجھتے ہیں۔ روزی والے کو سب لوگ بھاگوان کہتے ہیں اور تنگدست کو منحوس اور مبتلائے ادبار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ اس کی حکایت فرماتے ہیں:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَكْرَمَنِ. وَ اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَهَانَنِ. (پس آدمی کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کو (ظاہراً) اکرام وانعام دیتا ہے تو وہ بطور فخر کے کہتا ہے میرے رب نے میری قدر بڑھا دی اور جب اس کو (دوسری طرح) آزماتا ہے تو وہ (شکایتاً) کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر گھٹا دی)

اللہ تعالیٰ نے اس خیال کو سورۃ والضحیٰ میں لیل ونہار کی قسم سے رفع فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

قبض وبسط کی مثال لیل ونہار جیسی ہے۔ بس جس طرح دن کے بعد رات کا آنا علامت رد نہیں۔ کیونکہ یہ غیر اختیاری بات ہے۔ اسی طرح بسط کے بعد قبض کا آنا علامتِ رد نہیں۔ اور جس طرح تعاقب لیل ونہار حکمت پر مبنی ہے۔ اسی طرح تعاقب قبض وبسط میں بھی حکمتیں ہیں، جیسے لیل ونہار کا تعاقب ناگزیر ہے، کہ بدوں اس کے عالم کا انتظام درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح سالک پر قبض وبسط کا تعاقب ضروری ہے۔ اس مثال کے بعد اب سورۃ العصر کی قسم کو سمجھیئے کہ اس کو جواب قسم سے کیا مناسبت ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان دو چیزوں میں مقید ہے۔ ایک زمان میں، ایک مکان میں، لیکن مکان مستقر ہے۔ یعنی اس کے لئے انقضاء نہیں اور زمان غیر مستقر ہے۔ یعنی اس کے لئے انقضاء ہے۔ کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ جو زمانہ گزر گیا، قبضہ سے باہر ہو گیا۔ تو حق تعالیٰ اس قسم سے انسان کے خسارہ کی دلیل بتلاتے ہیں کہ یہ ایسا عاجز ہے کہ جس ظرف میں اس کا عمل مقید ہے وہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اگر کسی وقت میں کوئی عمل اس سے فوت ہو گیا تو اگر یہ اس کا تدارک بھی کرے گا تو دوسرے وقت میں کرے گا اور جو زمانہ عمل سے خالی گزر گیا وہ بے کار گیا۔ تو واقعی انسان بڑے خسارہ میں ہے۔ البتہ مسلمان اس خسارہ سے بچا ہوا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس ایمان کی دولت ایسی ہے کہ وہ ہر وقت میں باقی رہنے والی ہے۔ کہ ایک دفعہ ایمان کو اختیار کر لینے سے جب تک معاذ اللہ اس کی ضد کا اعتقاد نہ ہو ایمان قائم رہے گا اور یہ ہر وقت میں مومن ہو گا۔ سوتے ہوئے بھی، چلتے پھرتے بھی اور کھاتے پیتے ہوئے بھی۔ غرض کوئی وقت اور کوئی ساعت مسلمان کی طاعت سے خالی نہیں گزرتی۔ اگر اس سے اور بھی کوئی عمل صادر نہ ہو۔ تب بھی ایمان تو ایسی طاعت ہے جو ہر وقت اس سے صادر ہو رہی ہے۔ اسی سے کافر کا خسارہ عظیمہ میں ہونا بھی معلوم ہو گیا۔ کہ اس کا کوئی وقت معصیت سے خالی نہیں گزرتا۔ اگر وہ اور بھی کچھ گناہ نہ کرے۔ تو کفر ہی اس سے ہر وقت صادر ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ ایک بار کفر اختیار کرنے کے بعد جب تک ایمان نہ لائے۔ کافر ہر وقت کافر ہے۔ کوئی ساعت اس کی کفر سے خالی نہیں گزرتی۔ بس اس قسم سے انسان کے خسارہ کی بڑی دلیل معلوم ہوئی۔ کہ بدوں ایمان کے اس کے خسارہ کی کچھ انتہاء نہیں کہ ہر سیکنڈ اور ہر منٹ میں اس کے سر پر عذاب بڑھتا جا رہا ہے اور ایمان کے بعد اس کے نفع کی کچھ انتہاء نہیں۔ کہ ہر ساعت میں اس کی طاعت بڑھتی رہتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ تمام دنیا

جانتی ہے۔ کہ نفع اور خسارہ زمانہ میں ہی ہوتا ہے پس اس شخص سے بڑھ کر کوئی خسارہ میں نہیں۔ جس کا کوئی وقت سیکنڈ خسارہ سے خالی نہ ہو (اور یہ کافر ہے) اور اس شخص سے بڑھ کر کوئی نفع میں نہیں، جس کا کوئی وقت کوئی سیکنڈ کوئی حالت نفع سے خالی نہیں (اور وہ مومن ہے)۔

اور ہر چند کہ مسلمان کا نفع صرف ایمان ہی سے ہے ہر وقت بڑھ رہا ہے مگر پورا نفع جب بڑھے گا جب کہ ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو۔ کیوں کہ عمل صالح سے ایمان قوی ہوتا اور گناہوں سے کمزور ہوتا ہے۔ پس مومن فاسق کا ہر وقت نفع کا بڑھنا ایسا ہے جیسے کسی شخص کو ہر سیکنڈ میں ایک پیسہ کا منافع بڑھتا ہو اور مومن صالح کا ہر وقت نفع بڑھنا ایسا ہے جیسے کسی کا ہر سیکنڈ میں ہزار روپیہ کا منافع بڑھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ پورا نفع اسی کا بڑھ رہا ہے۔ جس کو ہر سیکنڈ میں ہزار روپیہ کا نفع ہوتا ہو۔ پس گناہوں سے بچنے کا اہتمام نہایت ضروری ہے اور عمل صالح اختیار کرنا لازم ہے تا کہ ہر سیکنڈ میں ہزاروں کی ترقی ہو اور ہزار روپیہ سے کمی ہو کر ایک پیسہ ہی نہ رہ جائے۔ کہ نفع عظیم کے مقابلہ میں یہ بھی خسارہ ہے۔ گو کافر کے خسارہ کے مقابلہ میں نفس ایمان کا نفع بھی لاکھ درجہ افضل ہے۔

اور اگر معاملہ یہیں تک رہتا، تب بھی کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ ہم کو ہزار کا نفع نہ سہی ایک پیسہ ہی کا سہی۔ مگر مصیبت اور خطرہ تو یہ ہے کہ گناہوں کی وجہ سے بعض دفعہ ایمان بھی سلب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ایک پیسہ کی ترقی بھی نہیں رہتی۔ بلکہ خسارہ ہی خسارہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ عمل صالح اور **تواصی بالحق و تواصی بالصبر** کو کیوں بڑھایا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اعمال صالحہ جوہر ایمان کے محافظ ہیں اور گناہ و معاصی اس دولت کے دشمن ہیں۔ جو شخص خود گناہ کرتا یا دوسروں کو گناہ میں مبتلا دیکھ کر نصیحت نہیں کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کے دل سے گناہوں کی نفرت کم ہو جاتی، پھر زائل ہو جاتی ہے۔ اور وہ گناہوں کو ہلکی معمولی بات سمجھنے لگتا ہے اور یہی کفر ہے۔ غرض اس مقام پر زمانہ کی قسم کو جواب قسم کی توضیح میں بہت بڑا دخل ہے۔ کہ اس سے خسارہ کی دلیل معلوم ہو گئی اور یہ دعویٰ مدلل ہو گیا۔ کہ واقعی انسان بڑے خسارہ میں ہے۔ اگر ایمان و عمل صالح سے محروم ہو۔

آیت کی تفسیر تو بقدر ضرورت ہو چکی اور جو باتیں اس کے متعلق اس وقت ذہن میں تھیں۔ میں بیان کر چکا۔ اب مقصود پر مکرر تنبیہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت تک میں

نے گو مشترک بیان کیا ہے۔ کہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر دونوں سے تعرض کیا ہے۔ مگر زیادہ مقصود اس وقت جز واول یعنی تواصی بالحق کا بیان ہے۔ کہ ہم کو عقائد حقہ اسلامیہ کی تبلیغ کرنا چاہیے۔ کفار میں بھی اور کفار سے پہلے ان نومسلموں میں بھی جن پر ارتداد کا اندیشہ ہے۔ کیوں کہ آج کل فتنہ ارتداد بعض اہل باطل کی طرف سے شروع ہو رہا ہے۔ وہ ناواقف نومسلم جماعتوں کو بہکا رہے ہیں اور اسلام سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم کو اس کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور واقعی اب تک ہم کو اس طرف توجہ نہ تھی۔ ہم اپنی کوتاہی کی تاویل نہ کریں گے۔ تاویل سے کیا ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کو تو حقیقت حال کا علم ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرے۔ واقعی اب تک ہم اس کام سے غافل تھے۔ اب جو غور کر کے دیکھا جاتا ہے۔ تو حالت یہ ہے کہ بعض دیہات والوں کا اسلام نہایت کمزور اور نازک ہو رہا ہے۔ بعض لوگوں کو نماز روزہ کی تو کیا خبر ہوتی ان کو کلمہ تک بھی نہیں آتا۔ ان لوگوں میں تبلیغ اسلام کی سخت ضرورت ہے، خیر اب تک جو غفلت ہوئی وہ تو ہو چکی۔ لیکن آئندہ کے لئے ہم کو ہوشیار ہو جانا چاہیئے۔

ضرورت اخلاص

اور بحمد اللہ اس وقت کسی قدر توجہ مسلمانوں کو اس کام کی طرف شروع ہوئی ہے۔ مگر ان میں بھی غضب یہ ہے کہ انتظام نہیں ہے۔ بلکہ محض رسم پرستی ہے۔ کہ آگرہ کی طرف بعض اہل باطل نے کچھ نومسلموں کو مرتد بنانے کی کوشش کی تھی۔ تو جس کو دیکھو آگرہ ہی میں تبلیغ کرنے جا رہا ہے۔ سب کے سب آگرہ ہی میں آگرے۔ حالانکہ کام کا طریقہ یہ تھا کہ ایک جماعت آگرہ جاتی، دوسری جماعت دوسرے مقامات کی خبر لیتی۔ کہ اور تو کسی جگہ اس قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ مگر ایسا کرنے سے نام نہ ہوتا۔ کیوں کہ آگرہ میں تبلیغ کرنے والے پہنچے ہوئے ہیں۔ وہاں جائیں گے تو سب کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ہاں یہ بھی تبلیغ کرنے آئے ہیں اور اخباروں میں بھی ان کی آمد شائع ہو جائے گی۔ کیونکہ اخبار والوں کی توجہ ضلع آگرہ ہی کی طرف زیادہ ہے، دوسرے مقامات پر جانے سے یہ نام نہ ہوگا۔ مگر مسلمان کو کام کرنا چاہیے۔ نام سے کیا لینا۔ اسلام نام و نمود سے نہیں پھیلا۔ بلکہ کام سے پھیلا ہے اور کام بھی وہ جو خلوص کے ساتھ محض اللہ واسطے تھا۔

علماء پر بے جا الزام

اور مزہ یہ ہے کہ اخباروں میں لیڈروں کی زبان پر اس فتنہ ارتداد کا سارا الزام علماء کے سر رکھا گیا ہے۔ کہ ان کی غفلت کی وجہ سے یہ فتنہ پیدا ہوا۔ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ سب کا الزام علماء پر ہے۔ سلطنت اسلام پر کوئی بلا آوے تو علماء کی بدولت۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر کوئی وبال آئے تو علماء کی بدولت۔ مسلمانوں میں افلاس آئے تو علماء کی بدولت۔ کہ یہ سود کو حلال نہیں کرتے۔ نومسلم مرتد ہوں تو اس کا الزام بھی مولویوں پر ہے کہ انہوں نے تبلیغ نہیں کی۔ ان نومسلموں کی خبر نہیں لی۔ بس آج کل علماء کی وہ حالت ہے جو انوری شاعر نے کہا ہے۔

ہر بلائے کز آسمان آید	گرچہ بر دیگرے روا باشد
بر زمیں نا رسیدہ می پرسد	خانہ انوری کجا باشد

(ہر بلا آسمان سے آتی ہے اگرچہ حالات خود دگرگوں ہوں زمین پر ایک نہ پہنچنے والا شخص پوچھتا ہے کہ انوری کا گھر کہاں ہے)

یا جیسے مولوی سالار بخش صاحب وعظ میں گناہوں کی لمبی فہرست بیان کر کے کہ آج کل لوگ زنا اور حرام خواری اور ترک صلوٰۃ وغیرہ میں مبتلا ہیں۔ اخیر میں یہ کہا کرتے تھے کہ یہ سارا فساد مرچوں کا ہے۔ تو جیسے ان کے نزدیک ہر گناہ اور شر کا سبب مرچ تھی۔ ایسے ہی آج کل کے مسلمانوں کے نزدیک ہر بلا کا سبب مولوی ہیں۔

جیسے ایک مسافر کی حکایت ہے۔ کہ وہ سرائے میں ٹھہرا اور بھٹیاری کو آٹا دال وغیرہ دے کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ کہ میرا کھانا پکا دے اور سامنے اس لئے بیٹھا تا کہ بھٹیاری چوری نہ کر سکے۔ جب بھٹیاری نے یہ دیکھا کہ سپاہی تو میرے اوپر مسلط ہو کر بیٹھ گیا۔ تو اس نے یہ تدبیر کی کہ کھانا پکا کر جب سپاہی کے سامنے رکھا تو اپنے لڑکے سے کہا کہ خان صاحب کے ساتھ تو بھی بیٹھ جا (تا کہ اسی طرح کچھ وصول ہو) چونکہ دستر خوان پر سے کسی کو اٹھانا شرافت کے خلاف تھا اس لئے سپاہی خاموش ہو گیا اور بھٹیاری کے لڑکے کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ بھٹیاری پنکھا ہاتھ میں لے کر پاس ہی بیٹھ گئی اور پنکھا جھلنے لگی۔ اتفاق سے بھٹیاری کی ریح صادر ہوئی۔ اس نے اپنی خفت اتارنے کو لڑکے کو ایک چپت مارا کہ دور موئے یہ کیا کرتا ہے۔ سپاہی سمجھ گیا تو اس نے قصداً

رتج صادر کر کے لڑکے کو ایک چپت رسید کیا اور کہا سسرے کرے گا کوئی مگر پٹے گا تو ہی۔

بس یہی حال آج علماء کا ہے۔ کہ سارا الزام انہی کو دیا جاتا ہے۔ کہ سلطنت اسلام کا زوال بھی انہی کی غفلت سے ہے اور فتنہ ارتداد بھی انہی کی غفلت سے ہے۔ آگے کو یہ کرنا کہ بس کسی کو دست آئیں تو اس میں بھی علماء کا قصور نکال دینا اور کسی کو دق ہو تو اس میں بھی علماء کی خطا کہہ دینا۔ کسی جگہ طاعون و ہیضہ ہو تو اس میں بھی علماء ہی کی خطا بتلا دینا۔ کیا یہی انصاف ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ علماء نے بھی اس معاملہ میں کوتاہی کی ہے مگر یہ میں تسلیم نہیں کر سکتا۔ کہ سارا انہی کو دیا جائے اور سارا قصور انہی کا بتلایا جائے آخر آپ کے ذمہ بھی کچھ تھا یا نہیں۔

عوام کی ذمہ داری

میں بتلا چکا ہوں۔ کہ تبلیغ صرف مولویوں کے ذمہ نہیں۔ بلکہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے۔ البتہ تبلیغ عام بطریق وعظ کے علماء کے ساتھ خاص ہے۔ باقی تبلیغ خاص انفرادی طور پر ہر شخص کے ذمہ ہے اور تبلیغ عام جو علماء کے ساتھ خاص ہے تو اس میں بھی عام مسلمانوں کے ذمہ یہ کام ہے۔ کہ وہ علماء کے ساتھ خاص ہے تو اس میں بھی عام مسلمانوں کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ علماء کے لئے اس کے اسباب مہیا کریں مثلاً چندہ کر کے سفر خرچ ان کو دیا جائے۔ تا کہ جہاں تبلیغ کی ضرورت ہو وہاں جائیں اور سفر خرچ لے کر کرایہ ریل وغیرہ سے بے فکر ہو جائیں۔ کیوں کہ علماء کے پاس تبلیغ کے لئے زبان تو ہے۔ مگر کرایہ وغیرہ کے لئے روپیہ تو نہیں ہے اور ان کے ذمہ یہ کام بھی نہیں ہے۔ کہ وہ آپ سے بھیک مانگتے پھریں۔ کہ ہم کو روپیہ دو تا کہ تبلیغ کے لئے سفر کریں، یہ کام عام مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے کہ وہ خود چندہ جمع کر کے علماء کو آگے کریں اور ان سے عرض کریں کہ یہ روپیہ ہے اور یہ کام ہے۔ جس طرح آپ کہیں۔ اس کام کو شروع کیا جائے۔

مگر آج کل عوام کی یہ حالت ہے کہ علماء کو اول تو آگے کرتے نہیں اور اگر آگے کریں گے بھی تو اس طرح جیسے بیل بہلوان کا امام ہوتا ہے۔ کہ آگے تو وہ رہے مگر بہلوان کے اشارے پر چلتا رہے۔ یوں آج کل علماء کو امام بنایا جاتا ہے۔ کہ جھنڈا لے کر آگے تو وہ رہیں مگر کن آنکھوں سے وہ مقتدیوں کے اشارہ کو دیکھتے رہیں۔ کہ ان کی مرضی کیا ہے۔ جیسے امام

نماز میں جب بھی بولتا ہے تو مقتدیوں کو تا کتا ہے۔آج کل علماء سے دو باتوں کی درخواست کی جاتی ہے ایک پالیسی کی دوسری پالیسی کی۔ایک انگریزی کی پالیسی ہے۔ایک فارسی کی یعنی پاؤں چاٹنا کہ علماء اس زمانہ کی رفتار کے موافق سیاسی امور میں بھی دخل دیں اور لیڈروں کی خوشامدیں بھی کرتے رہیں۔ان کی رائے کا اتباع کرتے رہیں کہ جہاں ان کی زبان سے کوئی بات نکلے۔علمائے فوراً ہدایہ وغیرہ سے اس کا فتویٰ نکال دیں اور جب ان کی رائے بدلے تو ہدایہ ہی سے پھر اس کے خلاف کا بھی فتویٰ نکال دیں۔

علماء حقانی کا مذاق

سو یاد رکھو! جو عالم حقانی ہوگا۔وہ دین کے معاملہ میں کسی کی رعایت ہرگز نہ کرے گا۔ نہ کسی کی موافقت و مخالفت کی پرواہ کرے گا۔ ان کا مذاق تو یہ ہے۔

ترکت اللات والعزی جمیعا　　　　كذلك يفعل الرجل البصير

(میں نے لات اور عزیٰ سب کو چھوڑا،ایک صاحب فراست مرد ایسا ہی کرتا ہے)

وہ خدا کی رضا کے سامنے تمام دنیا پر لات مارتے ہیں۔اگر سارا عالم بھی ان کے خلاف ہو جائے۔تب بھی وہ سرمو شریعت سے تجاوز نہ کریں گے۔چاہے اس میں ان کی عزت ہو یا ذلت ہو۔ان کا تو حال یہ ہے:

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک یہ بدنامی ہے لیکن ہمیں سوائے بدنامی کے اور کچھ مطلوب نہیں)

ان کا مقصود محض رضائے حق ہے اور کچھ نہیں:

یابم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم　　　　حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

(میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں میں اس کی جستجو کرتا ہوں مجھے یہ ملے یا نہ ملے اس کی آرزو کرتا ہوں)

اتباع علماء

صاحبو! اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو علماء کا اتباع کرو۔ان کو متبوع بناؤ۔تابع نہ بناؤ۔ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔کہ ان میں انتخاب کرلو۔جو نا قابل ہو ان کی اتباع نہ کرو اور جو قابل

ہوں ان کو مقتداء بناؤ۔ کیوں کہ محض کتابیں پڑھ لینے سے آدمی عالم نہیں ہو جاتا بلکہ علم دوسری چیز کا نام ہے۔ جیسے طب کی کتابیں پڑھ لینے سے ہر شخص طبیب نہیں بن جاتا۔ بلکہ جس کو طریقہ علاج حاصل ہو جائے۔ وہی طبیب ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کو حدیث و قرآن اور فقہ کی کتابیں پڑھ لینے سے علم کی حقیقت حاصل نہیں ہوتی۔ محض الفاظ یاد ہو جاتے ہیں۔ حقیقت علم حاصل ہونے کے لئے کتابوں کے سوا ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ جس کو اس زمانہ کا ایک شاعر خوب کہہ گیا ہے:

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا   دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

یعنی صحبت اہل اللہ کی بھی ضرورت ہے اور اس سے آج کل اکثر علماء کورے ہیں۔ الا ماشاء اللہ اس طرف توجہ ہی نہیں۔ اسی واسطے حقیقی علم والے بہت تھوڑے ہیں۔

رہا دنیاداروں کا یہ خیال کہ علماء کو دنیا کی خبر نہیں۔ اس کو ہم زیادہ جانتے ہیں۔ اسی لئے علماء کو دنیوی معاملات و سیاسیات میں ہمارا اتباع کرنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ ان معاملات میں علماء کس جزو کو نہیں جانتے۔ آیا اس جزو کو نہیں جانتے جو محض دنیا ہے۔ یعنی واقعات تو یہ ان کے واسطے فخر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

تا بدانی ہر کہ ایزداں بخواند   از ہمہ کار جہاں بے کار ماند

(جس کو اللہ تعالیٰ اپنے کام میں لگا لیتے ہیں اس کو دنیا کے سب کاموں سے بیکار کردیتے ہیں)

اور اگر یہ کہو کہ ان معاملات میں جو جزو دین کا ہے۔ یعنی ان واقعات کے احکام علماء اس کو بھی نہیں جانتے تو یہ بالکل غلط ہے وہ دین کو تم سے زیادہ جانتے ہیں اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ وائسرائے کپڑا بننا نہیں جانتے۔ تو یہ کوئی نقص نہیں۔ بلکہ ان کے واسطے فخر ہے کیونکہ وائسرائے کا یہ کام نہیں کہ وہ کپڑا بننا اور جوتا سینا بھی جانتا ہو۔ ہاں احکام و قوانین ہر پیشہ کے وہ جانتا ہے۔ کہ جولاہوں کو کس قسم کا کپڑا بننا قانون سے جائز ہے اور کس قسم کا نہیں اور موچیوں کو کیسا جوتا بنانا جائز ہے اور کیسا نہیں اور ان کی آمدنی پر ٹیکس ہوگا یا نہیں۔ یوں ہی علماء کو دنیا کے کام کرنا تو نہیں آتے۔ لیکن احکام ہر کام کے معلوم ہیں۔ تم اپنے معاملات کو ان کے سامنے پیش کرو۔ پھر دیکھو وہ فتویٰ دیتے ہیں یا نہیں۔ پس جو علماء احکام کے جاننے والے ہیں اور بے غرض ہیں ان کو مقتداء بناؤ۔ ان کو تابع نہ بناؤ۔ تبلیغ کے کام میں ان کو آگے کرا اور تم ساتھ ساتھ رہو

اوران کے مشورہ سے ہر کام کرو۔ پھر کبھی تو وہ خود آ کر رہ جائیں گے اور کبھی خود نہ جائیں گے۔ بلکہ تم کو بھیجیں گے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تو غزوہ میں خود تشریف لے جاتے ہیں اور کبھی ایک شخص کو سردار بنا کر چند صحابہ رضی اللہ عنھم کو بھیجتے تھے۔ یہ نظیر ہے کام کرنے کی۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ علماء خود ہی جائیں۔ جیسا کہ عوام نے سمجھ رکھا ہے۔ کہ علماء کے ذمہ ہے۔ کہ وہ تمام ملک کا اور تمام دیہات کا دورہ کریں۔ سو یاد رکھو۔ اس طرح کام نہیں ہو سکتا۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ۔ (اور (ہمیشہ کے لئے) مسلمانوں کو یہ بھی نہ چاہیے کہ جہاد کے واسطے سب کے سب ہی نکل کھڑے ہوں پس ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تا کہ یہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ حاصل کر سکیں)

یعنی جہاد کے لئے سب مسلمانوں کو نہیں جانا چاہیے۔ بلکہ ایک جماعت جائے۔ تا کہ باقی لوگ دین کا علم حاصل کریں۔ شریعت کا حکم تو یہ ہے کہ سارے آدمی ایک ہی طرف نہ جھکیں۔ بلکہ ایک بڑے فرقہ میں سے چھوٹی سی جماعت اس کام کے لئے جائے۔ باقی لوگ فقہ دین حاصل کریں۔ شریعت تو فقہ دین کو اصل بتاتی اور دوسرے کاموں کو اس کی فرع قرار دیتی ہے مگر آج کل ہندوستان میں ایک ہوا چلی تھی۔ جس میں ہر تقریر میں یہ کہا جاتا تھا کہ مدرسوں کو آگ لگا دو۔ خانقاہوں کو بند کر دوں اور سب کے سب اس تحریک میں شریک ہو کر کام کرو۔ نامعلوم ان کے پاس بجز رائے محض کے اس پر کیا دلیل تھی۔

تبلیغ میں غلو کی ممانعت

اور یہ رائے تو شریعت اور عقل وتمدن دونوں کے خلاف ہے۔ شریعت کے خلاف تو اس لئے ہے کہ آیت قرآنیہ میں سب کے جانے کی ممانعت صریح مذکور ہے اور عقل وتمدن کے خلاف اس لئے ہے کہ اہل تمدن کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی مہم کام درپیش ہوتا ہے۔ تو ریل ڈاک اور عدالت دیوانی وغیرہ سب محکمے برابر چلتے رہتے ہیں۔ اور ایک خاص جماعت امر مہم میں لگی رہتی ہے۔ بلکہ ان کا اصول تو یہ ہے کہ جو جماعت امر مہم کو سرانجام دینے والی ہے اس کے سوا دوسرے محکموں کے

ملازموں کو اس مہم کی خبر بھی نہیں کرتے۔ کہ اس میں حکومت کو کامیابی ہو رہی ہے یا ناکامی۔ تاکہ دوسرے محکموں کے ملازم بے فکر ہو کر اپنے کام میں لگے رہیں اور خبر ہونے سے ان کے قلوب پریشان ہوں گے۔ تو کچھ کام نہ ہو سکے گا۔ غرض ایک کام کے لئے سب کاموں کو کوئی بند نہیں کرتا۔ اور یہی طریقہ ہے کام کا۔ اس کے خلاف صورت میں کام ہو نہیں سکتا۔

یاد رکھو! محکمہ تعلیم اور محکمہ مال تمام کاموں کی جڑ ہے۔ اگر محکمہ تعلیم نہ رہا تو آئندہ کام کرنے والے کیوں کر پیدا ہوں گے اور محکمہ مال نہ رہا تو چندہ کون دے گا۔ پس یہ کیسی حماقت تھی ان لوگوں کی جو مدرسوں اور خانقاہوں کو ایک ذرا سے کام کے واسطے بند کرنا چاہتے اور سب مسلمانوں کو اسی میں لگانا چاہتے تھے۔ افسوس! یہ لوگ اپنے کو سیاست دان سمجھتے ہیں مگر واللہ ان کو سیاست کی ہوا بھی نہیں لگی۔

صاحبو! سیاست کو بھی وہی لوگ زیادہ جانتے ہیں جن کو تم دنیا سے بے خبر اور تاریک خیال کہتے ہو۔ کیونکہ وہ شریعت کو تم سے زیادہ جانتے ہیں اور شریعت نے سیاست کے اصول سب سے بہتر بتلائے ہیں۔ پس تبلیغ میں بھی یہ صورت نہ ہونا چاہیے۔ کہ علماء سب کے سب آگرہ ہی میں جا گریں۔ بلکہ اصول سے کام کرنا چاہیے۔ میں نے بتلا دیا ہے کہ تبلیغ کے مختلف شعبے ہیں۔ خطاب عام و خطاب خاص اور خطاب بالمنصوص اور خطاب بغیر المنصوص بس خطاب عام اور خطاب بغیر المنصوص تو علماء ہی کریں اور خطاب بالمنصوص کے ساتھ ہر مسلمان تبلیغ کا کام کر سکتا ہے اور اسی لئے تبلیغ کا امر سب کو دیا گیا ہے۔

اب مسلمانوں میں دو جماعتیں ہیں۔ ایک علماء کی، ایک عوام کی اور دونوں میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک فارغ البال، دوسرے مشغول۔ پس جو علماء اور عوام فارغ ہوں تو وہ خود کو اسی کام کے لئے وقف کر دیں اور جو لوگ مشغول ہیں وہ اپنی فرصت اور تعطیل کے زمانہ میں کبھی کبھی دیہات کا دورہ کر لیا کریں اور امراء بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ ہو لیا کریں۔ اس کا بہت اچھا اثر ہوگا۔ کہ کفار کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کام میں امراء و غریب سب شریک ہیں۔ اس کا ان پر رعب ہوگا۔

تدبیر تبلیغ

مگر یہ نہ کیا جائے کہ سارے ایک ہی طرف ڈھل جایا کریں۔ جیسا آج کل ہو رہا

ہے۔ کہ جو اٹھتا ہے آگرہ ہی جا پہنچتا ہے۔ بلکہ تدبیر یہ ہے کہ ہر ضلع میں ایک مجلس تبلیغ قائم کردی جائے جس کا نام وغیرہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ عہدہ داروں کے نام مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آج کل انجمن کے قوانین اور عہدہ داروں کی فہرست میں تو رجسٹر سیاہ کئے جاتے ہیں۔ مگر کام نہیں ہوتا۔ ہم کو کام کرنا چاہیے۔ جتنا جس سے ہوسکے۔ بڑے پیمانہ کی بھی فکر نہ کرو۔ چھوٹے ہی پیمانہ پر کام شروع کردو۔ ہماری حالت یہ ہے۔ کہ یا تو کام کرنے میں ٹیپ ٹاپ سے۔ ورنہ کچھ نہیں کرتے۔ وہی مثل ہے "کھاؤں تو گھی سے ورنہ جاؤں جی سے" یہ بڑی غلطی اور حماقت ہے۔

یاد رکھو! ابتداء ہر کام کی کمزور اور معمولی ہوتی ہے۔ ترقی تدریجاً ہی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے اس عالم میں اپنے افعال کو بھی تدریجاً ہی ظاہر کیا ہے۔ کہ اول نطفہ قرار پاتا ہے پھر نو ماہ بعد بچہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ نشو و نما ہو کر پندرہ برس میں لڑکا بالغ ہوتا ہے۔ حالانکہ حق تعالیٰ قادر ہیں کہ ایک ہی منٹ میں سب کچھ کردیں۔ جیسا کہ جنت میں ہوگا۔ کہ جس شخص کو وہاں اولاد کی تمنا ہوگی۔ تو بیوی کے پاس جاتے ہی حمل قرار پاکر فوراً بچہ پیدا ہوگا اور اسی وقت باپ کے برابر ہو جائے گا۔ خدا تعالیٰ کا اس عالم میں یہ نمونہ ظاہر نہ کرنا اور تدریجاً افعال کرنا ہماری تعلیم ہی کے لئے تو ہے کہ تم دنیا میں ابتدائے عمل کے ساتھ ہی ترقی و عروج کے طالب نہ بنو۔ بلکہ چھوٹے پیمانہ ہی پر کام شروع کردو اور اس میں لگے رہو۔ رفتہ رفتہ ایک دن عروج و کمال بھی حاصل ہو جائے گا۔ تم سے جتنا کام ہوسکتا ہے۔ اتنا ہی کرنے لگو۔ تم اسی کے مکلف ہو۔ اس سے زیادہ کے مکلف نہیں۔ حق تعالیٰ اسی میں برکت دیدیں گے۔ انجمن کا نام کرنے اور عہدہ داروں کے مقرر کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ اشتہاروں اور اخباروں میں چھاپنے سے کچھ ہوتا ہے۔ فائدہ کام کرنے سے ہوتا ہے۔ چاہے تھوڑا ہی ہو۔ تو دو چار آدمی ہی مل کر تبلیغ شروع کردو اور اپنی قلت پر نظر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ذات پاک کے ذریعہ سے اسلام کو عرب سے تمام دنیا میں پہنچایا ہے۔ سو وہ خدا اب بھی موجود ہے۔ تم اسی پر بھروسہ کرکے کام شروع کرو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنھم کی مثال قرآن میں یوں بیان فرمائی ہے:

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔

کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بیج زمین میں بویا جائے تو وہ اول اپنی سوئی کو نکالتا ہے۔ پھر خدا اس کو پانی ہوا اور مٹی وغیرہ سے قوت دیتا ہے تو قوی مضبوط ہو کر تناور سیدھا درخت ہو جاتا ہے۔ سو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ذرا سے بیج سے کتنا بڑا درخت پھیلتا ہے۔ جو سارے محلّہ پر سایہ فگن ہوتا ہے۔

جب جمادات میں ادنیٰ تخم کی یہ حالت ہے تو انسانوں میں ایک دو آدمی اللہ کے بھروسہ پر کام کریں اور ان کے کام کو قوت و ترقی حاصل ہو جائے۔ تو کیا بعید ہے۔ مگر آج کل مشکل یہ ہے کہ کام تو شروع نہیں ہوتا اور پہلے ہی سے یہ لیڈری دوڑتی ہے کہ اس تجویز کو اخباروں میں شائع کرادیں۔ اشتہار چھپوادیں۔

صاحبو! کیا یہ ریا نہیں اور کیا ریا وغیرہ سے ممانعت نہیں اور وہ ممانعت کس کے لئے ہے؟ کیا یہ احکام کفار کے واسطے ہیں؟ بلکہ مسلمانوں ہی کو ریاء وغیرہ سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ کفار مخاطب بالفروع نہیں ہیں۔

بعضے اس پر یہ کہا کرتے ہیں کہ ہم اخبارات و اشتہارات کے ذریعہ سے اظہار اس لئے کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اس سے ترغیب ہوگی۔ میاں بس رہنے دو۔ یہ تو تاویل ہی تاویل ہے۔ ذرا دل کو ٹٹول کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ بجز شہرت اور نام کے کچھ مقصود نہیں اور اگر کسی کی واقعی غرض ترغیب ہی کی ہو جب بھی اس کو چاہیے کہ اس اشاعت و اشتہار کے متعلق اول کسی عالم محقق بے غرض سے مشورہ کرلے۔

حکیم الامت کا طریق تبلیغ

میں نے اپنے یہاں سے دو مبلغ بھیجے ہیں۔ مگر صورت یہ ہے کہ نہ تو کسی اخبار میں ان کا نام شائع ہوا، نہ کسی انجمن میں۔ پس وہ بے چارے خود ہی کام کر رہے ہیں اور میں نے ان کو بھیجتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا تھا۔ کہ بھائی! میں تم سے حساب نہ لوں گا۔ اگر مجھے تم پر اعتماد نہ ہوتا۔ تو میں تم کو اتنا بڑا کام دین کا کبھی سپرد نہ کرتا اور جب میں نے تم کو اس کام کے لائق سمجھا ہے۔ تو اب تم سے چار پیسوں کا حساب لینا بے کار سمجھتا ہوں، مگر ان کی لیاقت یہ ہے۔ کہ وہ برابر پیسہ کا حساب بھیجتے ہیں۔

کام کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ جس کو قابل سمجھ کر کام سپرد کیا جائے۔ اس سے حساب[1] نہ لیا جائے اور اگر اس پر اتنا اطمینان نہ ہو اور حساب لینے کی ضرورت محسوس ہو تو ایسے شخص کو کام ہی دینا نہ چاہیے اور کام کرنیوالے کی قابلیت یہ ہے کہ وہ باوجود دوسرے کے اطمینان کے برابر حساب بھیجتا رہے۔ اس سے اس کے اطمینان میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔

نیز میں نے ان دونوں میں سے کسی کو امیر و مامور بھی نہیں بنایا۔ گو اس میں بڑی مصلحت ہے۔ کہ رفقاء میں ایک امیر ہو۔ ایک مامور ہو۔ مگر اس کے لئے سلامت طبائع شرط ہے اور آج کل طبائع ایسی گندی ہیں۔ کہ جہاں ایک کو امیر بنایا۔ فوراً دوسرا اسیر ہو جاتا ہے۔ یعنی امیر صاحب اس پر جا و بے جا حکومت کرتے ہیں اور مامور کو بھی اس کی امارت ناگوار ہوتی ہے۔ دوست بن کر تو آج کل دوسرے کا کہنا مان لیتے ہیں۔ مگر محکوم بن کر کہنا نہیں مانتے۔

اور گو مجھے اپنے مبلغوں کے ساتھ یہ بدگمانی نہ تھی۔ مگر عام طبائع کا حال دیکھ کر میں نے اس سے احتراز کیا کہ اپنی طرف سے ایسی صورت کیوں کر اختیار کروں؟ جس میں اس زمانہ کی حالت کے اعتبار سے خطرہ کا احتمال ہے۔ تو میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ جب تک تم دونوں میں اتفاق رہے اس وقت تک اتفاق سے مل کر کام کرو اور جب کچھ نزاع ہو۔ تو اسی وقت سرمایہ کو بانٹ کر آدھا ہر شخص لے لے۔ پھر جس کا جی چاہے مشرق کو چلا جائے اور جس کا جی چاہے۔ مغرب کو چلا جائے دونوں الگ الگ کام کرو۔

تبلیغ میں اعتدال

صاحبو! میں کیا کہوں۔ کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہے۔ اپنے ہی گھر کا راز کھلتا ہے۔ آج کل ہماری حالت یہ ہے کہ اجتماعی کام میں ہمیشہ گڑبڑ ہوتی ہے۔ جس کام میں جتنا زیادہ اجتماع ہوگا۔ اتنا ہی جھگڑا ہوگا۔ ہم لوگوں نے اپنی حالت سے دوسروں کو دکھلا دیا ہے۔ کہ ہم میں اجتماع کے

---

[1] حدیث میں جو مصدق سے حساب لینا وارد ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ وہ رقم بذریعہ حکومت وصول ہوتی ہے۔ تو ممکن ہے کہ دینے والے مصدق پر مطمئن نہ ہوں۔ اس لئے حاکم کو حساب لینا چاہیے۔ بخلاف چندہ کے کہ وہ دینے والے بطیب خاطر جس کو دیں گے اس پر مطمئن ہیں۔ پھر اس نے جن کو دیا وہ اس پر مطمئن ہے۔ اس لئے مصدق سے حساب لینے پر اس کو قیاس نہیں کر سکتے۔ ۱۲ منہ

ساتھ کام کرنے کی بالکل قابلیت نہیں۔ کیوں کہ رات دن کا مشاہدہ ہے۔ کہ جس کام میں جتنا زیادہ ہنگامہ ہوتا ہے۔ جو لوازم اجتماع سے ہے۔ وہ جلدی ہی ختم بھی ہو جاتا ہے۔ بقا اسی کام کو ہوتا ہے جو تدریج کے ساتھ بڑھے اور اعتدال کے ساتھ چلتا رہے۔ جو لوازم انفراد سے ہے۔ ورنہ وہی حالت ہوتی ہے کہ جیسے بازی گر شعبدہ سے آم کا درخت لگاتے ہیں کہ وہ ذرا سی دیر میں پیدا بھی ہو جاتا ہے اور فوراً ہی پھل بھی لے آتا ہے اور جلدی ہی فنا بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ ابتداء ہی سے بڑی لمبی چوڑی تجویزیں کرتے اور انجمن اور عہدہ دار مقرر کرتے اور جلسہ کرتے ہیں۔ ان سے کام کچھ نہیں ہوتا۔ چار دن کے بعد سب باتیں ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں۔

حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کہ جب تم کسی کو ایسی حالت میں دیکھو۔ کہ اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جاتا ہوں کہ بہت کام کرتا ہے۔ اس کو شمار میں نہ لاؤ اور جس کو اعتدال سے کام کرتا ہوا دیکھو۔ فارجوہ اس سے امید رکھو۔ کہ ان شاء اللہ یہ کامیاب ہوگا۔

شریعت کی تعلیم تو یہ ہے۔ مگر آج کل کچھ مذاق ایسا بدلا ہے۔ کہ اظہار و اشتہار و ٹیپ ٹاپ کے بغیر کام کرنا ہی نہیں جانتے۔ یاد رکھو جوش سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ ہوش سے کام چلتا ہے۔ پس جوش اور ہنگامہ کی ضرورت نہیں۔ ہوش سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس کا وہی طریقہ ہے کہ جس سے جتنا ہو سکے بس اللہ کا نام لے کر شروع کر دے۔ نہ انجمن کی ضرورت ہے، نہ سیکرٹری کی، بس دو چار دس پانچ آدمی جتنے متفق ہو سکیں، کام شروع کر دیں اور اگر کوئی متفق نہ ہو تو تم اکیلے ہی کام شروع کر دو، گاؤں والوں کو کلمہ پڑھانا، نماز سکھا دینا تو ایسا کام ہے جو ہر مسلمان تھوڑی سی لیاقت کا بھی کر سکتا ہے۔

ہاں اس کی ضرورت ہے۔ کہ کسی عالم سے جو بستی میں رہتا ہو۔ مشورہ کرتے رہا کرو۔ مگر صرف اس سے پوری طرح کام چلنا دشوار ہے۔ بلکہ تبلیغ عام کی بھی ضرورت ہے۔ جو عالم ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ بعض جگہ دیہات والوں کو کفار نے شبہات میں ڈال دیا ہے۔ ان شبہات کا دور کرنا اور جواب دینا بھی ضروری ہے اور یہ کام ہر شخص کا نہیں۔ اس لئے اس کی بھی ضرورت ہے۔ کہ ہر ضلع میں ایک عالم بھی مبلغ ہو۔ علماء اس کام کیلئے حاضر ہیں اور ان شاء اللہ

بہت مل جائیں گے۔ مگران سے کام لینے کی صورت یہ ہے۔ کہ پہلے ان کے اہل وعیال کے نفقہ کا بندوبست کردیا جائے۔ کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ کہ علماء کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ اس وقت ہر شخص کسی نہ کسی حیلہ میں لگا ہوا ہے۔ جس میں ان کو معقول تنخواہ مل رہی ہے جس سے ان کے گھر کا خرچ چل رہا ہے۔ اب ان کو حیلہ سے چھڑا کر تبلیغ میں جبھی لگا سکتے ہیں جب کہ پہلے ان کی تنخواہ کا انتظام ہوجائے۔ اس کی ایک سہل تدبیر یہ ہے کہ ہر ضلع میں ایک امیر یا امراء وغرباء سب مل کر ایک مبلغ کا خرچ اپنے ذمہ کرلیں۔ اس صورت میں کسی انجمن یا مرکز سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ بس مبلغ اور مبلغ دو سے واسطہ ہوگا۔ اگر اس کا انتظام ہوجائے تو کام نہایت اطمینان سے ہوتا رہے گا۔ اور دوامًا ہوتا رہے گا۔ ہر چند کہ ایک مرکز کا سب کو تابع ہونا بہت اچھا ہے۔ مگر آج کل دشواری تو یہی ہے۔ کہ مرکز کس کو بنایا جائے۔ تجربہ یہ ہے کہ چند روز کے بعد یوں کہنا پڑتا ہے۔ مرائے کز (بمعنی کج) اس لئے کسی مرکز یا انجمن کے تابع ہوکر کام کرنا آج کل دشوار ہے، پس سہل صورت یہ ہے کہ ہر ضلع کے مسلمان باہم مل کر ایک مبلغ اپنے ضلع کے واسطے مقرر کرلیں اور اس کو خود تنخواہ دیا کریں اور یہ کچھ مشکل نہیں۔ اگر مسلمانوں کو ضرورت کا احساس ہوجائے اور اس کی فکر سب کو ہوجائے۔ تو ایک مبلغ کی تنخواہ تیس یا چالیس روپیہ ایک ضلع کے مسلمان بہت سہولت سے دے سکتے ہیں۔

البتہ اتنی ضرورت پھر بھی ہوگی۔ کہ روپیہ کا انتظام کرکے مبلغ کی تجویز اور راہ عمل کی تحقیق کے لئے کسی ایک عالم کو مشورہ کے واسطے منتخب کرلو اس کے مشورہ سے مبلغ رکھو اور اسی کی رائے سے تبلیغ کا طریقہ اختیار کرو اور مبلغ سے کہہ دو۔ کہ جس طرح فلاں شخص کہے۔ اس طرح کام کرو۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو پھر جس عالم پر یا جس انجمن کے سیکرٹری وغیرہ پر اعتماد ہو۔ اس کے پاس رقم بھیج دو اور لکھ دو کہ اس رقم سے ہمارے ضلع کے واسطے کوئی آدمی تجویز کرکے بھیج دیا جائے۔ اس صورت میں مبلغ کی تنخواہ وغیرہ کا معاملہ اس عالم یا انجمن کے ساتھ وابستہ ہوگا۔

تبلیغ اور سوال

مگر اب تو غضب یہ ہے کہ مسلمان یوں چاہتے ہیں۔ کہ علماء خود ہی روپیہ جمع کریں

اور خود ہی مبلغ تجویز کریں اور سب اپنے گھروں میں بے فکر بیٹھے رہیں۔

جیسے اکبر نے ایک ڈوم کو انعام میں ہاتھی دیا تھا۔ ڈوم بڑا گھبرایا کہ ہاتھی تو بادشاہ نے دے دیا۔ اس کے کھانے کے واسطے خوراک کہاں سے لاؤں گا۔ ایک دن اکبر کی سواری جو قلعہ سے نکلی ۔تو ڈوم نے ہاتھی کے گلے میں ڈھول ڈال کر راستہ میں چھوڑ دیا۔ اکبر نے اپنے ہاتھی کو راستہ میں اس حلیہ سے پھرتا ہوا دیکھا۔ تو مصاحبوں سے دریافت کیا۔ کہ یہ شاہی ہاتھی اس حالت سے کیوں پھر رہا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ کہ حضور نے یہ ہاتھی فلاح ڈوم کو انعام میں دیا تھا۔ حکم ہوا اس کو بلایا جائے۔ چنانچہ وہ لایا گیا اور اس سے سوال ہوا۔ کہ تم نے شاہی ہاتھی کو اس طرح کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ کہا حضور نے غلام کو ہاتھی دے دیا مگر اس کی خوراک کے لئے کچھ عنایت نہ ہوا۔ تو میں نے اس کے گلے میں ڈھول ڈال دیا ہے کہ بھائی جس طرح میں گا بجا کر کھاتا ہوں۔ تو بھی گا بجا کے اپنا پیٹ بھرے۔ اکبر ہنسا اور اسی وقت اس کے راتب کا بھی انتظام کر دیا۔

تو آج کل کے مسلمانوں کی رائے یہ ہے کہ علماء ڈوم کے ہاتھی کی طرح خود ہی گا بجا کر چندہ کریں اور خود ہی تبلیغ بھی کریں۔ تو صاحبو! علماء اس طرح نہیں کر سکتے۔ اور جو ایسا کرتے ہیں۔ اچھا نہیں کرتے۔ چندہ کرنا علماء کا کام نہیں ہے، یہ کام دنیا والوں کا ہے اور اس کا انتظام سب مسلمانوں کے ذمہ ہے۔ ہم سے یہ نہیں ہوسکتا۔ کہ کام بھی کریں اور بھیک بھی مانگیں۔ آپ کو شرم نہیں آتی۔ کہ جن علماء کو مقتدا سمجھتے ہو۔ انہیں سے بھیک منگوانا چاہتے ہو۔ آپ کو لازم ہے کہ رقم کا انتظام خود کر دو اور کام کے لئے علماء سے عرض کرو۔

میں نے اپنے مبلغین سے کہہ دیا ہے۔ کہ جب تمہارے پاس اتنی رقم رہ جائے۔ کہ اس سے اپنے گھر پہنچ سکو۔ اس وقت مجھے اطلاع کر دیا کرو۔ اگر اور رقم ہوگی تو بھیج دوں گا۔ ورنہ بلا لوں گا۔ کیونکہ ہم سے یہ نہیں ہوسکتا کہ رقم نہ رہے۔ تو لوگوں سے بھیک مانگتے پھریں۔ کہ لاؤ روپیہ۔ ہم سے جتنا ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے ہم حاضر ہیں اور جس کام میں روپیہ کی ضرورت ہے اگر بدوں مانگے۔ ہمارے پاس مسلمان روپیہ بھیج دیں گے۔ اس سے کام کو چلاتے رہیں گے اور نہ بھیجیں گے تو ہم خدا تعالیٰ سے عرض کر دیں گے۔ کہ اس کام کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی۔ مسلمانوں نے اعانت مالی پر توجہ نہ کی اور ہم نے بھیک مانگنے میں دین کی ذلت سمجھی۔ اس

لئے یہ کام نہ ہو سکا۔ ہم تو اس جواب کے بعد سبکدوش ہو جائیں گے۔ اس کے بعد عام مسلمانوں سے مواخذہ ہوگا کہ تم نے تبلیغ میں مالی اعانت کیوں نہیں کی اور اگر تم کو کسی پر اعتماد نہ تھا تو تم نے رقم کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنے ضلع کے واسطے مبلغ کا انتظام کیوں نہ کیا؟

میں نے سب صورتیں آپ کو بتلا دی ہیں۔ کہ کام کی اتنی صورتیں ہیں اب جو چاہو اختیار کرلو۔ سو اس کے بعد آپ کو کسی عذر کا موقع نہیں ہے۔ مسلمانوں کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ تبلیغ کا کام کہاں کہاں ہو رہا ہے۔ اب جس کا جی چاہے گا۔ جس پر اطمینان ہوگا اس کے پاس رقم خود بھیج دے گا۔ باقی ہم کسی سے مانگنے نہ جائیں گے۔

غرض یہ اصول ہیں کام کرنے کے۔ آپ کو اس طرح تبلیغ کرنا چاہیے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تواصی بالحق جس کا دوسرا عنوان تبلیغ اسلام ہے۔ نہایت ضروری ہے کہ بدوں اس کے آپ خسارہ سے نہیں بچ سکتے۔ اس میں اپنی سعی کو جاری رکھو۔ ورنہ بڑا خسارہ ہوگا۔ جو تمام مسلمانوں کو محیط ہو جائے گا۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام تواصی بالحق رکھتا ہوں۔ کیوں کہ اس میں زیادہ تر تبلیغ عقائد ہی کا بیان ہوا ہے۔ اور حق کی تفسیر عقائد ہی سے کی گئی ہے۔ اگر کل کو پھر بیان ہوا تو اس کا نام تواصی بالصبر تجویز کرتا ہوں۔ کیونکہ اس وقت تبلیغ اعمال کا ذکر اجمالی ہوا ہے۔ کل کو اس جزو کی بھی تفصیل ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اگر ایسا ہو گیا۔ تو ہر بیان کے مستقبل کے نام کے ساتھ مجموعہ کا نام تواصی بالدین ہوگا۔ کیونکہ دین عقائد اعمال اصول و فروع کے مجموعہ ہی کا نام ہے۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور توفیق عمل عطاء فرمائیں۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلیٰ الہٖ و اصحابہٖ اجمعین ۔و اخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین. والحمد اللّٰہ الذی بعزتہٖ وجلالہٖ تتم الصّٰلحٰت.

اشرف علی ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ

التواصی بالصبر

افسوس! کہ ہم لوگ اس فریضہ کو چھوڑے ہوئے ہیں۔
جس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہمارے قلوب مخلوق کی
ہیبت سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم کو تبلیغ سے
رکاوٹ ہے............اور ہر شخص کو تبلیغ کی صحت
نہیں ہوتی۔ خواہ کیسی ہی قدرت ہو اور دوسرا ہمارے
ماتحت ہی کیوں نہ ہو۔

از حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

''التواصی بالصبر'' سے موسوم یہ وعظ ۶ شوال ۱۳۴۱ھ کی شب کو
چودھری نصیر الدینؒ صاحب کی درخواست پر مظفر نگر میں ہوا۔
☆...... جو دو گھنٹہ ۴۵ منٹ تک جاری رہا۔ مولانا ظفر احمد
صاحب عثانی رحمۃ اللہ علیہ نے قلمبند فرمایا۔
☆......سامعین کی تعداد تقریباً ۳۰۰ تھی۔
☆......مستورات بھی پس پردہ تھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا وخطبہ

الحمدللّٰہ نحمدهٗ و نستعینهٗ ونستغفرهٗ و نؤمن بہٖ و نتوکل علیه ط و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھده للّٰہ فلا مضل له و من یضلله فلا ھادی لهٗ و نشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحده لا شریک لهٗ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدهٗ ورسولهٗ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ وبارک وسلم.

اما بعد: فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.
وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْاالصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْابِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. (سورۃ العصر آیت نمبر ۹ تا ۳)
(قسم ہے زمانہ کی (جس میں نفع نقصان واقع ہوتا ہے) کہ انسان (بوجہ تضیع عمر کے) بڑے خسارے میں ہے مگر جولوگ کہ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو (اعتقاد) حق (پر قائم رہنے کی) فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو (اعمال کی) پابندی کی فہمائش کرتے رہے)

تمہید

یہ وہی سورت ہے جس کی تلاوت شب گزشتہ میں کی گئی تھی اور اس کے متعلق ایک جزو کا بیان کیا گیا تھا۔ حاصل اس کا یہ تھا۔ کہ اس صورت میں تبلیغ و دعوت الی اللہ کی ضرورت ثابت کی گئی ہے اور اس کے دو جزو ہیں۔ ایک دعوت الی الحق (بمعنی العقائد) اور ایک دعوت الی الصبر (بمعنی الاعمال) اور یہ ظاہر کیا گیا تھا۔ کہ ہم ان دونوں میں کوتاہی کر رہے

ہیں۔ ان میں سے ایک جزو یعنی دعوت الی الایمان اور تبلیغ عقائد کی طرف گزشتہ رات میں زیادہ روئے سخن تھا۔ گو بیان مشترک ہی ہوا تھا۔ مگر مقصود زیادہ تر یہی جزو تھا اور اسی کی تفصیل کی گئی تھی۔ اس وقت ایک جزو تفصیل سے رہ گیا تھا۔

یعنی قصداً اس کا بیان نہ ہوا تھا۔ گو ضمناً اس کا بیان بھی کسی قدر ہوا تھا اور وعدہ کیا گیا تھا۔ کہ اگلی شب اگر خیریت رہی اور بیان کا موقعہ ملا تو دوسرے جزو کے متعلق قصداً بیان ہوگا۔ سو یہ وقت ہے اس وعدہ کے ایفاء کا۔ اس لئے اس وقت میں تبلیغ اعمال کے متعلق کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

عذر بلا اہتمام عمل

سنیے! ہماری حالت یہ ہے کہ جیسا تبلیغ اعمال کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ویسا ہم کو اس کا اہتمام نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے۔

جیسا کہ دعوت الی الایمان اور تبلیغ عقائد میں کوتاہی ہو رہی ہے اور جیسا ایک امر مانع ہو رہا ہے۔ تبلیغ عقائد اور دعوت الی الایمان سے اسی طرح ایک امر مانع ہو رہا ہے۔ تبلیغ اعمال سے اور وہ امر یہ ہے کہ ہم کو عادت ہوگئی ہے ترک دعوت الی الاعمال کی اور اس کے مانع ہونے سے یہ مطلب نہ لیا جائے۔ کہ یہ عادت عذر ہے۔ کیونکہ جب میں اس کا لغو ہونا بیان کردوں گا۔ تو اس سے عذر نہ ہونا معلوم ہو جائے گا اور اس کے یہ معنی نہیں کہ ترک دعوت الی الاعمال کے لئے کوئی عذر فی نفسہ بھی نہیں۔ اگر اعذار شرعیہ موجود ہوں اور ان کا تحقق ہو جائے تو اس وقت ترک دعوت جائز ہے۔ مگر اس وقت میں ان اعذار شرعیہ کو بیان نہ کروں گا۔ نہ بیان کی ضرورت ہے کیونکہ کسی عمل کے متعلق بیان اعذار کی ضرورت جب ہو کہ ہم کو اس عمل کا اہتمام ہو اور جہاں مخاطب کو عمل ہی کا اہتمام نہ ہو۔ وہاں اعذار کو بیان نہ کیا جائے گا بلکہ اولاً اس کو اہتمام عمل پر متوجہ کیا جائے گا۔ جب وہ عمل کا اہتمام کرنے لگے اور عمل میں مشغول ہو جائے گا۔ پھر اس کو اعذار شرعیہ سے مطلع کیا جائے گا۔

جیسے ایک شخص نمازی ہے۔ نماز کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس کی پابندی بھی کرتا ہے۔ وضو کو بھی ضروری سمجھتا ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ وہ بیماری کی حالت میں بھی وضو کو ترک نہیں

کرتا۔ وہاں ضرورت ہے اعذار شرعیہ بتلانے کی۔ کہ ان اعذار سے وضو ساقط ہو کر تیمم جائز ہو جاتا ہے۔ تطہیر ثیاب معاف ہو کر ناپاک کپڑوں ہی سے نماز درست ہو جاتی ہے۔ استقبال قبلہ معاف ہو کر جس طرح بھی نماز پڑھ سکے نماز صحیح ہے اور قیام پر قادر نہ ہو تو قعود سے اور قعود پر قدرت نہ ہو تو اضطجاع سے نماز صحیح ہو جاتی ہے۔

ایسے وقت میں بیان اعذار کی ضرورت کا راز یہ ہے۔ کہ اگر ایسے شخص کو اعذار نہ بتلائے جائیں۔ تو اس کو اعتقادی اور عملی تنگی پیش آوے گی۔ اعتقادی تنگی تو یہ ہوگی کہ اس کو **لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** (اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) کے صدق میں وسوسہ اور شبہ ہوگا۔ جو کہ زوال یا ضعف ایمان کا سبب ہے اور عملی تنگی یہ پیش آئے گی۔ کہ اگر اس کو تیمم کا قاعدہ نہ بتلایا گیا۔ تو وہ عذر کے وقت مجبور ہو کر وضو ترک کرے گا اور چونکہ وضو کو شرط سمجھتا ہے اس لئے بے وضو نماز پڑھے گا نہیں۔ یہ عملی تنگی ہے۔ پس ایسے شخص کے سلامت ایمان اور سلامت اعمال کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اعذارِ شرعیہ کے احکام سے مطلع کیا جائے۔ اس سے اس کا ایمان تو سلامت رہے گا۔ کہ اس کو **لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** (اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) کے صدق میں وسوسہ نہ ہوگا اور عمل یوں سلامت رہے گا کہ وہ کسی عذر کے وقت عمل کو فوت نہ کرے گا۔

غرض بیان عذر کی ضرورت وہاں ہوگی۔ جہاں مخاطب ضرورت عمل کا قائل ہو۔ اعتقاداً بھی اور عملاً بھی۔ پھر اس کو کسی موقع پر پیش آتی ہو۔ بخلاف اس کے جو ابھی عمل ہی کی ضرورت کا قائل نہیں۔ وہ تو اعذار کو سن کر ترک عمل کا بہانہ ڈھونڈیں گے اور کھینچ تان کر اپنے کو معذوروں کی فہرست میں داخل کریں گے۔ پس اگر ہم یہ دیکھتے کہ ہم لوگ امر بالمعروف کا اہتمام پوری طرح کرتے ہیں۔ تو اس وقت البتہ بیان احکام اعذار کا موقع تھا اور جب اس کا اہتمام ہی نہیں۔ چنانچہ عملاً اہتمام نہ ہونا تو مشاہد ہے اور اعتقاداً ابھی بعض لوگ اس کی ضرورت کو پوری طرح محسوس نہیں کرتے۔ جیسا کہ قرائن احوال اسی پر شاہد ہیں۔ تو ایسی حالت میں تو اعذار کو سن کر ہر شخص ترک امر بالمعروف کا بہانہ ڈھونڈے گا اور کوئی بھی اپنے کو عذر سے خالی نہ سمجھے گا اور اس فریضہ کو اپنے اوپر سے بالکل ساقط کر دے

گا۔ حالانکہ ایسا کون سا عذر ہے۔ جس سے فرض بالکل ہی ساقط ہو جائے۔

دیکھو نماز و وضو کے لئے بھی بعض عذر ہیں۔ مگر وہ ایسے وسیع نہیں۔ جن سے وضو اور نماز بالکل ہی ساقط اور معدوم ہو جائے۔ مگر جس عمل کا اہتمام ہی قلب میں نہ ہو۔ اس کے اعذار کو سن کر مخاطب عذر کے میدان کو اتنا وسیع کر لیتا ہے کہ فرض کو بالکل ہی ساقط کر دیتا ہے۔ تو ایسے شخص کو اعذار سے ہنوز مطلع نہ کیا جائے گا۔

دو حالتیں

اسی لئے میں نے رات بھی عذر کو بیان نہیں کیا۔ بلکہ یہ عرض کیا تھا کہ حالتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم کام کو اپنے ذمہ ضروری سمجھیں، پھر عذر سے تنگی پیش آئے اور ایک حالت یہ ہے۔ کہ کام ضروری ہی نہ سمجھیں تو جن اعمال کو ہم اپنے ذمہ ضروری سمجھتے ہیں۔ جیسے نماز، وضو وغیرہ ان میں عمل کو شروع کرنے کے بعد عذر سے سوال ہوتا ہے اور جن کو اپنے ذمہ ضروری نہیں سمجھتے۔ ان میں قبل از عمل ہی عذر سے سوال کیا جاتا ہے۔ تو مجیب کو لازم ہے۔ کہ پہلی صورت میں تو اعذار کو بیان کرے اور دوسری صورت میں بیان نہ کرے۔ لہٰذا اسی اصل کے موافق میں اس وقت بھی اعذار کو بیان نہیں کرتا۔ بلکہ تبلیغ اعمال کی ضرورت پر آپ کو متنبہ کرتا ہوں۔

تبلیغ اعمال

رات میں نے تبلیغ ایمان یعنی دعوت الی العقائد سے مانع یہ بتلایا تھا کہ اس تبلیغ میں مبلغ مخاطب کو ایسے امور سے باز رکھنا چاہتا ہے جو اس کے زعم میں دین اور طاعات ہیں۔ جس سے اس کو ناگواری ہوتی ہے اور اس ناگواری کے خیال سے مبلغ کھٹکتا اور تبلیغ سے رکتا ہے۔ اس کا جواب میں نے یہ دیا تھا۔ کہ اول تو عنوان تبلیغ کا ایسا ہونا چاہیے۔ جس سے مخاطب کو ناگواری نہ ہو اور وہ عنوان قرآن ہی نے ہم کو بتلا دیا ہے کہ عقائد کو اخبار صادقہ کے عنوان سے بیان کر و اور جو شخص اس سے بھی ناگواری کرے تو اس کی پرواہ نہ کی جائے۔

نیز میں نے یہ بھی کہا تھا۔ کہ اسی ناگواری مخاطب کی وجہ سے تبلیغ عقائد کو مقدم کیا گیا۔ اور تواصی بالعمل کو مؤخر کیا گیا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تبلیغ اعمال فی نفسہٖ مہتم بالشان نہیں۔ کیونکہ اگر یہاں ایک وجہ اضافی قلت اہتمام کو مقتضی ہے۔ تو دوسری وجہ شدت

اہتمام کو بھی مقتضی ہے۔ وہ یہ کہ بلاغت کا قاعدہ یہ ہے کہ کلام کو جس بات پر ختم کیا جاتا ہے وہ مہتم بالشان اور زیادہ مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ اہل بلاغت اس کو خوب جانتے ہیں۔ اسی لئے بلغاء کا قاعدہ ہے۔ کہ وہ کلام کو اول و آخر میں زوردار کرتے ہیں۔ کیونکہ ابتداء بھی مقصود سے کی جاتی ہے اور انتہاء بھی مقصود پر ہوتی ہے تو اب یہاں دو جزو ہیں۔ جن میں ایک جزو کا اہتمام تقدیم سے ظاہر کیا گیا۔ دوسرے جزو کا اہتمام ختم کلام پر واقع کرنے سے ظاہر کیا گیا۔ دوسرے جزو کا اہتمام ختم کلام پر واقع کرنے سے ظاہر کیا گیا ہے۔ کیونکہ جس چیز پر کلام ختم کیا جاتا ہے۔ وہ مخاطب کے ذہن میں باقی رہ جاتی ہے۔ اس لئے ختم کلام پر مقصود اہم ہی کو بیان کیا جاتا ہے۔ پس قرآن کی عجیب بلاغت ہے۔ کہ اس نے دونوں اجزاء کا مہتم بالشان ہونا دو طرز سے ظاہر کر دیا ہے۔

رہا یہ سوال کہ دو چیزوں کا ایک درجہ میں مہتم بالشان ہونا تو بعید ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک درجہ میں مہتم بالشان نہیں کہتے۔ بلکہ تبلیغ عقائد کی اہمیت اس لئے ہے۔ کہ وہ اصل ہیں۔ اسی لئے ان کی اہمیت کو تقدیم سے ظاہر کیا گیا۔ (فان الاصل مقدم علی الفرع)

اہمیت اعمال

اور اعمال کی اہمیت ایک اعتبار خاص سے ہے۔ وہ اعتبار خاص یہ ہے اور یہ حقیقت میں وجہ اول ہی سے ناشی ہے۔ کہ جو لوگ عقائد کو اصل سمجھ کر مہتم بالشان سمجھتے ہیں۔ وہ اعمال کو فرع سمجھ کر ان کا اہتمام بالکل ترک کر دیتے ہیں اور اتنا اہتمام بھی نہیں کرتے۔ جتنا فرع کا ہونا چاہیے۔ بس یہ لوگ عقائد ہی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اعمال کو ضروری نہیں سمجھتے۔ چنانچہ تعریف میں کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص کے عقائد بہت اچھے ہیں اس تعریف کو کافی سمجھتے ہیں اور صحت عقائد کے بعد اس کے اعمال پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اسی لئے اعمال کے متعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی نہیں کرتے۔ بلکہ غضب یہ ہے۔ کہ اعمال کی کوتاہی کو منکر بھی نہیں سمجھتے۔ ہم نے مانا کہ عقائد کا اچھا ہونا بڑی بات ہے۔ اور یہ بھی بجائے خود قابل مدح ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اعمال کو غیر ضروری کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اور ان میں کوتاہی کرنے کو نقص کیوں نہیں سمجھا جاتا؟۔

اگر آپ کہیں کہ اعمال فرع ہیں۔تو میں کہتا ہوں۔کیا فرع سے نقص سے شے میں نقص نہیں آتا۔ دیکھئے آپ ایک درخت امرود کا لگائیں۔جس کا بیج الہٰ آباد سے عمدہ امرودوں کا بڑے اہتمام سے انتخاب کر کے منگوایا گیا تھا۔مگر آپ کے باغ میں آ کر اس عمدہ بیج سے درخت تو بہت بڑا لگ گیا۔لیکن پھل ایک بھی نہ آیا۔تو کیا اس صورت میں آپ اپنے دوستوں کے سامنے خوش ہو ہو کر اس درخت کی یوں تعریف کریں گے کہ یہ بڑا قیمتی درخت ہے۔اس کا بیج بہت عمدہ الہٰ آباد کے نفیس امرودوں میں سے ہے یا افسوس کے ساتھ یوں کہیں گے۔کہ اس کا بیج بڑے اہتمام سے منگوایا گیا تھا۔مگر افسوس اس نے پھل نہیں دیا اور اگر اتفاق سے پھل بھی آیا۔مگر الہٰ آباد جیسا شیریں نہ ہوا۔بلکہ معمولی امرودوں سے بھی بدتر نکلا۔تو اس صورت میں ہرگز آپ بیج کی تعریف کر کے اپنا جی خوش نہ کریں گے بلکہ سخت رنج وافسوس کے ساتھ یہ کہیں گے۔کہ بڑی مشقت سے میں نے اس کے لئے الہٰ آباد سے عمدہ بیج منگوایا تھا۔مگر ساری محنت ضائع گئی۔پھل بالکل خراب نکلا۔

میرا مقصود اس مثال سے یہ ہے کہ آپ دنیوی امور میں محض اصل کی عمدگی کو مدح کے لئے کافی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کے ساتھ فرع کی عمدگی پر بھی نظر ہوتی ہے۔ پھر دین کے معاملہ میں کیا وجہ ہے کہ صرف عقائد (اصول) کی عمدگی پر نظر کی جاتی ہے اور اسی کو مدح کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔اعمال (وفروع) کی عمدگی پر کیوں نظر نہیں کی جاتی؟ اور اس کے نقص سے افسوس کیوں نہیں کیا جاتا؟ اور اس افسوس کا اثر آپ میں کیوں ظاہر نہیں ہوتا؟۔

دیکھئے اگر ایک شخص کا چہرہ حسین ہے۔مگر ہاتھ پیر بھدے ہیں یا انگلیاں مڑی ہوئی ہیں۔تو ہر چند کہ حسن میں چہرہ ہی کا حسن اصل ہے۔مگر یہ نہیں کہ ہاتھ پیر کا اعتدال مطلوب نہ ہو۔گو اس سے آپ کو اتنی نفرت نہ ہوگی۔جتنی اس شخص سے ہوتی ہے۔جس کا چہرہ بھی بدشکل ہے۔مگر ظاہر ہے کہ جس شخص کے ہاتھ پیر اور انگلیاں بھی حسین ہوں اور چہرہ بھی حسین ہو۔اس کی طرف زیادہ میلان ہوگا۔اور پہلے شخص کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے جب آپ یہ کہیں گے۔کہ چہرہ، آنکھ، ناک بڑی خوبصورت ہے۔ساتھ ہی یہ بھی کہیں گے کہ مگر افسوس اس کا ہے۔کہ اس کی انگلیاں مڑی ہوئی ہیں۔اگر یہ نقص نہ ہوتا تو بہت ہی حسین ہوتا۔اب

بتلایئے۔ کہ اسی طرح حسن دین میں فساد وفروع یعنی فساد اعمال کو آپ منکر کیوں نہیں سمجھتے اور ایسے شخص سے آپ کا دل کیوں کر ملتا ہے۔ جو فروع ایمان میں ناقص ہے۔ اس سے بلا تکلیف دوستی کس طرح کی جاتی ہے؟۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہٖ فمن لم یستطع فبلسانہ فمن لم یستطع فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان (او کما قال)(الصحیح لمسلم :۶۹)

کہ جو کوئی تم میں سے امر منکر کو دیکھے۔ تو اس کو ہاتھ سے مٹائے۔ یا زبان سے یا دل سے۔ یہ مقتضا ہے امر منکر کا شرعاً۔ پھر یہ کیا غضب ہے کہ ہم لوگ امرِ منکر کو دیکھ کر نہ ہاتھ سے روکتے ہیں، نہ زبان سے، نہ دل سے نفرت کی جاتی ہے۔ بلکہ اعمال میں کوتاہی کرنے والوں کے ساتھ وہی بشاشت ہے، وہی دوستی ہے۔ جیسے کامل الایمان کے ساتھ ہوتی ہے۔ گویا آپ خداتعالیٰ کی طرف سے وکیل ومختار ہیں۔ کہ جس چیز کو چاہیں معاف کر دیں، اور جس منکر سے چاہیں قطع نظر کر لیں۔ تو بات یہ ہے۔ کہ لوگوں نے عقائد کی اہمیت سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ وہ یہ سمجھ گئے کہ اہمیت عقائد کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد اصلاح اعمال کی ضرورت ہی نہیں اور یہ بالکل غلط ہے۔ اس لئے اس اعتبار خاص سے اعمال زیادہ مہتم بالشان ہو گئے ہیں۔ اس واسطے یہاں کلام کو تواصی بالاعمال کے ذکر پر ختم کیا گیا۔ تاکہ اس طرز خاص سے مخاطب کو معلوم ہو جائے۔ کہ گو اعمال عقائد سے ذکر میں مؤخر ہیں۔ مگر ختم کلام پر مذکور ہونے سے ان کی اہمیت بھی مطلوب ہے اور وہ بھی مہتم بالشان ہیں۔ سو یہ اتنی تو ضروری چیز، مگر ہماری حالت یہ ہے کہ اعمال کی طرف سے ہم بہت بے فکر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عقائد اصل ہیں اور اعمال فروع۔ مگر میں بتلا چکا ہوں۔ کہ فروع بھی مطلوب ہوتے ہیں اور ان کے انعدام یا نقصان سے اصل میں بھی نقصان آ جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر مثالوں میں واضح کیا گیا۔

تعلیم عقائد اور اعمال

دوسرے نصوص قرآنیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عقائد کی تعلیم سے تکمیل اعمال بھی مقصود ہے۔ یعنی عقائد کی تعلیم اس لئے بھی کی گئی ہے۔ کہ ان سے اعمال میں کام

لیا جائے۔اس کی دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

مَآ اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِیْ الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ۔

ترجمہ:تم کو جو کچھ بھی مصیبت ارضی یا سماوی پہنچتی ہے۔وہ سب مقدر ہو چکی ہے۔قبل ازیں کہ مصیبت کو پیدا کریں۔(اور چونکہ خدا تعالیٰ کا علم کامل ہے۔اس لئے) بے شک یہ بات خدا کے لئے آسان ہے۔(کہ وہ ظہور سے پہلے مصائب وغیرہ کو مقدر کردیں) اس کے بعد فرماتے ہیں:

لِکَیْلَا تَأْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتَاکُمْ

(یہ مضمون تم کو اس لئے بتلایا گیا) تا کہ تم کسی فوت شدہ چیز پر غم نہ کرو اور حاصل شدہ پر اتراؤ نہیں، یہ تعلیل ہے یا ماسبق کی۔جس کا تعلق اخبرنا کم بذلک مقدر سے ہے۔یعنی ہم نے تم کو اس مسئلہ کی تعلیم اس لئے کی۔تا کہ تم مغموم نہ ہو اور اتراؤ نہیں۔اب غور کے قابل یہ امر ہے۔کہ لام کے غایت کے واسطے لایا جاتا ہے اور اوپر مسئلہ تقدیر کا ذکر ہے۔تو اس کی علت وغایت و دوسری آیت میں بتلائی گئی ہے۔مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تم کو مسئلہ تقدیر اس لئے تعلیم کیا ہے۔کہ جب تم اس کے معتقد ہو گے۔تو تم کو حزن وفرح نہ ہوگا اور مسئلہ تقدیر کا یہ اثر مشاہد ہے۔جو لوگ تقدیر کے معتقد ہیں۔وہ مصائب وحوادث میں منکرین تقدیر سے زیادہ مستقل اور ثابت قدم رہتے ہیں۔تو اس آیت سے معلوم ہوا۔کہ مسئلہ تقدیر کا ثمرہ ایک عمل بھی ہے۔یعنی حصول تفویض وتوکل اور اس کا عمل ہونا ظاہر ہے۔پس عقائد ہر چند کہ خود بھی مقصود ہیں۔مگر ان کو تکمیل عمل میں بھی بڑا دخل ہے اور یہ دخل مطلوب بھی ہے۔جیسا کہ آیت میں لکیلا تاسوا (تا کہ تم غم نہ کرو) سے مستفاد ہوتا ہے۔

تعلیم توحید اور اعمال

اب اسی پر تمام عقائد کو قیاس کر لیجئے۔کہ مثلاً توحید کی تعلیم خود بھی مقصود ہے اور اس سے اعمال کی تکمیل بھی مقصود ہے کیونکہ جس شخص پر جس قدر توحید کا غلبہ ہوگا۔اتنا ہی اس کے اعمال مکمل ہوں گے اس کی نماز دوسروں کی نماز سے اکمل اس کی زکوٰۃ وروزہ دوسروں

ی زکوٰۃ و روزہ سے افضل ہوگی۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں:

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا　　　واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(دھوکہ مت کھاؤ کہ توحید خدا اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے کا نام ہے نہ کہ ایک کہنے کا)

اور شیخ شیراز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

موحد چہ برپائے ریزی زرش　　　چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش بنا شد زکس　　　ہمیں ست بنیاد توحید و بس

(مؤحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیر دیں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں اس کو بجز خدا کے کسی سے امید و خوف نہیں ہوتا۔ توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے)

غرض موحد کامل کی یہ حالت ہوگی۔ جو شیخ نے بیان فرمائی ہے۔ جو ادنےٰ توحید والے کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ تو عقائد گو بظاہر جمل خبریہ ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بیان میں عرض کیا ہے۔ مگر ان سے مقصود جمل انشائیہ ہیں۔ اعتقادیہ بھی عملیہ بھی۔ جیسا ابھی مذکور ہوا۔ اس بناء پر اللہ واحد کا مطلب یہ ہے کہ اس اعتقاد کے ساتھ عمل میں بھی اس کا لحاظ رکھو۔ کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ پس اپنے عمل میں خدا کے سوا کسی کو مقصود نہ بناؤ۔ ورنہ ریاء ہو جائے گی۔ جو شرک اصغر ہے اور توحید کامل کے خلاف ہے۔

اسی طرح عقلاً خدا کے سوا کسی سے طمع و خوف نہ رکھو۔ کہ یہ بھی توحید کے خلاف ہے (ہاں طبعی طمع و خوف کا مضائقہ نہیں۔ کیونکہ وہ تو اضطراراً بے اختیار ہوتا ہے۔ جیسے سانپ کو دیکھ کر طبعاً ڈر جانا یا شیر سے ہیبت زدہ ہو جانا۔ مگر عقلاً یہ مضمون ہر دم پیش نظر رہنا چاہیے۔ کہ بدوں مشیت الٰہی کے کوئی چیز نفع یا ضرر نہیں دے سکتی۔

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ اور وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ط

(اور اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی تکلیف پہنچاتے تو اس کے سوا اس کا اور کوئی دور کرنے والا نہیں اور وہ اگر تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں)

گر گزند ت رسد زخلق مرنج　　　کہ راحت رسد زخلق نہ رنج

از خدا دان خلاف دشمن و دوست   کہ دل ہر دو در تصرف اوست

(اگر مخلوق سے نقصان پہنچے تو رنجیدہ مت ہو کیونکہ مخلوق سے نہ راحت پہنچ سکتی ہے نہ رنج، دشمن اور دوست کو اللہ کی طرف سے جانوں کیونکہ دونوں کے دل صرف اسی کے تصرف میں ہیں) (۱۲ جامع)

اور یہ بڑا قیمتی مضمون ہے کہ جمل خبریہ سے محض خبر مقصود نہیں ہوتی۔ بلکہ کوئی انشاء مقصود ہوتی ہے۔

اخبارِ رسول اور اعمال

ایک دوسری واضح مثال ہے۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی ہے۔ کہ جب تہائی رات باقی رہ جاتی ہے۔ تو حق تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں۔ اور اس نزول نسبت کی اجمالی عقیدہ کافی ہے۔ کیونکہ ہم کو نہ اللہ تعالیٰ کے افعال کی کنہ معلوم نہ صفات کی نہ ذات کی۔ پس جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔

ہاں اس مقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے۔ کہ عقائد کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اخبار متواترہ یا قرآن سے ثابت ہوں۔ وہ تو قطعی ہیں۔ دوسرے وہ جو اخبار آحاد صحیحہ سے ثابت ہوں۔ وہ ظنی ہیں۔ قسم اول کا اعتقاد فرض اور ثانی کا واجب ہے۔ اول کا انکار کفر اور ثانی کا انکار فسق ہے۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

اب غور کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ خبر دی ہے۔ اس سے آپ کا مقصود کیا ہے۔ کیا صرف یہی مقصود ہے۔ کہ اس نزول کا اعتقاد رکھو یا کچھ اور بھی مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ مقصود یہ ہے کہ اس وقت کو ضائع نہ کرو۔ بلکہ اس وقت حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ نماز و استغفار میں مشغول ہونا چاہیے۔ چنانچہ دوسری احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خود تصریح فرمادی ہے۔ قیام لیل اور تہجد کی آپ نے بہت ترغیب دی ہے۔

اور اس کی فضیلت میں بے شمار احادیث ہیں۔ اسی طرح دعائے نیم شبی کی فضیلت میں بکثرت احادیث ہیں اور بلکہ خود ایک ایسی ہی حدیث کے اخیر میں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نزول فرما کر مخلوق کو خطاب فرماتے ہیں:۔

هل من مسترزق فارزقه و هل من مستغفر فاغفر له او کما قال.

کیا کوئی رزق کا طالب ہے کہ میں اس کو رزق دوں۔ کیا کوئی مغفرت کا طالب ہے۔ کہ میں اس کو بخش دوں۔ یہ صاف بتلا رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے ہم کو مطلع کرنا اسی لئے ہے۔ تا کہ اس وقت میں ہم اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگ لیا کریں۔ پس اس طرح تمام اخبار اعتقادیہ کو سمجھو کہ ان سے اشارات بھی مقصود ہیں۔ یہ مت سمجھو کہ عقائد سے صرف اعتقاد ہی مطلوب ہے۔ بلکہ ان سے تکمیل اعمال بھی مطلوب ہے۔ کہ ان عقائد سے عمل میں کام لیا جائے۔ گویا بلفظ دیگر یوں کہیئے کہ عقائد کو تکمیل اعمال کا آلہ بنایا گیا ہے۔

اور عقائد کا تکمیل اعمال میں دخیل ہونا اس طرح ہے کہ مثلاً دو شخص فرض کیجئے۔ جنہوں نے راستہ میں بادشاہ کو دیکھا۔ جن میں ایک تو بادشاہ کو پہچانتا ہے۔ ایک نہیں پہچانتا۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ کو دیکھنے کے بعد دونوں کی حالت میں بین فرق ہوگا۔ جو شخص بادشاہ کو بادشاہ سمجھتا ہے۔ وہ تو فوراً آداب و تعظیم بجا لائے گا۔ اور پوری طرح خدمت و طاعت کے لئے آمادہ ہو جائے گا اور جو اس کو معمولی آدمی سمجھتا ہے وہ اس طرح آمادہ نہ ہوگا۔ پس شریعت نے جو عقائد ہم کو تعلیم کئے ہیں۔ ان سے ایک تو مقصود یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اپنے دل میں جماؤ۔ دوسرا مقصود یہ ہے کہ اس عظمت کے مقتضا سے عمل میں کام لو۔ تو اب اعمال کو غیر مہتم بالشان سمجھنا کتنا بڑا غضب ہے۔ جن مقدمہ اور آلہ تکمیل عقائد کو بنایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جس کے مقدمات اتنے معظم ہیں۔ وہ خود کتنا معظم ہوگا۔ گو من وجہ سہی۔

تخلیق انسان اور اعمال

دوسری بات یہ ہے کہ انسان دنیا میں پیدا ہوا ہے۔ ابتلاء و امتحان کے لئے۔ جیسا کہ آیت وَ اِذِابۡتَلٰٓی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ (اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پروردگار نے چند باتوں میں انہیں آزمایا) اس پر دال ہے۔ کیونکہ کلمات سے مراد احکام ہیں۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ احکام سے مقصود ابتلاء ہے اور ابتلاء ہوتا ہے۔ مخالفت نفس ہے۔ کیونکہ اس میں مشقت ہوتی ہے اور بدوں مشقت کے ابتلاء کا تحقق نہیں ہوسکتا۔ معلوم ہوا کہ مقصود خلق انسان سے مجاہدہ و مشقت ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ صاف ارشاد ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ. (بے شک انسان کو مشقت میں پیدا کیا)

اب خود سمجھ لیجئے کہ مشقت عقائد میں زیادہ ہے یا اعمال میں۔ تو ظاہر ہے کہ عقائد میں کیا مشقت ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ ہاں پہلی بار عقائد باطلہ کو ترک کرنے میں مشقت ہوتی ہے۔ مگر یہ ابتداء میں تھوڑی دیر کے لئے ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ ہر وقت ایک آرہ سا چلتا ہو اور اعمال میں ہر وقت مشقت ہے۔ ہر دم دل پر آرہ سا چلتا ہے۔ کہ اب یہ کرو۔ اب وہ کرو۔ یہی ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ۔ (بے شک انسان کو مشقت میں پیدا کیا)

صاحبو! ایک مشاق نمازی کو بھی بیماری اور سفر میں اول ہی دن جیسی مشقت ہوتی ہے۔ بارش اور اندھیری رات اور جاڑے اور سردی میں نماز کے لئے گھر سے نکلنا اور وضو کرنا سہل نہیں۔ اسی لئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسباغ وضو علی المکارہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اور اندھیری میں نماز کے لئے آنے والوں کو بشارت سنائی ہے۔ کما فی الحدیث المشھور:

بشر المشائین فی الظلم الی المساجد بالنور التام یوم القیمة ط(المستدرک للحاکم: ۱:۲۱۲)

تیسری بات (جو دوسری بات ہی سے متفرع ہے) یہ ہے کہ عقائد کو ایک بار اختیار کر لینے کے بعد ابقاء کی حاجت تو ہے۔ تجدید کی احتیاج نہیں۔ مثلاً اللہ واحد ایک بار سمجھ لیا۔ تو اب اس کے ابقاء کی ضرورت تو ہے۔ کہ اس کے ضد کا اعتقاد نہ کیا جائے۔ باقی یہ ضروری نہیں کہ روزانہ اس کے امثال کی تجدید کی جائے بخلاف اعمال کے۔ کہ ان میں ہمیشہ تجدید کی ضرورت ہے۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے وقت۔ ایضاً کہہ دینا کافی نہیں۔ بلکہ عملاً نماز کی تجدید لازم ہے۔ ایسے ہی روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ ہے۔ گو نماز روزہ کے سب افراد متماثل ہیں۔ مگر متحد تو نہیں ہیں۔ بلکہ ہر فرد کا وجود مستقل ہے۔ اور اللہ واحد کہنے کے بعد اس کی ضرورت تو ہے۔ کہ اس کے خلاف کا عقیدہ نہ ہو۔ مگر تجدید لازم نہیں۔ گو افضل ضرور ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

جددو ا ایمانکم بقول لا الہ الا اللہ

لا الہ الا اللہ سے اپنا ایمان تازہ کرو (مسند أحمد ۵:۲۳۹)

مگر یہ فرض نہیں۔ چنانچہ اگر کسی شخص کو دن بھر اللہ واحد کا تصور نہ آوے۔ مگر اس کے

خلاف کا بھی احتمال نہ آوے تو یہ گنہگار نہ ہوگا (وسوسہ غیر اختیاری مراد نہیں۔ کیونکہ وہ مضر نہیں۔ بلکہ احتمال اختیاری مراد ہے) بس اللّٰہ واحد کے تصور کی ضرورت صرف اول بار تھی۔ جب کہ اس کے ذہن میں شرک کا عقیدہ تھا یا شرک اور توحید دونوں سے خالی الذہن تھا۔ اس کے بعد نہ اس کا تصور فرض، نہ تجدید لسانی فرض، ہاں افضل و مستحب ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ایک بار اعتقاد کرلیا ہو۔ تو پھر اگر ساری عمر بھی اس کا استحضار نہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ نماز بھی نہ پڑھے۔ جس میں اشھد ان محمدًا عبدہ و رسولہ ہر قعدہ میں آتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ نماز کے اجزاء کو سمجھ کر نہ پڑھے۔ جیسا کہ عموماً نمازیوں کی حالت ہے اور ظاہر ہے کہ بے سمجھے نماز پڑھنے سے استحضار مضمون رسالت نہ ہوگا۔ تو اھل فتویٰ کا اتفاق ہے۔ کہ یہ شخص گنہگار نہیں۔ گو برکاتِ عظیمہ سے محروم ضرور ہے۔ سو یہ اور بات ہے کہ بخلاف نماز کے کہ اس کی تجدید رات دن میں پانچ دفعہ فرض ہے۔ خواہ سمجھ کر پڑھے یا بے سمجھے۔ ان وجوہ سے ثابت ہوا۔ کہ مجاہدہ نفس عمل میں زیادہ ہے۔ عقائد میں اتنا مجاہدہ نہیں اور مجاہدہ ہی مقصود ہے۔ انسان کی پیدائش سے۔ تو جس کو اس مقصود میں زیادہ دخل ہوگا وہ اہمیت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ پس یہ وجوہ ہیں اہمیت اعمال کی۔

خلاصہ یہ کہ بعض وجوہ سے عقائد زیادہ مہتم بالشان ہیں۔ مثلاً اس وجہ سے کہ وہ اصل ہیں اور صحت اعمال موقوف ہے۔ عقائد پر، بدوں صحت عقیدہ کے عمل ضائع و برباد ہے اور صحت عقائد وجود عمل پر موقوف نہیں اور بعض وجوہ سے عمل زیادہ مہتم بالشان ہے اور یہ ضرورت ہے کہ اہمیت عقائد کے وجود زیادہ قوی ہیں۔ مگر نے اس وقت اہمیت اعمال پر زیادہ زور اس لئے دیا ہے کہ ہم لوگوں کو ان کی اہمیت سے بالکل غفلت ہے۔ ہم ان کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے۔ اور ظاہر ہے کہ جب اعمال میں بھی وجوہ اہمیت موجود ہیں۔ تو یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم ان کے ساتھ اہتمام کا برتاؤ نہ کریں۔ میں آج کل عام طور پر اپنی جماعت کا حال دیکھ رہا ہوں۔ کہ وہ کسی کے عقائد اچھے دیکھ کر پھر اس کی عملی کوتاہی پر اصلاً نظر نہیں کرتے۔ نہ اس کے اعمال سے نفرت ظاہر کرتے ہیں۔ نہ دل سے کراہت و انکار کرتے ہیں اور یہ حالت خطرناک ہے۔ حدیث میں اس حالت پر وعید وارد ہے۔ یہ مضمون اہتمام عمل کا کل رات بیان نہ ہوا تھا۔ الحمدللہ کہ یہ آج بیان ہوگیا۔

تبلیغ میں قدرت کے باوجود کوتاہی

اب رہ گئی یہ بات کہ ہم اصلاح اعمال وتبلیغ احکام عملیہ میں کیا کوتاہی کررہے ہیں۔سو یہ کوئی طویل یا غامض مضمون نہیں۔ جب لوگ اعمال کی ضرورت اور اہمیت ہی سے غافل ہیں۔تو ان کی اصلاح وتبلیغ سے غفلت بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ حالت ہماری یہ ہے۔ کہ ہفتے کے ہفتے گزر جاتے ہیں۔کہ ہم کسی کو افعل کذا و لا تفعل کذا کبھی نہیں کہتے۔اور یہ کوتاہی اصلاح اعمال وتبلیغ احکام عملیہ میں اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ جن پر قدرت نہیں ہے ان کی تبلیغ کا تو کیا اہتمام ہوتا۔جن پر قدرت بھی ہے۔وہاں بھی اس کا استعمال نہیں ہوتا۔ جن پر قدرت ہے وہ یہ لوگ ہیں۔ بیوی، بچے، نوکر، مرید، شاگرد اور جن پر قدرت نہیں وہ یہ لوگ ہیں۔دوست، احباب، بھائی، برادری، عزیز، قریب اوراجنبی لوگ۔

پھر جن پر قدرت نہیں۔ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ایک وہ جن کو تبلیغ کرنے میں ضرر کا اندیشہ ہے۔جیسے دشمن اور مخالف۔اور بعض وہ ہیں۔ جہاں ضرر کا کچھ اندیشہ نہیں۔ صرف ناگواری کا خطرہ ہے اوران میں زیادہ تر ایسے ہی ہیں۔ چنانچہ دوست احباب۔ بھائی اورعزیز سے ضرر جسمانی یا مالی کا کوئی خطرہ نہیں۔بس ان کی تبلیغ سے محض اس واسطے پہلوتہی کی جاتی ہے کہ ان کو ہماری روک ٹوک ناگوار ہوگی۔سو اس کا علاج یہ ہے کہ نصیحت کا عنوان ایسا اختیار کرو۔جس سے ناگواری نہ ہو۔اوراس پر بھی کسی کو ناگواری ہو تو اس کی پرواہ نہ کرنی چاہیے۔مسلمان کا تو یہ مذاق ہونا چاہیے:

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد　　　فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

(ہزاروں رشتہ دار جو اللہ تعالیٰ سے بیگانہ ہیں، اس ایک بیگانہ شخص پر قربان جو اللہ تعالیٰ سے آشنا دینی عارف باللہ ہے)

اور جب وہ لوگ بھی جن کو بظاہر قدرت سے خارج سمجھا جاتا ہے۔زیادہ تر محل تبلیغ ہیں اوران کی ترک تبلیغ میں بھی ہم معذور نہیں۔تو بتلایئے! جو لوگ ضابطہ سے ہمارے ماتحت ہیں اور ظاہر میں ان کی تبلیغ ہماری قدرت میں داخل ہے۔ وہاں ترک تبلیغ سے ہم کیوں کر معتوب وماخوذ

نہ ہونگے۔؟ مگر حیرت ہے۔ کہ ہم موقع قدرت میں بھی تبلیغ و نصیحت سے طرح دے جاتے ہیں۔

حقیقت بیعت

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جن پر قدرت ہے۔ وہ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے التزام اطاعت کا ہم سے معاہدہ نہیں۔ جیسے بیوی بچے کہ گو شرعاً ان پر ہماری اطاعت واجب ہے۔ مگر انہوں نے صراحتہً اس کا التزام نہیں کیا۔ کہ تم ہم کو تبلیغ کرو۔ ہم تمہاری تعلیم پر عمل کریں گے۔ مگر ایک تعلق ایسا ہے۔ جس میں دوسرا شخص معاہدہ صریحہ سے ہماری اطاعت کا التزام کرتا ہے اور وہ تعلق پیری مریدی کا ہے۔ کیونکہ پیری مریدی نام ہی ہے۔ معاہدہ اطاعت من جانب المرید و معاہدہ تعلیم و اصلاح من جانب الشیخ کا صرف ہاتھ میں ہاتھ لے کر سبق سا پڑھ دینے کا نام پیری مریدی نہیں۔ جیسا کہ آج کل عام طور سے اس میں غلطی ہو رہی ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دینے کو بیعت سمجھتے ہیں اور تعلیم و اتباع کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اس لئے مجھے اس میں کلام ہے۔ کہ آج کل کسی طالب بیعت کو چپکے سے جلد بیعت کر لینا جائز بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس میں تقریر ہے۔ اس کی غلطی کی۔ اس طرح بیعت کر لینے سے وہ یہی سمجھے گا۔ کہ ہاتھ میں ہاتھ دینا ہی بیعت کی حقیقت ہے۔ نیز آج کل یہ بھی عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بدوں بیعت کے نفع نہیں ہوتا۔ گویا لوگوں نے اصل مقصود کو اس فرع کے تابع کر دیا ہے۔ میرے نزدیک ان غلطیوں پر تنبیہ لازم ہے۔ اور اس کی ضرورت ہے۔ کہ طالب کو اوّلاً اس پر متنبہ کیا جائے۔ کہ بیعت (یعنی ہاتھ میں ہاتھ دینا) نہ مقصود ہے۔ نہ کسی کا مقصود کا موقوف علیہ ہے۔ صرف رسم مشائخ ہے اور حقیقت بیعت کی یہ ہے کہ مرید کی طرف سے اتباع کا التزام ہو اور شیخ کی طرف سے تعلیم کا التزام ہو۔ اگر دو شخصوں میں ایسا معاہدہ ہو جائے۔ خواہ قولاً یا حالاً۔ کیونکہ معاہدہ کبھی حالیہ بھی ہوتا ہے۔ تو بس بیعت کا تحقق ہو گیا۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ بیعت کی حقیقت التزام ہے۔ یعنی شیخ اور طالب دونوں کا ایک امر کا التزام کرتے ہیں۔ طالب اطاعت و اتباع کا۔ شیخ تعلیم و اصلاح کا۔

اب میری شکایت کا حاصل یہ ہے۔ کہ جہاں صریح التزام و معاہدہ ہے۔ اطاعت کا غضب کی بات ہے۔ کہ وہاں بھی آج کل تبلیغ نہیں کی جاتی اور اگر بیعت کو صحیح التزام

نہیں مانتے۔ تو اس کی کیا وجہ ہے کہ مرید کی جانب عملاً دونوں اس کو لازم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مرید اگر پیر کی کسی بات کو نہ مانے تو اس پر عتاب کیا جاتا ہے اور دربار سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہ عمل خود بتلا رہا ہے۔ کہ ایک جانب التزام مانا جاوے۔ دوسری جانب نہ مانا جاوے، ایک جانب تو یہ شدت ہے۔ کہ اگر مرید خدمت سے انکار کردے۔ یا کسی دنیوی کام میں شیخ کی مخالفت کرے۔ تو فوراً معتوب ہو جاتا ہے۔ اور دین کے معاملہ میں نہ شیخ اس کو کچھ کہتے ہیں۔ نہ وہ اس میں شیخ کی اطاعت کو اپنے ذمہ لازم سمجھتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ جب مرید صراحۃً آپ کی اطاعت کا التزام کر چکا ہے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے۔ کہ اب بھی شیوخ مریدین کی دینی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

صاحبو! تبلیغ سے ایک تو مانع عدم قدرت تھا اور ایک مانع عدم التزام تھا۔ گو عدم الزام واقع میں مانع نہیں۔ بلکہ قدرت کے بعد تبلیغ واجب ہے۔ گو دوسرے نے صراحۃً التزام نہ کیا ہو۔ مگر میں آپ کی خاطر سے تھوڑی دیر کے لئے عدم التزام کو بھی مان کر کہتا ہوں۔ کہ جہاں قدرت بھی ہے اور التزام بھی ہے۔ ہاں حضرت شیخ کیسے خاموش ہیں۔ جس میں ترک تبلیغ گناہ کے ساتھ وعدہ خلافی کا گناہ بھی شامل ہے۔ کیونکہ جس طرح مرید نے اطاعت کا وعدہ کیا ہے۔ ایسے ہی شیخ بھی تو اصلاح کا وعدہ کئے ہوتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مقتضی موجود ہے اور موانع سب مرتفع ہیں۔ پھر بھی پیر صاحب مریدوں کے افعال پر خاموش ہیں۔ کچھ روک ٹوٹ نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ شیوخ پیری مریدی کی حقیقت کو نہیں سمجھتے یا عمداً جان بوجھ کر پہلوتہی کرتے ہیں۔

آج کل کی پیری مریدی

بس آج کل تو پیری مریدی کی حقیقت لوگوں نے یہ سمجھ رکھی ہے کہ پیر صاحب قیامت میں بخشوا لیں گے۔ لوگوں نے رسم بیعت کو مغفرت کا سبب سمجھ رکھا ہے۔ گو اس کے بعد کتنے ہی گناہ کرلیں۔ چنانچہ اس کے متعلق کچھ الہامات اور مکشوفات یاد کر لئے ہیں۔ کہ فلاں بزرگ سے منقول ہے۔ کہ ان کو الہام ہوا تھا۔ کہ ہم تمہارے سب سلسلہ والوں کو بخش دیں

گے۔ یہ تو وہ ہیں۔ جو دوسروں سے اسلم ہیں۔ ورنہ بعضے اس سے بھی گرے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ بیعت اس واسطے ضروری ہے کہ اس سے ہمارے سر پر ایک بزرگ کا سایہ ہو جائے گا۔ تو دنیوی مقاصد میں ہم کو سہولت ہوگی۔ مقدمات میں دعا اور تعویذ گنڈے کرا لیں گے اور بیعت سے ہماری تنخواہ میں ترقی ہو جائے گی۔

چنانچہ بعض لوگ زبان سے کہتے ہیں۔ کہ ہمارے سلسلہ میں ڈپٹی کلکٹری سے اس طرف کوئی رہتا ہی نہیں۔ ان کا مقصود بیعت سے محض دنیا ہے اور ان کے نزدیک دین سے اس کو کچھ تعلق نہیں۔

یہ تو مریدوں کے خیالات تھے۔ اب پیروں کی سنیئے:۔

ان کے نزدیک بیعت سے مقصود یہ ہے کہ مریدوں کے ذمہ ان کی ششماہی یا سالانہ مقرر ہو جائے گا۔ جیسے چار کمینوں کا فصلانہ مقرر ہوتا ہے۔ پھر پیر صاحب کا کام کیا ہے۔ جس کے عوض یہ فصلانہ دیا جاتا ہے۔ ان کا کام وہ ہے جو بھنگی کرتا ہے۔ بھنگی نجاست ظاہرہ کا حامل ہے اور پیر صاحب فصلانہ لے کر گناہوں کی نجاست کے حامل ہیں۔

چنانچہ بعض دیہات میں پیر کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو کمینوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ایک چودھری کے یہاں فصل پر اناج تیار ہوا اور گھر والے چاروں کمینوں کا فصلانہ نکالنے لگے۔ تو چودھری کہتا ہے۔ کہ اس سوہرے پیر کا بھی تو حق نکال دو۔ وہ بھی تو اپنا حق مانگنے آوے گا۔ واقعی یہ عجیب راحت و آرام کا پیشہ ہے۔ کہ پیر صاحب گئے اور فصلانہ لے آئے اور سال بھر آرام سے اپنے گھر بیٹھے رہے۔ اور پیشہ والے اگر فرض منصبی کو انجام نہ دیں تو تنخواہ بند ہو جاتی ہے۔ مگر پیر کی تنخواہ بند ہی نہیں ہوتی اور خواہ کچھ ہی کر لیں۔ ان کی پیری بھی منسوخ نہیں ہوتی۔ چاہے شراب پی لیں یا بدمعاشی کر لیں۔ کیونکہ مشہور ہے۔ کہ پیر کی پیری سے کام اس کے فعلوں سے کیا کام۔ اگر پیر صاحب ڈھنگ کی باتیں بولیں تو حقائق و معارف ہیں اور بے ڈھنگی، بے تکی ہانکیں تو رموز ہیں۔ اور خاموش رہیں تو مراقب اور چپ شاہ ہیں تو ان کی ہر حالت میں جیت ہے۔

افسوس! آج کل پیروں کے ساتھ وہی معاملہ ہو رہا ہے۔ جو یہود و نصاریٰ نے اپنے احبار و رہبان کے ساتھ کر رکھا تھا۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارىٰ نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَ اَحِبَّآئُهٗ

کہ خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب بنتے تھے۔ (نعوذ باللّٰہ استغفر اللّٰہ) ان کو سب کچھ معاف ہے۔ جو چاہیں کریں۔ اس طریقہ میں عمل کی ضرورت ہی نہیں۔ عمل سے کچھ سروکار ہی نہیں۔

یادرکھو! کہ ایسی پیری مریدی کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ سراسر بے دینی ہے۔

ترک فرائض اور التزام وظائف

اور خیر بعضے ایسے تو نہیں ہیں۔ بلکہ بیعت کے بعد عمل کی بھی ضرورت سمجھتے ہیں۔ مگر کون سے اعمال کی فرائض وواجبات کی نہیں۔ بلکہ وظائف واوراد کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ کچھ وظیفے پیر سے معلوم کر لیتے ہیں۔ ان میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا۔ چاہے فرائض میں ناغہ ہو جائے۔ نماز کی پرواہ نہیں کہ وقت پر ہوتی ہے یا بے وقت۔ معاملات سر سے پیر تک گندے ہیں۔ سود لیتے ہیں اور دیتے ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے اور اس کے ساتھ تہجد کے پابند ہیں۔ اشراق کے پابند ہیں۔ تسبیح بہت لمبی ہے۔ جو ہر وقت چلتی رہتی ہے اور پیر صاحب بھی ان مریدوں کی سود کی آمدنی سے ہدایہ لیتے رہتے ہیں۔

چنانچہ اسی قسم کے ایک شخص نے خود مجھ سے فخراً کہا کہ نماز تو چاہے قضا ہو جائے۔ مگر پیر نے جو وظیفہ بتلایا ہے وہ کبھی قضاء نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ جب قضاء آئے گی۔ اس وقت اس کا نتیجہ معلوم ہوگا۔ کہ نماز زیادہ ضروری تھی یا وظیفہ؟ اور ان میں بھی اسلم وہ ہیں جو وظیفے ثواب کے لئے پڑھتے ہیں۔ ورنہ اکثر تو دنیا ہی کے واسطے پڑھتے ہیں۔ چنانچہ کوئی قصیدہ غوثیہ کا ورد کرتا ہے۔ کوئی حزب البحر کا۔ اگر ان کو ثواب مطلوب ہوتا۔ تو ادعیہ ماثورہ میں ان سے زیادہ ثواب ہے۔ مگر دنیا مطلوب ہے۔ اس لئے ادعیہ ماثورہ سے دلچسپی نہیں۔ بلکہ اس قسم کے وظائف سے دلچسپی ہے۔ جن سے دنیوی منافع بھی حاصل ہوتے ہیں۔

حقیقت مجاہدہ وریاضت

ان سے بڑھ کر ایک طبقہ اور ہے جو صوفیاء کہلاتے ہیں وہ اس لئے بیعت ہوتے ہیں۔

تا کہ کیفیات اور کشف وکرامات حاصل ہو جائیں۔ یہ لوگ کیفیات کو مقصود سمجھے ہوئے ہیں۔ اس کے لئے ترک لذات کرتے ہیں۔ نیند کم کرتے ہیں۔ غذا کم کرتے ہیں اور اس کا نام رکھا ہے مجاہدہ وریاضت۔ حالانکہ مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ مخالفت نفس فی المعاصی۔ روٹی کھانے یا ٹھنڈا پانی پینے میں نفس کی مخالفت کرنا مجاہدہ نہیں۔ بلکہ مجاہدہ یہ ہے کہ نفس نے مثلاً تقاضا کیا کسی مرد یا عورت کے دیکھنے کا یا گانا سننے کا یا کسی کی غیبت کرنے کا۔ اس میں نفس کی مخالفت کی۔ اسی طرح تمام معاصی میں غور کرلو۔ مگر یہ صوفی جو مجاہدہ کے مدعی ہیں۔ ان مواقع پر نفس کی مخالفت نہیں کرتے۔ بلکہ بہت سے لڑکوں اور عورتوں کے گھورنے میں مشغول ہیں۔

اور غضب یہ کہ گناہ کر کے تاویل یہ کی جاتی ہے کہ ہم تو صنعت حق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مولانا مظہر صاحب سہارنپوریؒ نے ایک ایسے ہی مسخرہ کو خوب جواب دیا تھا کہ اپنی ماں کی شرمگاہ میں جا کر صنعت حق کو دیکھ۔ کہ ایسی ذراسی تنگ جگہ سے تو اتنا بڑا آدمی پیدا ہوگیا۔ غرض ان لوگوں نے مجاہدہ کی حقیقت ہی نہیں سمجھی۔

اور ریاضت کے معنی اصل لغت میں سدھانے کے ہیں۔ کیونکہ یہ ماخوذ ہے۔ روض الدابہ سے جس کے معنی ہیں گھوڑے وغیرہ کو سدھانا، اور اصطلاح میں ریاضت کے معنی ہیں۔ تحصیل اخلاق حمیدہ وازالۂ اخلاق ذمیمہ۔ پس مجاہدہ تو یہ ہے۔ کہ شہوت وغضب وغیرہ کا جب تقاضا ہو تو اس تقاضے کو روکا جائے اور ریاضت یہ ہے۔ کہ اس تقاضے سے منشاء کو زائل کر کے اس کے بجائے خلق حسن اور ملکۂ فاضلہ پیدا کیا جائے۔ کیونکہ جتنے معاصی ہیں ۔ سب کے مناشی اخلاق ہیں اور ریاضت اسی مرتبہ خلق کے ازالہ کا نام ہے اور زائل کرنے سے مطلب یہ ہے کہ منشاء مضمحل وضعیف ہو جائے۔ کیونکہ اخلاق رذیلہ کا ازالہ ممکن نہیں۔ یہ سب رذائل فطری ہیں اور حدیث میں ہے:۔

اذا سمعتم بجبل زال عن مكانه فصدقوه وا ذاسمعتم برجلٍ زال عن جبلته فلا تصدقوه (مسند أحمد ٦:٤٤٣)

اور ان رذائل کے فطری ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کو بھی غصہ آتا ہے اور محققین کا قول ہے کہ غضب کبر سے پیدا ہوتا ہے کہ ان میں تکبر بھی ہے تو بچوں

کے اندران امور کے ہونے سے معلوم ہوا کہ یہ امور فطریہ ہیں اور امور فطریہ کا ازالہ کلیۃً نہیں ہوسکتا۔ تو جو سالک ان کو بالکل زائل کرنا چاہے۔ وہ اس کا مصداق ؎

دماغ بیہدہ پخت و خیال باطل بست

(دماغ بیہودہ پختہ اور خیال باطل ہے)

اور یہ میں نے اس لئے ظاہر کردیا کہ سالکین اس حقیقت کے نہ جاننے سے بہت پریشان ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ مجاہدہ کر کے سالک یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھ سے کبر زائل ہوگیا۔ اس کے بعد کسی موقع پر وہ پھر اُبھرا تو یہ شکستہ دل ہوجاتا ہے اور ہمت پست ہو جاتی ہے کہ افسوس ساری محنت ہی برباد ہوگئی۔ مجاہدہ ضائع ہوگیا۔ یہ بلا تو ہنوز موجود ہے۔ پھر اس غم میں بعض تو خودکشی کر لیتے ہیں اور بعض خودکشی کر لیتے ہیں۔ یعنی بعضوں نے جان دے دی اور بعض نے اپنے کو طریق سے الگ کرلیا۔ کہ اس راہ میں تو کامیابی دشوار ہے۔ ممکن ہی نہیں۔

اس واسطے میں کہتا ہوں کہ زوال سے مقصود اضمحلال ہے اور اضمحلال کے معنی یہ ہیں کہ بعد مجاہدہ کے ان اخلاق رذیلہ کی مقاومت میں پہلی جیسی مشقت نہیں ہوتی۔ ورنہ یاد رکھو کہ مجاہدہ سے نہ حریص کی حرص زائل ہوتی ہے۔ نہ بخیل کا بخل۔ نہ متکبر کا تکبر۔ ہاں اضمحلال ہوجاتا ہے۔ جس کا ثمرہ یہ ہے کہ ان کے مقتضاء پر عمل نہ ہو۔ کیوں کہ عمل اختیاری ہے۔ پس مقتضائے رذیلہ پر عمل نہ کرنا یہی بڑی کامیابی ہے اور مجاہدہ وریاضت سے یہی سہل وآسان ہوجاتا ہے۔

غرض اس تقریر سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ایک درجہ تو ہے تقاضائے معصیت کا۔ اس کی مخالفت کرنا تو مجاہدہ ہے اور ایک اس تقاضے کا منشاء ہے۔ خلق رذیل اس کے ازالہ بمعنی اضمحلال کو ریاضت کہتے ہیں۔

مقصودِ مجاہدہ

یہ تو ان کی حقیقت ہے جس میں ترک اکل وشرب کو کوئی دخل نہیں یہ اور بات ہے۔ کہ اس حقیقت کی تحصیل میں ترک اکل وشرب وغیرہ سے سہولت ہوجاتی ہے تو وہ مقدمہ ہوا۔ مگر

یہ کیا غضب ہے۔ کہ مقدمہ کو مقصود بنالیا گیا۔ کہ اصل مجاہدہ کا تو پتہ نہیں، نہ امردوں کا گھورنا چھوڑیں، عورتوں کا دیکھنا اور کھانا پینا سونا کم کر کے مجاہد بن گئے ۔ یہ جہلاء صوفیہ کا حال ہے۔

اور جو ذرا لکھے پڑھے ہیں۔ وہ ترک معاصی کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ مگر وہ اس مرض میں گرفتار ہیں۔ کہ احوال و کیفیات کو مقصود و مطلوب سمجھے ہوئے ہیں۔ کسی سے انہوں نے سن لیا تھا۔

المجاهدة مفتاح المشاهدة. (مجاہدہ مشاہدہ کی کلید ہے)

بس یہ لفظ تو یاد کر لیا گیا۔ مگر تفسیر کسی محقق سے دریافت نہ کی بلکہ اپنی رائے سے معنی گھڑے۔ مجاہدہ کے معنی تو مرنا کھپنا لئے کہ کھانا بھی چھوڑ دے اور پینا بھی۔ اور مشاہدہ کی یہ تفسیر کی ۔ کہ اللہ کی طرف خود بخود بدوں ارادہ کے لو لگی رہے، ذوق شوق ہو۔ کشف ہو۔ یکسوئی ہو۔ استغراق ہو۔ بس وہ اسی کے واسطے ساری کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی اثر ظاہر ہو گیا کہ تھوڑی دیر کو وساوس کم ہو گئے۔ شوق و ذوق پیدا ہو گیا تو خوش ہو گئے۔ کہ بس ہم کامیاب ہیں اور اگر کبھی ایسا نہ ہوا۔ تو اب پریشانی میں مبتلا ہیں۔ شیخ سے شکایتیں کرتے ہیں۔ کہ مجھے تو ذکر سے نفع نہیں ہوتا۔ وساوس بند نہیں ہوتے۔ شوق و ذوق پیدا نہیں ہوتا۔ شیخ اگر اناڑی ہے تو وہ ہر شکایت پر دل جمعی کے لئے ایک وظیفہ اضافہ کر کے مرید مجموعۃ الوظائف بنادے گا۔

جیسے علی حزین شاعر نے اپنے ہمسایہ کو تذکرۃ الاولیاء بنایا تھا۔ قصہ یوں ہے کہ علی حزین جب دہلی آیا۔ تو اس کے لئے ایک محل بہت عمدہ تجویز کیا گیا۔ وہ اس میں رہنے لگا۔ اس کے دہلیز میں ایک مداری فقیر رہتا تھا۔ وہ رات کو ایک لمبا شجرہ پڑھا کرتا تھا۔ چند روز میں مالک مکان علی حزین کی مزاج پرسی کے لئے آئے۔ کہ اگر کسی قسم کی تکلیف ہوئی ہو۔ تو ظاہر فرمایا جائے۔ تاکہ اس کا بندوبست کیا جائے۔ علی حزین نے کہا اور تو کچھ تکلیف نہیں مگر اس تذکرۃ الاولیاء کو کہیں اور کسی جگہ بسا دو۔ راتوں کا سونا ظالم نے تنگ کر دیا ہے۔ اس کا شجرہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ تو جیسے علی حزین نے اس فقیر کو تذکرۃ الاولیاء بنایا تھا۔ ایسا ہی میں کہتا ہوں ۔ کہ اناڑی شیخ اپنے مریدوں مجموعۃ الوظائف بنادیتا ہے۔ پھر بعضے تو ایسے وظائف بتلاتے ہیں جو شرع کے موافق ہیں اور بعضے تو بہت ہی بے تکے وظائف بتلاتے ہیں ۔ جو خلاف شرع ہیں۔ جیسے یا شیخ عبدالقادر، شیئاً للہ اور ایک وظیفہ مشہور ہے۔ اللہ الصمد ی

یا محمد مد دی ۔ اس میں صمد کی اضافت الی الالیاء مع لام تعریف کے نامعلوم کیسی اضافت ہے۔ یہ تو لفظی غلطی ہے اور معنوی غلطی نداء غیر اللہ ہے۔

اسی طرح کلکتہ میں کیرانہ کے ایک پیرزادے ہیں۔ ان کا رات دن وظیفہ یہ تھا۔ "یا حی یا قیوم، کچھ دے نقدی کچھ دے توم۔ پھر سنا ہے کہ ان کو کلکتہ پہنچ کر نقدی بہت ملی اور ایک وظیفہ بعضے لوگ یہ بتلاتے ہیں۔ کہ اڑ بھنبیری ساون آیا۔ کوئی ان سے پوچھے۔ کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ تو کہتے ہیں۔ اجی بزرگوں کے کلام میں برکت ہوتی ہے۔ معنی سے کیا بحث۔

سبحان اللہ ہر کلام میں برکت کیوں کر تسلیم کر لی جائے۔ چاہے وہ کیسا ہی بے تکا کلام ہو۔ کوئی خدا اور رسول کا کلام تو نہیں۔ جو ایمان لے آیا جائے اور خدا اور رسول کا کلام بے تکا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو وظائف میں گڑبڑ ہے۔ بعض لوگ اشغال میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک شغل یہ بتلایا جاتا ہے۔ کہ سانس آنکھ ناک کان بند کر لو اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور اس پر غضب یہ کہ مولانا رومیؒ کو اس شغل کا موجد بتلاتے ہیں اور دلیل میں یہ شعر پڑھتے ہیں۔

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند   گر نہ بینی نور حق بر من بخند

(آنکھ، لب اور کان بند رکھ (یعنی ان اعضاء سے گناہ نہ کر) پھر اگر نور حق اپنے اندر محسوس نہ کرے تو ہم پر ہنسنا)

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اول تو ہم نے یہ شعر مثنوی میں دیکھا نہیں۔ نہ ہم کو اس میں ہونا یاد ہے اور اگر ہو بھی تو میں بقسم کہتا ہوں۔ کہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ معاصی سے ان اعضاء کو بچاؤ۔ کیونکہ نور حق کا وعدہ طاعات کے امتثال ترک معاصی ہی پر ہو سکتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ: قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں)

اور حدیث میں بھی ہے کہ جو شخص کسی نامحرم سے اپنی نگاہ کو روکے یا ہٹائے گا۔ وہ ایک حلاوت اپنے دل میں پائے گا۔ دوسرے مولانا کے زمانہ میں یہ اشغال نہ تھے۔ یہ تو جوگیوں سے لئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ طبی قاعدہ سے حصول یکسوئی میں یہ اشغال مفید ہیں۔ باقی ثواب میں ان کو کچھ دخل نہیں۔

اہلِ سلوک کی پریشانی

غرض یہ لوگ اسی ادھیڑ بن میں لگے رہتے ہیں۔ کہ کیفیات وغیرہ کے لئے وظائف پڑھیں ۔یا اشغال کریں اور اس کو بڑا مجاہدہ اور ثواب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کو مقصود سے کچھ بھی مس نہیں۔ اور جو شیخ اس حالت میں ان مریدوں کو وظیفے ہی بتلاتا جائے۔ اس کے متعلق محقق یوں کہے گا۔

بے خبر بودند از حال دروں — استعیذ اللہ مما یفترون

(حالت اندرونی (باطنی) سے بے خبر ہیں، جو کچھ افتراء کرتے ہیں) میں اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں)

اس کو اصل مرض کی خبر نہیں۔ جو اس شخص کی پریشانی کا سبب ہے، اصل مرض صرف یہ ہے کہ اس کے یکسوئی اور کیفیت ذوق وشوق وغیرہ کو مقصود سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے پریشان ہے۔ اس مرض کا اصلی علاج یہ ہے کہ اس کے ذہن نشین یہ مسئلہ کر دیا جائے۔ کہ یہ کیفیات مقصود نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ مامور بہا نہیں ہیں اور مقصود وہی ہے۔ جو مامور بہ ہے اور ظاہر ہے کہ تحصیل استغراق وغیرہ کا نصوص میں کہیں امر نہیں۔ کسی کو دعویٰ ہو تو دکھلائے۔ ہاں شوق[1] وخشیت کیلئے حدیث میں دعا آتی ہے۔ اس سے صرف اتنا معلوم ہوا۔ کہ بعض احوال محمود ہیں۔ مگر مقصود ہونا تو ثابت نہ ہوا۔ کیونکہ یاد رکھو کہ شریعت نے انہی اشیاء کو مقصود بنایا ہے جو بندہ کے اختیار میں ہوں اور جو شے اختیار انسان سے باہر ہو وہ مامور بہ نہیں ہوتی، نہ مقصود ہوتی ہے۔

شاید اس پر آپ کہیں۔ کہ مغفرت و دخول جنت بھی تو غیر اختیاری ہے۔ یہ بھی مقصود نہ ہوئی۔ ورنہ اگر یہ مقصود ہیں تو بتلاؤ قرآن میں ان کا کہاں امر ہے۔ میں یہ کہتا ہوں قرآن میں تو اس کا امر جابجا صراحۃً مذکور ہے:۔

سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ.

اور اس کا امر اس لئے ہے کہ ان دونوں کا حصول انسان کے اختیار میں ہے۔

---

[1] فان قلت قال تعالیٰ و فی ذلک فلیتنافس المتنافسون و ھذا ھو الشرق وقال و ایای فارھبون و ھذاھو الخشیۃ فکیف لا یکو نان ما مورین بھما قلت ان الما موربہ درجۃ الشرق والخوف العقلی دون الطبعی۔ ۱۲ جامع

شاید آپ اس سے چونکیں گے کہ حصول مغفرت و دخول جنت اختیار میں کہاں؟ تو میں کہتا ہوں۔ کہ امور اختیار کا اختیاری ہونا جس درجہ میں ہے اور جو مبنیٰ ان کے اختیاری ہونے کا ہے۔ کہ مبنیٰ یہاں بھی موجود ہے اور اس کا بھی وہی درجہ ہے۔ کیونکہ تمام امور اختیاریہ کے اختیاری ہونے کا مبنیٰ یہ ہے۔ کہ اس کا سبب انسان کے اختیار میں ہے۔

باقی یہ کہ مسبب براہ راست اختیار میں ہو۔ سو یہ کسی امر میں بھی نہیں۔ دیکھیئے سیراب ہونا۔ پیٹ بھرنا۔ ملازمت زراعت سے روپیہ حاصل کرنا وغیرہ جو اختیاری کہلاتے ہیں۔ اسی معنی کے اعتبار سے کہ ان کے اسباب اختیار میں ہیں۔ ورنہ مسبب تو کسی کے بھی اختیار میں نہیں۔ عقلاء سب اس پر متفق ہیں اور جب یہ ہے تو بتلاؤ جنت ومغفرت اختیاری کیوں نہیں۔ جب کہ ان کے اسباب اختیاری ہیں۔ یعنی اعمال صالحہ۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جا بجا اعمال پر مغفرت ودخول جنت کو متفرع فرمایا ہے اور اعمال اختیاری میں تو یہ بھی اختیار ہی ہے کیوں کہ سبب اختیار میں ہے اور سبب ہی کے اختیاری ہونے پر شئے کا اختیاری ہونا ہے مبنی۔ باقی ان احوال وکیفیات کی طلب وتحصیل کا امر تم بتلاؤ کہاں ہے۔ یا کس عمل پر ان کے ترتب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ بس سالکین کی زیادہ تر پریشانی کا راز یہ ہے کہ وہ غیر مقاصد کے درپے ہوتے ہیں۔

کیفیات میں اشتباہ

یہ حال تو محققین کا ہے کہ وہ کیفیات کے طالب ہیں اور ان کے انعدام سے پریشان ہوتے ہیں۔ وجہ یہ کہ یہ محقق ہونے کے ساتھ غیر محقق ہیں اور ایک جماعت مبطلین کی ہے۔ جن کو غیر محققین بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی یہ حالت ہے کہ احوال وکیفیات کی طلب میں ان لوگوں سے معاصی تک سرزد ہوتے ہیں۔ مثلاً بیوی بچوں سے ترک تعلق کر دیتے ہیں۔ تاکہ کیفیت میں فرق نہ آئے۔

میرٹھ کا واقعہ ہے کہ میں وہاں اپنے گھر میں علاج کے واسطے ان کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ اس وقت ایک مسماۃ نے بیعت کی درخواست کی۔ چند عورتوں نے اس کو کہا۔ تو ان سے بیعت نہ ہو۔ بلکہ ہمارے پیر سے مرید ہونا جنہوں نے پچاس سال سے بیوی کا منہ نہیں دیکھا اور یہ تو سفر میں بیوی کو لئے لئے پھرتے ہیں۔ اس مسماۃ نے اس قسم کا جواب دیا کہ

تمہارے پیر سے تو میں ہرگز بیعت نہ ہوں گی۔ وہ تو پچاس برس سے خدا کی نافرمانی میں مبتلا ہے۔ کہ بیوی بچوں کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ میں تو ان سے مرید ہوں گی۔ ان کا طرز سنت کے موافق ہے۔ تو اس ظالم نے پچاس برس سے بیوی کو چھوڑ رکھا تھا۔ شاید اسی لئے علیحدہ رہا ہوگا۔ تاکہ بیوی کے اختلاط سے یکسوئی وغیرہ کی کیفیت میں خلل نہ آ جائے۔ مگر جو کیفیت معصیت کے ساتھ بھی مجتمع رہے۔ ایسی کیفیت خود مردود ہے۔ یاد رکھو کہ بعض دفعہ کیفیات محمود و کیفیات غیر محمودہ میں صورۃ اشتباہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً تذلل و تملق و تواضع کی صورت متشابہ ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی نفسانی یکسوئی اور روحانی یکسوئی میں اشتباہ ہوتا ہے۔ بیوی بچوں سے الگ رہ کر جو یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ وہ نفسانی یکسوئی ہے۔ روحانی نہیں ہے۔ اس تشابہ و تشاکل کو مولانا رومیؒ اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں ۔۔۔۔ درمیاں شان برزخ لا یبغیاں

(بحر تلخ اور بحر شیریں دونوں برابر جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط نہیں ہوئے)

کیفیات کے لئے معیار

جب کیفیات میں باہم تشابہ ہے۔ تو اب کسی معیار کی ضرورت ہوئی۔ جس سے معلوم ہو سکے۔ کہ کون سی کیفیت محمودہ ہے اور کون سی مذمومہ۔ سو اس کے لئے معیار صرف شریعت مقدسہ ہے۔ یعنی جو کیفیت کسی گناہ کا مقدمہ ہو جائے وہ مذموم ہے۔ ورنہ محمود ہے۔ اگر یہ معیار سامنے نہ ہو تو پھر کیفیات تو جوگیوں کو بھی نصیب ہو جاتی ہیں۔ کیا ان کو بھی صوفی اور ولی کہو گے؟ اور آج کل اس کہہ دینے میں بھی استبعاد نہیں کیونکہ جب لوگوں نے کیفیات ہی کو مقصود سمجھ لیا ہے اور تصوف انہی کا نام رکھ چھوڑا ہے۔ تو ان کے نزدیک ہر صاحب کیفیت صوفی ہے۔ خواہ مسلم ہو یا کافر۔ چنانچہ آج کل ایک کافر صاحب ریاضت کے بہت مسلمان معتقد ہیں۔ اور مظفر نگر میں سنا تھا کہ ایک ہندو بابو کے بہت سے مسلمان مرید ہیں۔ اسی طرح بعض دفعہ ہندو کسی مسلمان پیر سے مرید ہوتے ہیں اور وہ مسلمان پیر صاحب اس کو مرید کر لیتے ہیں اور مرید صاحب ہندو کے ہندو ہی رہتے ہیں۔ یہ مصلحت سمجھتے ہیں۔ کہ شاید کسی

وقت مسلمان ہو جاویں۔مگر ہمارے اکابر نے اس سے بھی منع فرمایا ہے۔گنگوہ میں حضرت مولانا قدس سرہ کے پاس ایک ہندو مرید ہونے آیا اور تعجب یہ کہ وہ ایک بہت بڑے بزرگ زمانہ سے مرید تھا۔ان کا انتقال ہو گیا تھا۔اس لئے مولانا کے پاس تجدید بیعت کے لئے آیا اور ان مرحوم بزرگ کے ایک معتقد کا خط لایا۔حضرت مولانا نے صاف فرما دیا۔کہ بیعت کرنے سے انکار نہیں۔مگر ہمارے یہاں بیعت کی سب سے اول شرط اسلام ہے۔مسلمان ہو جاؤ۔ہم مرید کر لیں گے۔اس نے یہ شرط قبول نہ کی۔حضرت نے مرید نہ کیا، بعد میں بعضوں نے عرض کیا کہ حضرت اگر اس کو اسی حالت میں مرید کر لیا جاتا۔تو اسلام سے قریب ہو جاتا۔فرمایا ہرگز نہیں۔بلکہ اور بعید ہو جاتا۔کیونکہ ذکر و شغل میں خاصیت ہے کہ اس سے کیفیات طاری ہوتی ہیں اور کیفیات میں خاص لذت بھی ہوتی ہے۔جس کو یہ شخص قرب حق کی لذت سمجھتا اور اس کو کافر رہ کر بھی یہ کیفیات حاصل ہو جاتیں۔تو اس کا یہ خیال پختہ ہو جاتا کہ قرب الٰہی میں اسلام کو کچھ دخل نہیں۔نہ اسلام کی ضرورت ہے۔بلکہ کافر رہ کر بھی قرب حق حاصل ہو سکتا ہے۔تو پھر کسی وقت بھی اس کے اسلام لانے کی امید نہ رہتی اور اب جو کورا جواب دیا گیا ہے۔کہ بدوں اسلام کے خدا کا راستہ نہیں مل سکتا۔اب امید تو ہے کہ شاید کسی وقت اسلام کی ضرورت کا خیال اس کے دل پر غالب ہو۔

تصوف یا جوگ؟

اس قصہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی۔کہ کیفیات کافر کو بھی حاصل ہو جاتی ہیں اور ظاہر ہے۔کہ جس چیز کے حصول میں اسلام بھی شرط نہ ہو۔وہ کیوں کر مقصود اور قرب کا موقوف علیہ ہو سکتی ہے۔ہرگز نہیں۔کہ خوب سمجھ لو۔کہ ان کیفیات کو قرب میں کچھ دخل نہیں۔نہ یہ مقصودِ تصوف ہیں۔

اور ایک مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کفار کو مرید کرنا اسلام سے ان کو قریب کرنا نہیں ہے۔بلکہ بعید کرنا ہے۔آج کل ایک صاحب پیر بنے ہوئے ہیں۔ان سے ہندو بھی مرید ہیں اور ستم پر ستم یہ کہ آپ نے ایک رسالہ میں یہ بھی شائع کیا ہے۔کہ میرے بعض ہندو مرید مجھ سے کہتے ہیں۔کہ اگر آپ کہیں تو ہم مسلمان ہو جائیں۔میں نے ان کو لکھ دیا ہے کہ نہیں۔مسلمان

ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ ہندو رہ کر بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ (یا اسی کے قریب کچھ الفاظ تھے)۔ بتلایئے جو شخص مسلمان ہونے والے کو اسلام سے روکے اور یہ کہے کہ اسلام کی ضرورت نہیں۔ اس کے کفر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ کمبخت پھر بھی شیخ طریقت اور پیر ہونے کے مدعی ہیں۔ نہ معلوم کہ یہ کیسا تصوف ہے۔ جس کے لئے اسلام کی بھی ضرورت نہیں۔ سلف کے نزدیک تو تصوف کے معنی تعمیر الظاہر والباطن تھے۔ کچھ عرصہ سے تعمیر ظاہر کو تو لوگوں نے تصوف سے نکال ہی ڈالا تھا۔ اب ایسے خلف پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تعمیر باطن کو بھی اس سے الگ کر دیا۔ کہ ایمان واسلام سے بھی دل کو آباد کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب ایمان وعمل دونوں اجزاء جاتے رہے۔ تو فرمایئے! وہ تصوف کیا خاک رہا۔ بلکہ محض جوگ رہ گیا۔ پھر یہ لوگ اپنے کو صوفی کس لئے کہتے ہیں۔ جوگی کہنا چاہیئے۔

انہی وجوہ سے بعض لوگ تصوف سے بداعتقاد ہو گئے۔ کہ یہ عجیب گورکھ دھندا ہے۔ جس میں نہ اسلام کی ضرورت۔ نہ ایمان کی، نہ عمل کی۔ نہ معاصی سے بچنے کی اور ظاہر ہے کہ سب مسلمان تو ایسے جاہل نہیں کہ ان کو دین کی کچھ بھی عقل نہ ہو۔ وہ اس حالت کو یقینی بے دینی سمجھتے ہیں اور ان جوگیوں کی وجہ سے جنہوں نے شیخ اور صوفی کا لقب اختیار کر رکھا ہے۔ اس فیصلہ پر مجبور ہوئے۔ کہ تصوف زندقہ اور بے دینی کا نام ہے۔

مگر میں کہتا ہوں۔ کہ کیا چند اناڑی عطائیوں کے غلط سلط نسخوں سے فن طب یا محقق اطباء سے بھی آپ بداعتقاد ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے۔ کہ عطائی صوفیوں کی حرکات سے آپ تصوف کو چھوڑ دیں اور محقق صوفیاء سے بھی بداعتقاد ہو جائیں۔ جس طرح آپ علم طب میں محقق طبیب کی تلاش کرتے ہیں۔ اسی طرح تصوف میں بھی محقق صوفی کو تلاش کرنا چاہیے۔ سب سے بداعتقادی کی کیا وجہ ہے۔ غرض میں کیفیات کے غیر مقصود ہونے کو بتلا رہا تھا۔ کہ ان کے حصول میں اسلام کی بھی ضرورت نہیں۔ تو پھر یہ مدارِ قرب کیوں کر ہو سکتے ہیں۔

کیفیات محمودہ

اب ایک بات اور کہتا ہوں۔ کہ دین میں مقصود وہ ہوتا ہے۔ جو بدوں تحصیل کے حاصل نہ

ہو۔ جس کا حصول صرف اختیار پر موقف ہو اور قرآن میں منصوص ہے۔ کہ بعضے احوال جیسے کشف مرتے ہی سب کو خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ کفار کو بھی۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَبَدَالَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَالَمْ يَكُوْنُوْ ايَحْتَسِبُوْنَ. (اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا)

اور فرماتے ہیں:۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآئَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ۔ (پس ہم نے تجھ پر تیرا پردہ غفلت کا ہٹا دیا پس آج تو میری نگاہ بڑی تیز ہے)

اور ارشاد ہے:۔

اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا. (جس روز یہ لوگ (حساب وجزا) کے لئے ہمارے پاس آئیں گے)

باقی میرا مطلب یہ نہیں۔ کہ یہ محمود بھی نہیں۔ اگر کسی کو کیفیات محمودہ حاصل ہوں (جس کی محمودیت کا معیار آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔ کہ اس سے طاعت میں ترقی اور گناہوں میں کمی ہو) تو نور علیٰ نور ہے۔ خدا کی نعمت ہے۔ اس کی قدر کرے اور نہ حاصل ہوں۔ تو کچھ غم نہ کرے۔ اس وقت اس کو مولانا رومیؒ کا یہ شعر سنایا جائے گا:۔

روزہا گر رفت گورو باک نیست　　　تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

(ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیے، اگر گئے بلا سے گئے، عشق جو اصلی دوست ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا ایسا ہونا کافی ہے)

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ سے جب کوئی یہ کہتا۔ کہ اتنی لاکھ دفعہ ذکر کرتا ہوں۔ مگر نفع نہیں ہوتا۔ تو فرمایا کرتے۔ کیا یہ نفع تھوڑا ہے۔ کہ اتنی لاکھ مرتبہ ذکر کی توفیق ہوگئی۔ ہمارے ایک دوست ہیں۔ وہ ذکر و شغل کے پابند ہیں۔ مگر طالب کیفیات ہیں اور کیفیات ان کو حاصل نہیں ہوتیں۔ کیوں کہ کیفیات کا مدار یکسوئی پر ہے اور یکسوئی کم عقلوں کو زیادہ ہو جاتی ہے۔ عاقلوں کو خاص کر، صاحب ذکاوت مفرطہ کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کا دماغ ہر وقت حرکت فکریہ میں رہتا ہے۔ اسی لئے میں نے ان سے کہہ دیا تھا۔ کہ تم کو کیفیات کبھی حاصل نہ

ہوں گے۔ تم صرف ذکر و شغل کو غنیمت سمجھ کر کئے جاؤ۔ مگر وہ طلب سے باز نہ آئے۔ ایک صاحب توجہ و صرف بزرگ کے پاس گئے۔ انہوں نے ان سے روزے رکھوائے، درود و استغفار نامعلوم کتنا پڑھوایا۔ پھر ان پر توجہ ڈالی۔ ایک دن ڈالی۔ پھر دوسرے دن۔ پھر تیسرے دن۔ مگر ان پر اثر ہی نہ ہوا۔ ایک کیفیت بھی حاصل نہ ہوئی۔ اس وقت ان کو میرے قول کی تصدیق ہوئی کہ واقعی میں کیفیات کے قابل نہیں ہوں۔ اس وقت طلب کیفیت دل سے نکلی۔

اور اس سے قبل ان ہی کا ایک واقع اور ہوا تھا۔ کہ ان کو ایک ریاست میں جہاں عرصہ تک ملازم رہے تھے۔ کسی کام سے جانا پڑا۔ مجھ سے اجازت لی۔ میں نے اجازت دے دی۔ گو میں جانتا تھا کہ اس سفر سے معمولات ناغہ ہوں گے۔ مگر میں نے قصداً یہی سمجھ کر اجازت دی تھی کہ ذرا ان کو ذکر و شغل کی قدر تو معلوم ہو۔ چنانچہ اس سفر میں معمولات کے ناغہ ہونے سے ان کو اپنے قلب میں ایک ظلمت سی محسوس ہوئی اور وہ جو ذکر اللہ سے خاص نور پیدا ہوا تھا۔ اس میں کمی ہوئی۔ تو وہ بڑے گھبرائے اور نہایت قلق ہوا۔ میرے پاس خط لکھا۔ جس میں اپنی تباہی اور بربادی کا رونا رویا تھا۔ میں نے لکھا کہ آج ان معمولات کے ناغہ ہونے کی فکر کیوں ہے۔ اس کا قلق اس قدر کس لئے ہے۔ یہ تو وہی ہے جس کی تم تحقیر کرتے تھے اور کہتے تھے۔ کہ بدوں کیفیت کے معمولات لاشئے ہیں۔ ان واقعات کے بعد وہ چین سے بیٹھے اور سمجھ گئے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا نام لینا ہی بڑی دولت ہے۔ یہ دولت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی۔

دولت توفیق

اگر وہ تم سے توفیق سلب کر لیں اور تم ایک دفعہ بھی اللہ کا نام نہ لے سکو۔ تو بتاؤ کیا کر لو گے۔

بلا بودے اگر ایں ہم نبودے

(اگر یہ بھی نہ ہو تو سخت مصیبت ہو)

سنبھلو کیا کیفیات لئے پھرتے ہوئے۔ تم اس غیر مقصود کی طلب میں مقصود کی بیقدری کر کے کہیں اس سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھنا۔ کیونکہ ایک صورت قہر نازل ہونے کی یہ بھی ہے کہ خدا کا نام لینے کی توفیق سلب ہو جائے۔

چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے۔ کہ انہوں نے ایک دفعہ کلمہ توحید زبان سے نکالنا چاہا۔ مگر زبان نہ چلی اور سب باتوں میں زبان چلتی تھی۔ مگر کلمہ زبان سے نہ نکلتا تھا۔ یہ عارف تھے۔ گھبرا گئے۔ اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اس کا کیا سبب ہے۔ الہام ہوا کہ فلاں دن جس کو اتنے سال ہوئے۔ تم نے ایک بے جا کلمہ زبان سے نکالا تھا اور اب تک اس سے توبہ نہیں کی۔ آج اس کی یہ سزا مل رہی ہے۔ کہ کلمہ حق کی توفیق سلب ہوگئی۔ اس گناہ سے توبہ کرو تو عذاب ٹلے۔ چنانچہ انہوں نے توبہ کی۔ توبہ قبول ہوئی اور یہ وبال رفع ہوا۔ حضرت! اس کو معمولی بات نہ سمجھئے۔ کہ آپ کو ذکر کی توفیق ہوگئی۔ واللہ یہ بڑی دولت ہے۔ ورنہ ہزاروں لاکھوں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ جن کی زبان کو خدا نے توفیق ذکر سے بند کر دیا ہے۔

جیسے ایک حکایت ہے۔ کہ غلام اور آقا بازار کو گئے۔ راستہ میں مسجد آگئی۔ غلام نمازی تھا۔ آقا بے نمازی۔ غلام نے نماز پڑھنے کے لئے آقا سے اجازت چاہی۔ اس نے اس کو اجازت دے دی اور خود مسجد کے دروازہ پر بیٹھ گیا۔ جب نماز ختم ہوگئی اور نمازی مسجد سے نکلنے لگے تو آقا صاحب کو انتظار ہوا کہ اب غلام بھی آتا ہوگا۔ مگر وہ نہ آیا اور بہت دیر لگادی۔ اس پر آقا نے جھلا کر پکارا۔ کہ میاں کہاں رہ گئے۔ آتے کیوں نہیں۔ غلام نے جواب دیا۔ کہ آنے نہیں دیتے۔ کہاں کون نہیں آنے دیتا۔ کہاں جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا، وہ مجھ کو باہر نہیں آنے دیتا۔ صاحبو! یہ توفیق اور عدم توفیق ہی تو ہے۔ کہ غلام مسجد کے اندر نواب بنا بیٹھا ہے اور آقا صاحب باہر سیڑھیوں پر منتظر نوکر بنے بیٹھے ہیں۔

مگر آج کل ایسے مذاق کے بھی لوگ موجود ہیں جو بجائے اس کے کہ خذلان پر قلق کریں۔ فخر کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص کا بچھڑا ہاتھ سے چھوٹ کر مسجد میں گھس گیا۔ مؤذن جھلانے لگا۔ کہ لوگ جانوروں میں مسجد میں گھسا دیتے ہیں۔ تو وہ بچھڑے والا جواب دیتا ہے۔ کہ میاں جی کیوں بگڑتے ہو۔ جانور بے سمجھ تھا۔ مسجد میں آگیا۔ بھلا کبھی تم نے ہمیں بھی یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کمبخت کے نزدیک مسجد میں جانا کم سمجھ لوگوں کا کام ہے۔ مگر ایسے نامعقولوں کو موت کے بعد اب معلوم ہوگا جہاں وہ قابل خطاب نہیں ہیں۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ ذکر اللہ ہی بڑی دولت ہے۔ اس کی قدر کرو اور کیفیات کے درپے ہو کر اس کی بے قدری نہ کرو۔ مولانا رومیؒ نے اس پر ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک سالک کو شیطان نے دھوکہ دیا۔ کہ تم برسوں سے ذکر و شغل تہجد وغیرہ کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ کوئی پیام ہے۔ نہ کوئی سلام ہے۔ تو پھر تم ہی کیوں سر مارتے ہو۔ جب وہ پوچھتے تک بھی نہیں۔ اس دھوکہ کا اس کے ذہن میں کچھ جواب نہ آیا۔ تو اس رات اس نے ذکر و شغل و تہجد سب ترک کر دیا۔ سوتے ہوئے کوئی لطیفۂ غیبیہ خواب میں آیا اور اس نے حق تعالیٰ کی طرف سے پوچھا۔ کہ کیوں صاحب آج ہم کو چھوڑ کر کیوں سو گئے۔ نہ ذکر کیا۔ نہ تہجد میں اٹھے۔ اس نے وہی جواب دیا۔ جو شیطان نے دھوکہ میں پڑھایا تھا۔ کہ ادھر سے تو کچھ پیام و سلام ہے ہی نہیں۔ پھر میں ہی کیوں سر ماروں۔ وہاں سے جواب ارشاد ہوا۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　　واں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(تیرا یہ اللہ ہی کہنا ہمارا جواب ہے اور تیرا یہ سوز و نیاز اور درد ہمارا قاصد ہے)

کہ یہ اللہ اللہ کہنا خاص کر ایک دفعہ اللہ کہہ کر دوبارہ زبان سے اللہ نکلنا یہ ہمارا جواب ہی تو ہے۔ کہ ہاں ہم نے پہلا قبول کر لیا ہے۔ اگر پہلا قبول نہ ہوتا۔ بلکہ ناگوار ہوتا تو زبان بند کر دیتے اور ذکر کی توفیق سلب کر لیتے۔ کیوں کہ جس شخص کا دربار میں آنا بادشاہ کو ناگوار ہو۔ اور بادشاہ صاحب قدرت بھی ہو تو وہ پہلی دفعہ کان پکڑ کر اس کو نکال دیتا ہے۔

علامت قبول

حاجی صاحبؒ نے اس سے ایک مسئلہ مستنبط فرمایا ہے کہ جس طاعت کے ایک دفعہ کرنے کے بعد دوبارہ اس کی توفیق ہو جائے تو سمجھو کہ پہلی طاعت قبول ہو چکی۔ یہ علامت قبول کی ہے اور گو یہ استنباط قطعی نہیں۔ مگر ظاہر عادۃ اللہ اور وسعت رحمت اسی کو مقتضی ہے۔ پس تغلیب رجا میں یہ بہت نافع ہے۔ جو کہ شرعاً مامور بہ ہے۔

لا یموت احدکم الا وھو یحسن الظن بربه (تم میں سے کسی کی موت اس حالت میں نہ آئے کہ وہ اپنے رب سے حسن ظن نہ رکھتا ہو) (سنن أبي داؤد: ۳۱۱۳، حلية الأولياء ۸:۱۲۱)

مقصود بیعت

الغرض آج کل بیعت کی حقیقت و غایت میں عام طور سے غلطی ہو رہی ہے۔ لوگ مقاصد وغیر مقاصد میں فرق نہیں کرتے۔ نہ اعمال کا اہتمام کرتے ہیں۔ نہ اعمال پر روک ٹوک ہے۔ حالانکہ تعلق بیعت میں طرفین سے التزام بھی ہے۔ اطاعت کا اور معاہدہ ہے۔ اصلاح کا پھر بھی وہاں روک ٹوک نہیں۔ صرف وظائف کی بھر مار ہے۔ اور اگر کچھ روک ٹوٹ ہے بھی تو صرف دو چار اعمال پر۔ جن کا ضروری ہونا سب کو معلوم ہے حالانکہ وہ باتیں زیادہ بتلانی چاہئیں۔ جن کی مخاطب کو ضرورت ہی معلوم نہیں۔ مگر ایسی باتیں کیونکر بتلائیں۔ ان کی ضرورت سے خود شیخ ہی منکر ہیں اور منکر اس لئے ہیں۔ کہ ان سے خود کورے ہیں۔ اس لئے امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اے عزیز! تمہاری اصلاح کی کیا امید ہو۔ جب کہ تمہارے طبیب ہی مریض ہیں۔ صاحبو! بیعت ہونے کے بعد جن چیزوں پر روک ٹوک زیادہ ضروری ہے۔ وہ اس قسم کی ہیں۔ کبر و عجب اضاعت حقوق العباد، حسد و بغض، فساد ذات البین وغیرہ۔ مگر آج کل ان امور پر مطلق روک ٹوک نہیں۔ حالانکہ پہلے زمانہ میں مشائخ کو اول اسی کا زیادہ اہتمام تھا۔ وظائف تو سال ہا سال کے بعد تعلیم کرتے تھے۔

اور یہی نہیں کہ محض زبان سے ان امور پر روک ٹوک کریں۔ بلکہ تدبیروں سے ان امراض کو قلب سے نکالتے تھے۔ مثلاً کسی کو زینت پرستی میں مبتلا دیکھا۔ تو اسے سڑکوں پر خانقاہ میں چھڑکاؤ کرنا۔ جھاڑو دینا بتلا دیا اور جس میں تکبر دیکھا۔ اس کو نمازیوں کے جوتے سیدھا کرنا تعلیم کر دیا۔ جن میں ایک جولاہے کے بھی جوتے تھے۔ جو اس متکبر کی رعیت کا جولاہا ہے۔ اس کے جوتے سیدھے کرتے ہوئے بس جگر ہی تو کٹ گیا اور دل پر آرہ ہی تو چل پڑا۔ مگر یہ حالت ایک دو دفعہ میں ہوتی ہے۔ پھر افعال تواضع ہیں۔ خاصیت ہے کہ ان سے قلب میں بھی تواضع پیدا ہو جاتی ہے۔ کرتے کرتے ہر قسم کی عادت ہو جاتی ہے۔

حضرت شیخ ابو سعید گنگوہیؒ کا قصہ میں نے بارہا بیان کیا ہے۔ غالباً سامعین اکثر اس سے واقف ہوں گے۔ کہ سلطان نظام الدین بلخیؒ نے ان کے عجب کا کس طرح علاج فرمایا

تھا۔ کہ اول ان کو حمام جھونکنے کی خدمت سپرد کی۔ پھر سال بھر کے بعد بھنگن سے کہا کہ ان کے سر پر ذراسی اپنے ٹوکرے کی مٹی جھاڑ دے۔ جب وہ اس پر جھلائے۔ تو ایک مدت تک پھر یہی خدمت اور لی اور اس کے بعد مدت تک پھر یہی خدمت لی۔ پھر شکاری کتوں کی خدمت سپرد کی اور یہ کام اس شخص سے لئے۔ جو گنگوہ کے پیر زادے بھی تھے اور قطب زادے بھی تھے۔ اس قسم کی خدمتیں لے کر پھر کہیں ذکر شغل بتلاتے تھے۔

اصلاح اخلاق

اے صاحب! اس قسم کی تعلیم کا تو آج کل کہیں پتہ بھی نہیں۔ حالانکہ ضرورت اسی کی ہے۔ کیونکہ شیخ کو طبیب کی طرح ہونا چاہیے۔ کہ ہر مریض کو ایک ہی نسخہ نہ دے۔ بلکہ نسخے بدلتا رہے۔ جیسا مریض دیکھے۔ ویسا ہی نسخہ بتلائے اور ایک مریض کو بھی ایک نسخہ نہ دے۔ بلکہ اس کیلئے حسب ضرورت تبدل و تغیر کرتا رہے۔ مگر آج کل شیوخ کے یہاں بس ایک ہی طریقہ سب کے لئے ہے۔ یہ طرز ٹھیک نہیں۔ بلکہ ہر شخص کے مناسب اس کے امراض کی تشخیص کے بعد جدا جدا تعلیم ہونا چاہیے اور ان کو رات دن اعمال و اخلاق پر ٹوکنا چاہیے اور جن اعمال کا دین ہونا عام طور سے معلوم ہے۔ اس کا اہتمام اس قدر زیادہ ضروری نہیں۔ بلکہ جن باتوں کا دینی ہونا لوگوں کو معلوم نہیں ان کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ مثلاً اصلاح اخلاق کو آج کل دنیوی امور سے سمجھتے ہیں۔ اصلاح اخلاق کو دین نہیں سمجھتے۔ مثلاً لوگوں کو اس کا اہتمام ہی نہیں۔ کہ ہمارے فعل یا قول سے کسی کو ایذا نہ پہنچے۔ نہ اس کو دین کا کام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ اتنا بڑا کام ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه و يده (الصحیح للبخاری ۱:۹،۸:۱۲۷)

کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اسلام ہی کو موقوف فرمایا ہے۔ گو علماء نے اس میں تاویل کر لی۔ کہ مراد کمال اسلام کا موقوف ہونا ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تو یہی ہیں۔ کہ مسلمان وہی

ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔ یعنی جو ایسا نہ ہو وہ مسلمان ہی نہیں۔ کیا ان الفاظ کا اطلاق کچھ اثر نہیں رکھتا۔ گو مراد وہی ہے۔ جو علماء نے فرمائی ہے۔

اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اب میں ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا کس درجہ اہتمام تھا۔ حدیث میں آتا ہے۔ کہ ایک رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر تھے۔ کیونکہ ان کی باری تھی اور وہ رات شب براءت کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نصف شب کے وقت حکم ہوا کہ جنۃ البقیع کے مسلمانوں کے لئے جا کر دعا کریں۔ تو آدھی رات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے۔ جس کی کیفیت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یوں بیان فرماتی ہیں:۔

تام رویدا او فتح الباب روید اثم خرج رویدا ثم اغلقه رویدا.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ سے اٹھے۔ آہستہ آہستہ چلے۔ آہستہ ہی دروازہ کھولا۔ آہستہ ہی باہر تشریف لے گئے۔ آہستہ ہی اس کو بند کیا۔ ہر کام آہستہ کیا۔ تاکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ ان کو تکلیف نہ ہو۔ حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کون تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عاشق تھیں۔ جن کا محبوب کے لئے بزبان حال یہ قول تھا۔

گر بر سر و چشم من نشینی　　　　نازت بکشم کہ نازنینی

(اگر تو میرے سر اور آنکھوں پر بیٹھے تو تیرا ناز اٹھاؤں اس لئے کو تو نازنین ہے)

اول تو عموماً بیوی کو شوہر سے ایسا تعلق ہوتا ہے۔ کہ اگر خاوند سوتی ہوئی کو جھنجھوڑ بھی دے۔ تب بھی اس کو ایذاء نہ ہو۔ بلکہ راحت ہو۔ اور خصوصاً حضرات ازواج مطہرات تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ عاشق تھیں اور بالخصوص ان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ مگر اس تعلق پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نیند کا اس قدر خیال فرمایا۔ کہ سب کام آہستہ کیے۔

مگر یہ تو عاشق تھیں۔ ان کو خبر کیسے نہ ہوتی۔ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان ایسا

کیا تھا۔ کہ ان کو خبر نہ ہو۔ مگر جب مکان حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خالی ہوا۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قلب نے حالِ نوم ہی میں اس کا احساس کیا اور ان کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پایا تو بڑی پریشانی ہوئی۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید آپ کسی بیوی یا باندی کے پاس چلے گئے۔ بالآخر پریشانی میں گھر سے نکلیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جاتے ہوئے دیکھ کر بقیع کی طرف چلیں۔ دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لئے دعا فرما رہے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر اطمینان ہوا اور واپس ہوئیں اور پیچھے پیچھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی واپس ہوئے اور راستہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قریب ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی پہنچ گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس خیال سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہ ہو۔ تیز تیز چلنا شروع کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوا کہ یہ آگے آگے کون ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تیز چلنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھاگنے لگیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اپنے گھر میں داخل ہو کر بستر پر لیٹ گئیں۔ مگر سانس پھولا ہوا تھا۔ اس کو کیوں کر دباتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو گھر میں تشریف لائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سانس پھولا ہوا معلوم ہوا۔ فرمایا:۔

یا عائشة ما لک حشیا رابیة

یہ لمبا لمبا پھولا ہوا سانس کیوں آرہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے آگے آگے تم ہی بھاگی ہوئی آرہی تھیں۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہنس پڑیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اتخافین ان یحیف اللّٰہ علیک و رسولہٗ

اسی طرح حضرت مقداد بن الاسود صحابی فرماتے ہیں۔ کہ ہم چند آدمی بھوکے پیاسے مدینہ پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اپنے ذمہ کر لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں چند بکریاں پلی ہوئی تھیں۔ ان کا دودھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بتلا دیا۔ ہم سب بھی پی لیتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی رکھ دیتے۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ ایک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکان پر تشریف لانے میں ذرا دیر ہوئی۔ میں یہ سمجھا کہ شاید کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کر دی ہوگی۔ اس خیال سے میں نے آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کے حصہ کا بھی دودھ پی لیا۔ پی تو لیا۔ مگر بعد میں خیال ہوا۔ کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نہ ہوئی ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھوکے پیاسے رہے۔ تو کیوں کر ہوگی۔ بس یہ خیال آنا تھا اور مجھے بے چینی ہونے لگی۔ اب ہر چند کروٹیں بدلتا ہوں۔ مگر چین نہیں آتا۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت دیر میں تشریف لائے۔ اور آہستہ کواڑ کھولے۔ اور ایسا آہستہ سلام کیا۔ جس کو جاگنے والا سن لے اور سونے والا نہ جاگے۔ اللہ اکبر کیسا عدل جامع بین حق اللہ وحقوق العباد تھا۔ کہ نہ تو سونے والوں کی اتنی رعایت کہ سلام ہی نہ کریں۔ کیونکہ احتمال اس کا بھی ہے۔ کہ شاید کسی عارض سے کوئی جاگ رہا ہو۔ اور نہ اتنا غلو۔ کہ زور سے اس طرح سلام کریں۔ کہ سب کی آنکھ کھل جائے۔

چنانچہ آج کل صوفی اور سالکین بھی ان امور کی رعایت نہیں کرتے۔ رات کو اٹھتے ہیں تو زور کے ساتھ کھٹ پٹ چلتے ہیں۔ استنجاء کے لئے ڈھیلے بھی زور سے پھوڑتے ہیں۔ پانی بھی زور سے بھرتے ہیں۔ کلی بھی زور سے کرتے ہیں۔ آخر یہ کیا طریقہ ہے۔؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کسی دوسری قوم کے لئے ہے۔ کہ وہ اس پر عمل کریں اور تم عمل نہ کرو۔

پورا قصہ یہ ہے کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس برتن کی طرف چلے۔ جس میں دودھ رکھا جاتا تھا۔ اس کو خالی پایا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہوگئے اور نماز کے بعد حق تعالیٰ سے دعا کی۔ کہ اے اللہ اس وقت جو مجھے کھانا کھلائے اس کو آپ بھی روزی دیجئے۔ اس وقت حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے نہ رہا گیا اور اللہ کا نام لے کر بکریوں کے نیچے جا بیٹھے۔ تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے سب کے تھن خوب بھرے ہوئے ہیں۔ تب بہت سا دودھ لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پی لیا۔ تو ان سے کہا کہ تم بھی پیو۔ اس پر یہ بہت ہنسے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سبب پوچھا تو سارا واقعہ سنایا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ طریقہ تھا۔ مگر ہم کو اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذرا اہتمام نہیں اور ایک مرض ہم میں یہ ہے کہ کسی جگہ سے کوئی چیز اٹھائیں گے۔ تو اس کو بے جگہ رکھ دیں گے۔ جس سے دوسروں کو تلاش میں پریشانی ہوتی ہے۔ چارپائی بچھائیں گے۔ تو بالکل راستہ میں۔ پھر اس کو وہیں چھوڑ کر

کھڑے ہو جائیں گے۔ چاہے رات کو کوئی الجھ کر ہی گر پڑے۔ اور ہاتھ پاؤں یا سر ہی پھوٹ جائے۔ اسی طرح جماعت کے بعد نفلوں کی نیت ایسی جگہ باندھیں گے۔ جس سے لوگوں کو چلنے پھرنے میں تکلیف ہو۔ کسی جگہ سے برتن میں کھانا آیا تو اب یہ نہیں ہوتا۔ کہ اس کا برتن جلدی خالی کر دیں۔ بلکہ اسی میں کھانا شروع کر دیں گے۔ بلکہ کئی روز تک اس کو محبوس رکھیں گے اور دوسرا شخص برتن مانگے تو کہتے ہیں کیا ہم رکھ لیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ دیر کرنے میں یہ بھی اندیشہ ہے۔ کہ تم رکھ لو۔ یعنی رکھ کر بھول جاؤ۔ چنانچہ ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کسی کے برتن جلدی واپس نہ کئے اور رکھ کر بھول گئے۔ پھر مہینوں تک وہ اپنے ہی گھر پڑے رہے۔ اگر مالک کو خود ہی یاد آ گئے تو وہ خود بلا سے لے جائے۔ ورنہ بس یہیں رہ جاتے ہیں۔ آخر یہ باتیں کلفت کی ہیں یا نہیں؟۔ پھر ان سے احتراز کیوں نہیں کیا جاتا۔

اسی طرح مریدوں کی عادت ہے۔ کہ پیر کے ساتھ کسی جگہ جائیں گے۔ تو جماعت کی جماعت بیس پچیس آدمیوں کی ساتھ جائے گی اور وہ پیر بھی حضرت ہیں۔ جو اس لشکر کو ساتھ لئے جا رہے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ تم نے مرید کیا ہے یا لام بندی کی ہے۔ کسی پر چڑھائی کرو گے۔ اب میں کہتا ہوں۔ کہ جس شخص کے یہاں یہ بیس پچیس آدمی جا کر مہمان ہوں گے۔ کیا اس کو گرانی نہ ہوگی۔ پیر کی دعوت اور خدمت کو تو فخر سمجھے گا۔ مگر اس لشکر کی خدمت و ضیافت ضرور اس کو گراں ہوگی۔ پھر کیا وجہ ہے۔ کہ مسلمانوں کی ان تکالیف کی پرواہ نہیں ہوتی اور ان کو جان جان کر ایذا دی جاتی ہے اور ذرا دل پر چوٹ نہیں لگتی۔ اب اگر کوئی ان باتوں پر روک ٹوک کرے تو وہ بدنام ہوتا ہے۔ کہ بڑے قانونی ہیں۔ ہر بات کے لئے ان کے یہاں قانون ہے۔ کہ یوں بولو۔ یوں اٹھو۔ یوں کھڑے ہو۔

مشائخ کا طرز تعلیم

اے صاحب! تم بزرگوں کا تذکرہ دیکھو تو معلوم ہوگا کہ مشائخ کے یہاں زمان سابق میں اسی قسم کی تعلیم تھی اور انہی باتوں پر روک ٹوک تھی۔ میرے استاد فرماتے تھے۔ کہ ایک بزرگ کا معمول تھا۔ کہ جو شخص ان کے یہاں مہمان ہوتا۔ اس کے لئے اندازے سے کچھ زائد روٹی سالن بھیجتے۔ پھر جب سالن روٹی بچ کر آتا تو دیکھتے۔ اگر تناسب سے بچا

ہوتا۔ تب تو وہ اس کو اپنے سلسلہ میں داخل فرماتے۔ ورنہ صاف کہہ دیتے۔ کہ تمہاری طبیعت میں بے ڈھنگا پن ہے۔ ہم سے تم سے نبھا نہ ہوگا۔

ایک حکایت اور سنی گئی ہے۔ کہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء دہلوی کے یہاں دو شخص مرید ہونے آئے۔ وہ آپس میں مسجد کا حوض دیکھ کر کہنے لگے۔ کہ ہماری مسجد کا حوض اس سے بہت بڑا ہے۔ سلطان جی نے یہ گفتگو سن لی۔ بلایا اور پوچھا کہ تمہارا حوض اس سے کتنا بڑا ہے۔ کہا حضرت! پیمائش تو معلوم نہیں۔ فرمایا اچھا جاؤ۔ اس حوض کی پیمائش کر کے لے جاؤ اور اس کو پیمائش کر کے آؤ۔ چنانچہ وہ گئے اور پیمائش کر کے واپس ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت! ہمارا حوض ایک بالشت بڑا ہے۔ فرمایا تم تو کہتے تھے بہت بڑا ہے۔ ایک بالشت زیادہ کو بہت بڑا نہیں کہہ سکتے۔ جاؤ ہم تم کو بیعت نہ کریں گے۔ یہ مت سمجھنا کہ حضرت سلطان جی نے ان کو محروم واپس کر دیا۔ نہیں بلکہ اتنی بڑی دولت دے کر واپس کیا۔ جو تمام عمر کام آئے گی۔

وہ کیا؟ احتیاط فی الکلام کا سبق ایسا پڑھایا۔ جو عمر بھر نہ بھولیں گے۔

محقق و غیر محقق کا فرق

یہی تو فرق ہے۔ محقق و غیر محقق میں۔ کہ محقق دھتکارتا بھی ہے۔ تو کچھ دے کر اور غیر محقق عمر بھر چمکارتا ہے۔ مگر محروم کا محروم رکھتا ہے۔ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا ہے اور ان کا واقعہ سنا ہے کہ ان کے پاس ایک بڑھیا آئی اور آ کر فقر و غیرہ کی شکایت کی۔ آپ نے خادم سے فرمایا کہ اس سے کہہ دو خدا فضل کرے۔ مرید نے یوں کہا کہ حضرت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا۔ بس یہ بزرگ اس خادم کے سر ہو گئے۔ کہ میں نے گا کب کہا تھا۔ تم نے یہ گا اپنی طرف سے کیوں لگایا۔ حضرت غور کیا جائے تو یہ بات ٹوکنے کی ضرور تھی۔ کیوں کہ اس تغیر سے کلام کے معنی بدل گئے۔ صورت اولیٰ میں دعا تھی کہ اللہ فضل کرے اور اس صورت میں پیشین گوئی ہوگی۔ کہ بے فکر رہو خدا فضل کر دے گا۔ اسی لئے ان بزرگ نے سخت تنبیہ کی۔ کہ تم نے میری بات کو کیوں بدلا۔ مجھے غیب کی کیا خبر۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ ذرا ذرا سی بات پر بگڑنا ظلم ہے۔ تو میں کہتا ہوں۔ کہ یہ ظلم نہیں بلکہ عدل ہے۔ اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ڈاکٹر وطبیب بیمار کی بد پرہیزی پر روک ٹوک کرتا ہے۔ یقیناً اس کو کوئی ظلم نہیں کہہ سکتا۔ ایسے ہی یہ بھی ظلم نہیں۔

ایک طبیب میرے دوست ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ میرے زیر علاج ایک بمبئی کا سیٹھ تھا۔ اس نے کوئی بد پرہیزی کی۔ مجھ کو معلوم ہوا تو میں نے نبض دیکھنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا۔ کہ جب تم میرے کہنے پر عمل نہیں کرتے۔ تو علاج کیسے کروں۔ اس نے خوشامد شروع کی۔ میں نے کہا کہ اب تو میں دس ہزار روپیہ لے کر نبض دیکھوں گا۔ دوسرے تیسرے دن وہ شخص دس ہزار روپے کے نوٹ لے کر آیا۔ کہ یہ تو نبض دیکھنے کے لئے فیس ہے اور علاج کی فیس اس سے الگ سے دوں گا۔ مگر ان دوست نے ہمت کی۔ کہ یہ رقم واپس کر دی اور کہہ دیا۔ کہ مجھے تو تیرا علاج ہی منظور نہیں۔ دس ہزار کا ذکر محض تعجیز کے لئے تھا۔ تحدید کے لئے نہ تھا۔ تو حضرت اطباءِ جسمانی میں جو صاحب کمال طبیب ہیں۔ وہ بھی مریض کی بدعنوانیوں پر ایسی سخت دارو گیر کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے۔ کہ اطباءِ روحانی ان کی خوشامد کریں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کو سب سے زیادہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان سے تعلق ہی محض اس واسطے ہوا ہے۔ کہ مرید ان کی اطاعت کرے۔ اور یہ اس کی اصلاح کریں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا۔ کہ حضرت کا فلاں مرید شراب پی کر فلاں جگہ بدمست پڑا ہے۔ آپ کو محسوس ہوا۔ کہ یہ اس کو حقیر اور اپنے کو افضل سمجھتا ہے۔ اس کا یہ علاج کیا۔ کہ فرمایا جاؤ اس کو اٹھا لاؤ۔ وہ جب تک وہاں رہے گا۔ سلسلہ کی بدنامی ہے۔ اس میں اس کے تکبر کی اصلاح تھی۔ کہ جس کو اس نے حقیر سمجھا تھا۔ اسی کی خدمت اس کے سپرد کی۔ جب وہ اس کو لے کر چلا۔ راستہ میں جو ملتا تھا۔ کہتا تھا۔ کہ یہ صوفیوں کا حال ہے۔ دونوں نے شراب پی ہے۔ دوسرا ابھی ہوش میں ہے۔ یہ اخفاء حالت کے لئے اس کو لے کر چلا ہے۔

تو یہ طریقہ تھا پہلے بزرگوں کا۔ وہ اس طرح مریدوں کی اصلاح کرتے تھے۔ وجہ یہ

کہ ان کو امر بالمعروف اور تبلیغ کی اہمیت کا علم تھا۔ آج کل افسوس ہے۔ کہ ہم لوگ اس فریضہ کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے۔ کہ ہمارے قلوب مخلوق کی ہیبت سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم کو تبلیغ سے رکاوٹ ہے اور ہر شخص کو تبلیغ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ خواہ ہم کو کسی ہی قدرت ہو اور دوسرا ہمارا ماتحت ہی کیوں نہ ہو۔ رہا یہ کہ امر بالمعروف اور تبلیغ کسی عذر سے بھی معاف ہو جاتی ہے یا نہیں۔ سو اس کو عمل شروع کرنے کے بعد بتلاؤں گا۔ پہلے تم عمل شروع کر دو۔ اب دعا کیجئے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب سے مخلوق کی ہیبت نکال دے اور ہم کو تبلیغ وامر بالمعروف کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین. و اٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

اشرف علی

۱۶ جمادی الاول ۱۳۴۷ھ

ضرورت تبلیغ

تبلیغ میں کامیابی پر اضطراری خوشی کا مضائقہ نہیں۔ باقی اپنی تدابیر اور مساعی کو سوچ سوچ کر خوش ہونا۔ کہ ہم نے یوں کیا۔ تو کیا اچھا اثر ہوا۔ یہ مذموم ہے۔

بہرحال ہم کو کوشش کرنی چاہیے اور نتیجہ کو خدا کے سپرد کرنا چاہیے اور ناکامی پر مغموم نہ ہونا چاہیے اور کامیابی پر اترانا نہ چاہیے۔ کام شروع کردو۔ اس کے سب راستے خودبخود کھل جائیں گے۔ بقول مولانا رومیؒ ۔

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید　　　خیرہ یوسف داری باید دوید

(از حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

☆......حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغ واشاعت اسلام کے بارے میں یہ وعظ ۲۰ رجب المرجب ۱۳۴۱ھ بروز جمعہ بعد از نماز مغرب تین گھنٹہ تک جناب دلدار خاں صاحب کے مکان اشرف منزل کرنیل گنج کانپور میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔

☆......سامعین کی تعداد تقریباً دو ہزار تھی۔

☆......جناب مولوی احمد عبدالحلیم صاحب نے قلمبند فرمایا۔

☆......مستورات کی تعداد معلوم نہ ہوسکی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دعا وخطبہ

الحمدللّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہ ونؤمن بہٖ و نتوکل علیہ ط و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ للّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہٗ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ وبارک وسلم۔

اما بعد: بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔

وَمَا هٰذِهِ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَاۤ اِلَّا لَهۡوٌ وَّلَعِبٌ ط وَ اِنَّ الدَّارَ الۡاٰخِرَةَ لَهِىَ الۡحَيَوَانُ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ. (العنکبوت آیت نمبر ۶۴)

(اور یہ دنیوی زندگی (فی نفسہ) بجز لہو ولعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالم آخرت ہے اگر ان کو علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے)

محرک بیان

ہر چند کہ یہ مضمون جو ان آیات میں مذکورہ ہے۔ کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ہر وقت میں اس کی ضرورت ہے۔ مگر اس وقت ایک خاص محرک اس کے بیان کا پایا گیا ہے۔ اس لئے اس وقت اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ وہ محرک یہ ہے۔ کہ اس وقت ایک دار (یعنی مکان) کی بناء مکمل ہوئی ہے اور اس آیت میں جو مضمون ہے۔ وہ بھی ایک دار ہی کے متعلق ہے اور اس پر تنبیہ کی اس لئے ضرورت ہوئی کہ تنبیہ ہمیشہ ایسے ہی امور پر کی جاتی ہے۔ جن کی حاجت ہوتی ہے اور حاجت کا مدار حالت پر ہوتا ہے۔ یعنی جیسی حالت ہوگی۔ ویسی ہی حاجت ہوگی اور حالت مشاہدہ سے معلوم ہوسکتی ہے۔

ترکِ مضر

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری وہ حالت کیا ہے۔ جس کی اصلاح اور علاج پر تنبیہ کی ضرورت ہے۔ سو وہ حالت یہ ہے کہ ہم کو غیر ضروری امور میں اشتغال غالب ہے اور اس حالت کا نہایت مضر ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ جب غیر ضروری امور میں اشتغال ہوگا تو لازم ہے کہ ضروری امور میں لاپروائی ہوگی۔ اور ضروری امور میں لاپروائی کا انجام بجز خسارہ کے اور کیا ہوگا۔

اس آیت میں ہم کو یہی تعلیم کی گئی ہے۔ کہ ضروری امور کی طرف رغبت کرو اور غیر ضروری امور سے زیادہ دل نہ لگاؤ۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ کی ہم پر کیا رحمت ورأفت ہے۔ کہ ان کی ہر وقت ہماری اصلاح کی طرف توجہ ہے۔ چنانچہ ان آیات میں ہماری اس مرض کا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے علاج کا ذکر کیا گیا ہے اور سبحان اللہ یہ کیسی رحمت ہے۔ کہ صرف غیر ضروری امور پر تنبیہ فرما کر محض ان سے بچنے ہی کا امر نہیں فرمادیا۔ بلکہ وہ امور بھی بتادیئے ہیں۔ جن کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کسی چیز سے بچانا ایک تو یہ ہے۔ کہ مخاطب کو اس کی ضد کی طرف متوجہ کردیا جاوے۔ اور ایک یہ ہے کہ اس فعل کی صرف برائی بیان کردی جاوے۔ مثلاً ایک طبیب کسی بدپرہیزی کرنے والے کو جو سنکھیا کھاتا ہے۔ یا افیون کھاتا ہے۔ یہ بتاوے کہ یہ اشیاء نہ کھایا کرو اور یہ نہ بتاوے کہ پھر اس کے چھوڑنے کے بعد یہ مریض کیا کھووے۔ تو یہ تعلیم ناقص ہے۔ کامل طبیب وہ ہے۔ جو سنکھیا و افیون سے ممانعت کرکے کوئی ایسے شے بتلاوے جس میں ضرر تو کچھ نہ ہو اور سنکھیا و افیون کے منافع موجود ہوں۔

چنانچہ حق تعالیٰ کی یہ رحمت نمایاں ہے۔ کہ اس بدپرہیزی کی مضرت بتانے کے ساتھ وہ ضروری چیز بھی بتلادی۔ جسے اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ مصلح کا فرض ہے۔ کہ مضر پر توجہ دلا کر اس کے نافع پر بھی تنبیہ کردے اس واسطے کہ انسان کا ذہن کبھی خالی نہیں رہا کرتا۔ وہ کوئی نہ کوئی مشغلہ اپنے واسطے ضرور تلاش کرلیتا ہے اور وہ مشغلہ نافع ہوتا ہے۔ یا مضر یا نہ نافع ہوتا ہے۔ نہ مضر۔ بلکہ عبث ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ عبث اس کو کہتے ہیں جو نہ نافع ہو نہ مضر۔ یعنی لغو اور مالایعنی تو اگر اصلاح میں صرف اسی پر اکتفا کیا جاوے کہ یہ کام نہ کرو یا نہ کھاؤ اور نافع پر

تنبیہ نہ کی جاوے۔ یعنی یہ نہ بتایا جاوے۔ کہ پھر کیا کرو اور کیا کھاؤ۔ تو اس صورت میں بھی ممکن ہے۔ کہ مخاطب اس طبعی عادت کے سبب اس مضر چیز کے ترک کے ساتھ کسی لغو میں مبتلا ہو جاوے۔ پھر اس حالت کا یہ انجام ہوگا۔ کہ پہلے تو وہ عبث و مالا یعنی میں مبتلا ہوگا اور تجربہ کی بناء پر پھر شدہ شدہ کسی مضر میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ ابتلاء بما لا یعنی کا اکثر انجام ابتلا بما یضرہ ہی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مالا یعنی شدہ شدہ امر مضر تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی واسطے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه (مجمع الزوائد للهیثمی ۸:۱۸)

(یعنی لایعنی امور کا ترک کر دینا آدمی کے حسن اسلام سے ہے) اور لایعنی کے معنی ابھی مذکور ہوئے ہیں۔ کہ عبث ولغو کو لایعنی کہتے ہیں۔ یعنی جو چیز نہ نافع ہو۔ نہ مضر۔ وہ لا یعنی ہے۔ اسی کے ترک کو حضور نے حسن اسلام فرمایا ہے اور یہ نہیں فرمایا:۔

من حسن اسلام المرء ترک ما یضرهٗ

کہ مضر کا ترک کر دینا حسن اسلام سے ہے۔ حالانکہ مضر کا ترک کر دینا یقیناً حسن اسلام ہے۔ مگر حضور نے بجائے مایضرهٗ کے مالا یعنی فرما کر یہ بتلا دیا۔ کہ جو عبث ہے۔ وہ واقع میں مضر ہی ہے۔ تو گویا ترک نافع کی دو صورتیں ہوئیں۔ ایک ارتکاب مضر اور ایک خلو عن الشغل المفید۔ اور یہ دوسری قسم اپنے مال کے اعتبار سے پہلی ہی قسم میں داخل ہو جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا۔ کہ فقط مضر کا ترک کر دینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ نافع میں مشغول ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ مشغلہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو دوسرے مشغلہ سے روک سکتا ہے۔ ورنہ بغیر مشغلہ کے مضر سے رکا رہنا ناپائیدار ہوگا۔ کیونکہ چند روز تک تو نفس صبر کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر کسی نہ کسی مشغلہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اور وہ اکثر مضر ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا مقولہ ہے۔ کہ تم نفس کو مشغول کرلو۔ قبل اس کے کہ وہ تم کو مشغول کر لے۔"

یعنی اگر تم نے نفس کو کسی کام میں نہ لگایا۔ تو وہ خود تمہارے لئے کوئی دھندا نکال لے گا۔

وہ دھندا کیا ہے۔ اولاً وساوس وخطرات۔ پھر ثانیاً معاصی ومنکرات اور نفس کی یہ ادھیڑ بن اسی وقت تک ہوتی ہے۔ جب تک وہ کچھ نہیں کرتا۔ ورنہ کام میں لگ جانے کے بعد خطرات

نہیں آتے۔ دیکھئے ایک کارڈ لکھتے وقت کیا حال ہوتا ہے۔ اس وقت تک ایک بھی خطرہ نہیں آوے گا۔ تو اس کا راز کیا ہے۔ راز یہ ہے کہ نفس کسی وقت بے کار نہیں رہنے پاتا۔ اگر اس کے لئے کوئی مشغلہ نہ تجویز کیا جاوے۔ تو وہ خود اپنے لئے کوئی شغل تجویز کر لیتا ہے۔ پس کارڈ لکھتے وقت چونکہ اپنے نفس کو ایک شغل میں لگا دیا۔ اس لئے کسی اور چیز کی طرف اس کو توجہ نہیں ہوتی اور نماز وغیرہ میں جو وساوس آتے ہیں۔ تو اکثر اس کا سبب یہی ہے کہ ہم لوگ نفس کو شغل صلوٰۃ میں نہیں لگاتے۔ ورنہ وساوس ہرگز نہ آئیں یا بہت کم آئیں۔ غرض جب یہ نفس بدوں کسی شغل کے چھوڑا جاتا ہے تو یہ خود اپنا کوئی مشغلہ تجویز کر لیتا ہے۔

شرارت نفس

اور یہ ظاہر ہے کہ نفس جو مشغلہ اپنے لئے خود تجویز کرے گا وہ شر ہی ہوگا۔ کیونکہ نفس کا اصلی میلان شر ہی کی جانب ہے۔ دلیل اس کی قرآن مجید کی آیت ہے:۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ. (اور میں اپنے نفس کو بری اور پاک نہیں بتلاتا کیونکہ نفس تو (ہر ایک کا) بری بات ہی بتلاتا ہے بجز (اس نفس) کے جس پر میرا رب رحم کرے۔ بلاشبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے)

اس میں حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے قول کی حکایت ہے۔ دیکھئے۔ انہوں نے یوں نہیں فرمایا: ان النفس لامارۃ بالسوء و امارۃ بالخیر. (بے شک نفس بری اور اچھی باتیں بتلاتا ہے)

یعنی نفس کی دو قسمیں نہیں بتائیں۔ ایک امارہ بالسوء اور ایک امارہ بالخیر۔ بلکہ یہ بتایا کہ نفس کی ایک ہی قسم ہے۔ کہ وہ امارہ بالسوء ہے یعنی نفس ہمیشہ برائی ہی کا حکم کرنے والا ہے۔ مگر جب خدا تعالیٰ رحم فرمائیں۔ یعنی جب خدا کی رحمت متوجہ ہوتی ہے تو اس وقت اس عارض قوی کی وجہ سے نفس برائی کا حکم نہیں کرتا اور جب یہ رحمت متوجہ نہیں ہوتی تو پھر بدستور اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ یعنی برائی کا امر کرنے لگتا ہے۔ بہرحال استثناء سے نفس کی کوئی

جداگانہ قسم بتلانا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ امر بالسوء کے اوقات میں سے ایک وقت کو مستثنیٰ کرنا مقصود ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ ان النفس لا مارة فی کل وقت الاما رحم ربی وما مصدریة ای وقت رحمة تعالیٰ علیھا۔ (بے شک نفس ہر وقت بتلاتا ہے مگر جس وقت میرا رب اس پر رحمت کرے)

شاید کسی کے ذہن میں یہاں پر یہ سوال پیدا ہو کہ اگر اس مضمون کو یوں تعبیر کرتے کہ ان النفس لا مارة بالخیر الا ما امر بالسوء (بے شک نفس اچھی باتیں بتلایا ہے مگر جب وہ برائی کا حکم کرے) تو کیا حرج تھا۔ جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ معنیٰ نہ پیدا ہوتے۔ جواب ہوئے۔ کیونکہ محاورہ یہ ہے کہ مغلوب حالت کو غالب حالت سے استثناء کیا کرتے ہیں۔ مثلاً اگر زیادہ جماعت نے کھانا کھالیا۔ تو یوں کہتے ہیں کہ سب لوگوں نے کھانا کھالیا۔ مگر زید و عمرو نے اس جملہ سے یہ سمجھا گیا کہ جماعت کثیر کھانا کھا چکی اور قلیل یعنی دو شخص باقی رہ گئے اور اگر اسی کو یوں تعبیر کریں۔ کہ فلاں فلاں نے کھانا نہیں کھایا مگر سب نے تو محاورہ کے اعتبار سے یہ صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ مستثنیٰ مغلوب نہ تھا۔ بلکہ مستثنیٰ منہ پر غالب تھا۔ تو معلوم ہوگیا کہ غالب حالت سے مغلوب حالت کو استثناء کیا جاتا ہے۔ اگر کھانے والے زیادہ ہیں تو انہیں مستثنیٰ منہ بنائیں گے اور اگر نہ کھانے والے زیادہ ہیں تو انہیں مستثنیٰ منہ بنائیں گے۔ بہر حال غالب حالت کا اعتبار استثناء میں ضروری ہے۔

جب یہ سمجھ میں آگیا۔ تو اب سمجھئے کہ لامارۃ بالسوء یہاں پر مستثنیٰ منہ ہے اور الا مارحم ربی مستثنیٰ ہے۔ اس لئے بقاعدہ مذکورہ غالب حالت یعنی امر بالسوء کو مستثنیٰ منہ اور مغلوب یعنی عدم امر بالسوء کو مستثنیٰ بنانا چاہیے سو قرآن میں ایسا ہی ہے کیونکہ غالب صفت نفس کی امارۃ بالسوء ہی ہے۔ واقعی قرآن کے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے۔ کہ زبان کا بھی ذوق ہو اور عادات و محاورات میں بھی کامل دخل ہو۔ محض علوم عقلیہ سے قرآن حل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ عرف و عادات کو حکم بنا کر تب قرآن کو دیکھنا چاہیے۔ ورنہ غلطی ہوجانے کا قوی احتمال بلکہ یقین ہے۔ کیونکہ قرآن کا نزول عرف و محاورات کی رعایت کے ساتھ ہوا ہے۔

بہر حال نفس کی حالت غالبہ امر بالسوء ہے۔ اس لئے جب اس کو کسی کام میں نہ لگایا

جاوے گا۔ تو یہ اپنے لئے خود مشغلہ تجویز کر لے گا اور جو مشغلہ یہ خود اپنے لئے تجویز کرے گا۔ چونکہ اس میں غلبہ ہے۔ شر کا ء اس لئے وہ اکثر برا ہی ہوگا اور مضر ہی کو تجویز کرے گا۔ اسی واسطے مالا یعنی کے ترک کو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن اسلام فرمایا۔

کیونکہ مضر کو تو ہر شخص مضر سمجھتا ہی ہے۔ خفا صرف لا یعنی میں ہے۔ پس مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ مضر کو چھوڑنے کے بعد لا یعنی سے بھی بچے اور وہ تجربہ سے موقوف ہے۔ اس پر کہ ما یعنی میں نفس کو لگادے۔ پس اس ترک کے لئے یہ فعل بھی لازم ہے۔ بہرحال نفس کا میلان الی الشر تو قرآن سے ثابت ہے اور یہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ نفس جب خالی ہوگا۔ تو معصیت ہی تجویز کرے گا اور جب یہ بے کار ہوگا۔ تو کسی نہ کسی بلا ہی میں مبتلا ہوگا۔ تو ان دونوں مقدموں سے اس کی ضرورت ثابت ہوگئی۔ کہ ترک مضر کے بعد اشتغال بالنافع ضروری ہے۔ سو قرآن مجید کی تعلیم کا یہی حاصل ہے۔

اشتغال بالنافع

اب سوال یہ رہ گیا کہ نفس کو کسی خیر میں ہر وقت کیسے مشغول رکھا جا سکتا ہے۔ جو وہ اس بلا لا یعنی یا مضر سے بچے اور وہ کون سا دھندا ہے۔ جس میں ہر وقت لگایا جا سکے۔ کیونکہ جتنے دھندے ہیں۔ ان میں ہر کام موقت ہے۔ مثلاً کھانا، پینا، سونا اور نماز اور دوسری عبادات سب موقت ہی ہیں، جو کام بھی ہے۔ وہ خاص وقت میں ہے۔ تمام اوقات کو کوئی شغل محیط نہیں اور نفس کو بچانے کے لئے ضرورت ہے۔ شغل غیر موقت کی۔ جو ہر دم ہو سکے۔ کیوں کہ اس کا خاصہ یہ ہے۔ کہ جہاں ذرا بھی خالی ہوا اور بے ہودگی میں مبتلا ہوا۔ تو وہ کام کون سا ہے۔ جو ہر وقت کیا جا سکے۔؟

صاحب! شریعت میں ایسا شغل بھی ہے اور وہ بہت ہی سہل کام ہے اور بحمد اللہ قرآن میں اسے بھی بتلا دیا گیا ہے۔ وہ کیا ہے۔ وہ ذکر ہے سو نماز، روزہ، حج سب کو تو موقت بتلایا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں تو توقیت صلوٰۃ کی تصریح ہے۔ خمس صلوٰت اور قرآن میں گو تصریح نہیں، مگر اشارہ ہے اور روزہ کو تو قرآن ہی میں موقت کر دیا گیا ہے۔ ایا ما معدودات (گنتی

کے چند دن) اور اسی طرح حج میں بھی اشھر معلومات (مقررہ مشہور مہینے) فرمایا گیا ہے۔
مگر ذکر کو کہیں موقت نہیں کیا گیا۔ نہ قرآن میں نہ حدیث میں۔ بلکہ ارشاد ہے۔

اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو)

اور ارشاد ہے۔ واذ کر اسم ربک۔ اگر کوئی کہے کہ ذکر بھی تو موقت ہے۔ دیکھئے
قرآن مجید میں اس کا بھی وقت بتایا گیا ہے۔ چنانچہ اذ کر وا اللہ کے بعد ارشاد ہے:۔

سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلاً۔

یعنی صبح و شام تسبیح کرو۔

جواب یہ ہے۔ کہ یہ اعتراض بھی محاورہ نہ جاننے ہی سے پیدا ہوا۔ محاورہ یہ ہے۔ کہ
جب ایک جنس کی دونوعوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ تو مراد اس سے احاطہ و استیعاب اس جنس کا ہوتا
ہے۔ مثلاً یہ کہیں کہ میں نے تلخ و شیریں چکھا ہے اور ابتداء و انتہاء دیکھی ہے اور چھوٹا بڑا مجھے
جانتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو اس سے بالبداہتہ استیعاب ہی مراد ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں
صبح و شام سے بھی یہی مراد ہے۔ کہ رات دن برابر ذکر کرو۔ یعنی کوئی وقت بھی ذکر سے خالی
نہ ہو۔ تو بکرۃ و اصیلا کے معنی فی کل وقت ہوئے۔

اقسام ذکر

اب یہ بات رہ گئی۔ کہ ہر وقت کیسے ذکر ہو۔ تو ہر وقت ذکر ہونے کی صورت یہ ہے۔ کہ محل ذکر
میں تعمیم لی جاوے۔ یعنی خواہ قلب سے ہو خواہ زبان سے ہو۔ سو تعمیم محل کے بعد دوام ممکن ہو گیا۔
اور پھر اگر کوئی کہے۔ کہ قلب سے ذکر کے کیا معنی اور کیا اس کا شریعت میں کچھ ثبوت ہے۔ تو
میں کہتا ہوں۔ کہ حدیث نے اس اشکال کو بھی صاف کر دیا ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ:۔

کان صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ فی کل احیانہ (الصحیح للبخاری ۱:۸۳)

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے اور کل احیان میں
اوقات بول و براز و قضائے حاجات بھی شامل ہیں اور ظاہر ہے۔ کہ بول و براز کے موقع پر
زبان سے ذکر و تلاوت مکروہ ہے۔ بس کل احیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

ایسے احوال اور ایسے مواقع میں قلب سے ذکر کیا کرتے تھے۔

دوسرے یہ اذکروا اللہ (اللہ کا ذکر کرو) میں واذکر اسم ربک (اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کر) میں حق تعالیٰ نے ذکر کو کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا ہے۔ خواہ لسان ہو یا اور کچھ ۔ نیز ذکر باعتبار لغت کے عام بھی ہے۔ ذکر قلبی و ذکر لسانی دونوں کو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ذکر کے اصل معنی ذکر قلبی ہی کے ہیں اور جہاں کہیں ذکر لسانی مراد ہے۔ وہاں قرائن سے اس پر محمول کیا گیا ہے۔ کیونکہ ذکر کے معنی ہیں یاد۔ اب دیکھ لیجئے کہ یاد کس کا فعل ہے زبان کا یا قلب کا؟ پس اگر ذکر قلبی کے لئے تو ثبوت کی ضرورت نہ رہی۔ البتہ ذکر کا لسانی ہونا محتاج دلیل ہو گیا۔

اور میں نے یہ مضمون خصوصیت سے اس لئے بیان کر دیا کہ بعض شکی لوگوں کو ذکر قلبی میں کلام ہے۔ بہر حال یہ ہے وہ کام جو ہر وقت کے کرنے کا ہے۔ اگر زبان تھک جائے۔ تو قلب سے ذکر کرو اور اگر زبان سے بھی برکت حاصل کرنا ہو تو زبان سے بھی کرو۔ بس ان کی یاد ہونی چاہیے۔ پھر خواہ الفاظ کے واسطہ سے ہو۔ خواہ مذکور کے تصور سے۔ مقصود تو یہ ہے۔ کہ غفلت نہ ہو۔ جو طریق تمہیں سہل معلوم ہو اس طریق سے کرو۔

اور ذکر کے متعلق بعض اہل علم کو ایک اور شبہ ہو گیا ہے وہ یہ کہ انہوں نے واذکر اسم ربک (اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر) میں لفظ اسم کو زائد کہا ہے۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کو زائد ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کی سہل توجیہ یہ ہے کہ ذاکر دو قسم کے ہیں۔ ایک مبتدی اور ایک منتہی۔ تو اسم ربک میں مبتدی کی حالت کا اعتبار کیا گیا ہے۔ کیونکہ مبتدی کی اور حالت ہے اور منتہی کی اور۔ اس لئے یوں کیوں نہ کہا جاوے۔ کہ مبتدی کے لئے واذکر اسم ربک ہے اور منتہی کے لئے وتبتل الیہ تبتیلا ہے۔ کیونکہ مبتدی کے لئے یہی ذکر کا درجہ بہت ہے۔ کہ محبوب کا نام اسکی زبان پر آ جائے یا قلب میں یہ نام آ جائے۔ ذکر لفظی کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک ذکر لفظی زبان سے۔ ایک قلب سے۔ ایک ذکر منطوق ہے اور ایک ذکر متصور۔ منطوق تو ظاہر ہے۔ متصور مثال سے سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص الحمد للہ رب العلمین کے معنی نہ جانتا ہو اور وہ اس کے ایک ایک لفظ کا

دل میں خیال کرے اور زبان سے نہ ادا کرے۔ تو یہ محض الفاظ کا تصور ہوگا اور معنی سے اسے کچھ بھی علاقہ نہ ہوگا۔ کیوں کہ وہ معنی ہی نہیں جانتا۔ اس درجہ کو حدیث النفس اور کلام قلب کہتے ہیں۔ شاعر اسی کو کہتا ہے۔ ؎

ان الکلام لفی الفؤادو انما جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا

(بے شک کلام انسان کے دل میں ہوتا ہے اور یہ زبان دل کی دلیل ہے)

سو الفاظ متخیلہ کا درجہ بھی کلام لفظی ہی کا درجہ ہے۔ کیوں کہ ان میں ترکیب و تعاقب سب کچھ ہوتا ہے۔ بہر حال ذکر ہونا چاہیے۔ اب ذکر کی اقسام چند ہو گئیں۔ ایک لسانی، ایک قلبی اور ذکر قلبی کی خود دو قسمیں ہیں۔ ایک ذکر قلبی لفظی، ایک ذکر قلبی نفسی۔ اور ان اقسام میں سے ذکر لسانی بھی غیر موقت نہیں۔ بلکہ بعض احوال کے لحاظ سے وہ بھی موقت ہے کیونکہ نیند کے غلبہ میں اور بول براز و جماع و مواقع قاذورات میں زبان سے ذکر کرنے کی ممانعت ہے۔ البتہ ذکر قلبی کی کسی حال میں بھی ممانعت نہیں ہر وقت اجازت ہے۔ یہ بے شک محیط کل اور ہر جہت سے غیر موقت ہے۔

پس ذکر قلبی ہی اپنی دونوں قسموں کے ساتھ ایک ایسا مشغلہ ہے جو ہر وقت ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ سونے کے وقت بھی ہو سکتا ہے۔ گو سونے کے بعد نہ ہو۔ سو اس حالت میں انسان مکلّف ہی نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ کھانے کے وقت بھی ہو سکتا ہے بلکہ بعض وقت یہ ذکر لسانی سے بڑھا ہوا ہے۔ مثلاً جہاں ریاء کا شبہ ہو یا ایک شخص ہے کہ زبان سے تو ذکر کرتا ہے۔ مگر قلب متوجہ نہیں ہوتا۔ تو اس کے لئے یہ بہتر ہے۔ کہ قلب سے ذکر کرے اور زبان سے نہ کرے تو ایسے شخص کے اعتبار سے محض ذکر قلبی ہی افضل ہے۔ مگر مہربانی کر کے اس مسئلہ کو نماز کی قراءت میں متعدی نہ کر لیجئے۔ کیونکہ نماز کی قراءت و تکبیرات و تسبیح و تشہد وغیرہ اگر کوئی شخص قلب میں پڑھ لے اور زبان اسے ادا نہ کرے۔ تو نماز نہ ہوگی۔ ہاں گونگا البتہ معذور ہے۔ اس کی نماز محض تصور ہی سے ہو جاوے گی۔

تین چار سال کی بات ہے۔ کہ ایک بزرگ (صورۃ بزرگ نہ معنیً) قنوج میں تشریف

لائے تھے۔ بے چارے نرے جاہل جو لوگ ان کے مرید ہونے آتے۔ اول تعلیم ان کو یہ ہوتی تھی کہ نماز میں قراءت دل ہی دل میں پڑھا کرو اور یہ بھی ہدایت کردیتے تھے۔ کہ یہ بات کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ چنانچہ بہت سے لوگ ان کے بہکانے میں آگئے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ اس سے تو وہ نماز نہ پڑھتے تو بہتر ہوتا۔ کیونکہ اپنے کو بے نماز سمجھتے اور شاید کبھی قضا کرلیتے اور اب تو بے چاروں نے محنت بھی کی اور پھر نماز نہ ہوئی اور نہ قضا کی طرف التفات۔ بڑی مدت کے بعد کسی ترکیب سے بعضے لوگوں کو اس کا پتہ لگا تو ان کی غلطی پر عام لوگوں کو متنبہ کیا گیا اور ان کو وہاں سے نکالا گیا۔ اسی لئے طریق باطن میں بہت ضرورت ہے شریعت کی۔ ورنہ ممکن ہے کسی کو کوئی یہ رائے دیدے۔ کہ جب ذکر قلبی افضل ہے۔ ذکر لسانی سے تو پھر نماز کو بھی دل میں کیوں پڑھ لیا کریں۔ یاد رکھو اس طرح سے نماز نہ ہوگی۔

غرض ذکر قلبی کی فضیلت سے وہ مواقع مستثنٰی ہیں۔ جہاں احکام دینیہ مثلاً نماز وغیرہ یا احکام دنیویہ۔ مثلاً طلاق نکاح عتاق وغیرہ کا تعلق ہے کہ یہ امور ذکر قلب سے صحیح نہیں ہوسکے۔ مثلاً دل ہی دل میں نکاح کرلے تو نکاح نہیں ہوگا۔ ایسے ہی دل ہی دل میں طلاق دے۔ تو طلاق بھی نہ پڑے گی اور مراد اس سے وہ صورت نہیں۔ کہ چپکے چپکے زبان پر طلاق آگیا اور اس سے زبان کو حرکت بھی ہوئی۔ تو مگر کسی نے نہ سنا ہو۔ اس صورت میں تو طلاق پڑ جاوے گی۔ کیونکہ یہ تو تلفظ باللسان ہی ہے۔ گو بالجہر نہ سہی۔ باقی اگر فقط دل میں طلاق کو سوچ لیا۔ زبان بالکل نہیں ہلی تو اس سے طلاق نہیں پڑے گی۔ کیونکہ یہ عقود تکلم باللسان کے ساتھ متعلق ہیں۔ پس اس کی استثناء کے بعد جو اور امور رہ گئے ہیں جن میں تکلم شرط نہیں ہے۔ ان کے متعلق یہ قاعدہ عام ہے کہ وہاں ذکر قلب بھی معتبر ہے۔ بلکہ بعض کے لئے اور بعض جہات سے یہ افضل ہے۔

افضل الاذکار

اور سب سے افضل یہ ہے۔ کہ ذکر قلب اور ذکر لسانی دونوں کو جمع کیا جائے۔ اس اعتبار سے ذکر کے تین درجے ہوئے۔ ایک تو وہ جس میں صرف زبان کو حرکت دی جائے اور قلب متوجہ نہ ہو۔ یہ درجہ سب سے کم ہے۔ دوسرا درجہ وہ جس میں زبان کو حرکت نہ دی جائے

صرف قلب سے ذکر کیا جائے۔ یہ پہلے درجہ سے بڑھ کر ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ زبان کو بھی حرکت دی جائے اور قلب کو بھی متوجہ کیا جائے۔ یہ سب سے بڑھ کر اور افضل ہے۔

لیکن میں یہ پھر کہتا ہوں۔ کہ بعض حالتوں میں دوسرا درجہ تیسرے درجہ سے بھی افضل ہوجاتا ہے۔ یعنی کسی وقت وہ ذکر جو محض قلب سے ہو۔ افضل ہوتا ہے۔ اس ذکر سے جو قلب وزبان دونوں سے ہو وہ کیسے؟۔

وہ اس طرح جیسے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے۔ جن کے ہم غلام ہیں اور جن کے ارشاد ہی سے سیدھا راستہ نظر آتا ہے۔ سو یہ مسئلہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا ہے۔ جیسا کہ عنقریب آتا ہے۔

اور مسئلہ بتلانے کے ساتھ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اسکی حکمت بھی بتا دی ہے۔ گو حکمت یا علت بتانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی نہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب صرف حکم کا بتلانا ہے۔ مگر آپ کا تبرع واحسان ہے۔ کہ کہیں کہیں حکمت بھی نمونہ کے طور پر بتا دیتے ہیں۔ جیسے کوئی آقا اپنے نوکر کو کوئی کام بتا دے اور نوکر کا تحیر دیکھ کر اس تجویز کی حکمت بھی بتا دے۔ تو گویہ آقا کا فرض نہ تھا کہ وہ حکمتیں بتا دے۔ کیونکہ نوکر کو حکمت سے کیا واسطہ۔ اس کے ذمہ تو تعمیل حکم ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر وہ نوکر کس بات کا ہے۔ مگر یہ اس کا تبرع واحسان ہے۔ کہ کسی کام کی اسے حکمت بھی بتا دے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ بھی بیان حکمت لازم نہیں۔ اسی لئے جہاں کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت بتائی ہے۔ وہ بطور نمونہ کے ہے۔ جس سے مقصود یہ بتلانا ہے۔ کہ ہمارے احکام میں حکمتیں ضرور ہیں۔ چنانچہ دیکھو بعض حکمتیں نمونہ کے طور پر تم کو بتا دی گئی ہیں۔ مگر سب حکمتیں تم کو نہیں بتلائی گئیں۔ پس جہاں کوئی حکمت حکم شرعی میں تمہیں نہیں معلوم ہوئی۔ وہاں بھی سمجھ لو کہ حکمت ضرور ہے۔ چنانچہ جن احکام کی حکمتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتلائیں۔ ان کو اہل اللہ نے بڑی مقدار تک حل کر دیا ہے۔ غرض احکام کا دارومدار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر ہے۔ چاہے حکمت معلوم ہو یا نہ ہو۔

بہرحال سرسری نظر میں یہ ایک نیا دعویٰ ہے۔ کہ ذکر قلب بعض اوقات مطلوبیت و

افضیلت میں مجموعہ ذکر لسانی وقلبی سے بھی بڑھ کر ہے۔مگر اس کا مدلول نص ہونا ابھی ظاہر ہوا جاتا ہے۔سنیئے! حدیث شریف میں ہے:۔

اذا اغلب احدکم النعاس و هو یذکر اللّٰہ فلیرتد او کما قال(لم أجد الحدیث فی " موسوعة أطراف الحدیث النبوی الشریف)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔کہ جس وقت تک نیند نہ آوے اس وقت تک تو نفلیں، تسبیح اور ذکر وغیرہ سب کچھ کرو اور جب نیند کا غلبہ ہونے لگے تو سو رہو فلیرتد امر کا صیغہ ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔اس سے معلوم ہوا۔کہ اس حالت میں ذکر لسانی بند کر دینا ضروری ہے۔آگے اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں:۔

لعله یستغفر فیسب نفسه.

یعنی ممکن ہے۔کہ قصد تو استغفار کا کرے اور بجائے استغفار کے اپنے آپ کو کوسنے لگے۔کیونکہ اس وقت مارے نیند کے ہوش درست نہیں رہتا۔لامحالہ کہے گا کچھ اور نکلے گا کچھ۔تو شاید دعا کے بدلے بددعا نکلے۔

چنانچہ علماء نے اس کی تفسیر میں مثال کے طور پر کہا بھی ہے۔کہ مثلاً وہ کہنا چاہتا ہے۔ **اللّٰھم اغفر لی**۔کہ اے اللہ! مجھے بخش دیجئے۔تو ممکن ہے کہ بجائے اس کے **اللّٰھم اعفر لی** عین مہملہ سے زبان سے نکلے۔یعنی اے اللہ! مجھے تباہ کر دیجئے، برباد کر دیجئے۔مٹی میں ملا دیجئے۔صرف ایک نقطہ کے گھٹنے بڑھنے سے معنی کس قدر بدل گئے۔تو یہ حدیث نص ہے کہ جب نیند کا غلبہ ہو۔تو زبان سے ذکر نہ کرے۔پس اس وقت زبان سے ذکر ممنوع ہے۔

اور اس سے پہلے یہ نص گزر چکی ہے۔

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یذکر اللّٰہ فی کل احیانه(الصحیح للبخاری ۱:۸۳)

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ذکر کرتے تھے اور ہر وقت میں نیند کا وقت بھی داخل ہے اور ظاہر ہے۔کہ نیند کی حالت میں اس سنت پر ذکر لسانی کے طریق پر عمل نہیں ہوسکتا ہے۔اس لئے دونوں روایتوں کو یوں جمع کریں گے۔کہ غلبۂ نیند کے وقت ذکر لسانی کی تو

ممانعت ہے۔ خواہ محض ہو یا قلبی کے ساتھ اور ذکر قلبی کی اجازت ہے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ بعض وقت ذکر قلبی محض افضل ہے۔ جمع بین ذکر اللسان والقلب سے۔ کیونکہ جب ذکر لسانی سے ممانعت ہوگئی۔ تو اب یا تو بالکل ہی ذکر سے محروم رہو یا محض دل دل سے یاد کرتے رہو۔ ظاہر ہے کہ دوسری صورت یقیناً بہتر ہے۔ کیونکہ صورت اولیٰ میں پوری محرومی ہے ذکر سے اور اس صورت میں کچھ تو ذکر ہوتا رہے گا اور قطعی محرومی سے یقیناً وہ صورت بہتر ہے۔ جس میں فی الجملہ ذکر باقی ہے اور ایسے میں یہ بقاء ذکر قلبی محض سے ممکن ہے۔ اب اس ذکر کو ذکر نہ کہنا حرمان عن البرکتہ کا مشورہ دینا ہے۔

تو بہر حال جہاں ذکر لسانی نہ ہو سکے۔ وہاں ذکر قلبی جاری رکھے۔ یعنی تصور رکھے، توجہ رکھے اور یاد رکھے۔ دھیان رکھے۔ پس ذکر ہر حالت میں مطلوب ہے۔ تو جس حالت میں جو بھی ممکن ہو کرتا رہے۔ اب وہ شبہ جاتا رہا۔ کہ وہ کون سا کام ہے۔ جس سے وساوس بند ہو جاویں اور نفس ہر دم کسی شغل میں لگا رہے۔ کیوں کہ نفس کو بے کار چھوڑیں گے۔ تو یہ خود اپنے لئے کوئی مضر مشغلہ تجویز کرلے گا۔ اب معلوم ہوگیا۔ کہ وہ کام ذکر قلب ہے۔ جو ہر وقت ممکن ہے۔ بس نفس کو اس شغل میں لگا دو۔ تو پھر وہ کوئی مضر شغل خود تجویز نہ کرلے گا۔ نہ غفلت میں مبتلا ہوگا۔

شغل قلب

اور علاوہ مشاہدہ کے حدیث شریف میں اس کی تصریح بھی ہے۔

الشیطان جاثم علیٰ قلب ابن ادم فاذکر اللّٰہ خنس و اذا غفل وسوس (مشکوٰۃ المصابیح: ۲۲۸۱)

یعنی ابن آدم کے قلب پر شیطان چڑھا ہوا بیٹھا ہے۔ جب وہ ذکر اللہ کرتا ہے۔ اس وقت تو ہٹ جاتا ہے اور جب خالی رہتا ہے تو وسوسے ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا۔ کہ اگر نفس کو مشغول نہ کرو گے۔ تو یہ خود مشغلہ تجویز کرلے گا۔

اگر کوئی یہ شبہ کرے۔ کہ نماز کا تو کوئی رکن بھی ذکر سے خالی نہیں۔ قراءت، تسبیح، تکبیر، تشہد غرض سب ذکر ہی ذکر ہے۔ مگر باوجود اس کثرت کے ساتھ اس کے مشتمل علی الذکر

ہونے کے سبب سے زیادہ وسوسے نماز ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔ تو ہم یہ کیسے مان لیں۔ کہ جب کسی کام میں مشغول ہوں تو وسوسہ نہیں آتا۔ اس مادہ جزئیہ سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ قاعدہ صحیح نہیں۔ کہ جب نفس کو کسی کام میں مشغول نہ کرو گے۔ تب ہی وہ کسی کام میں لگ جائے گا۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کمبخت تو کام کے اندر بھی اپنا کام چلاتا رہتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ذکر کہتے ہیں یاد کو۔ خواہ وہ تنہا قلب سے ہو، خواہ زبان بھی اس میں شریک ہو۔ مگر محض زبان سے نہ ہو۔ اگر محض زبان سے یاد ہے۔ تو وہ واقع میں ذکر نہیں۔ بلکہ وہ تو صورت ذکر ہے۔ اب شبہ جاتا رہا۔ کیونکہ دیکھ لیجئے کہ جہاں اور جس شخص کو وساوس آتے ہیں۔ وہاں واقع میں ذکر کا وجود نہیں۔ بلکہ محض ذکر کی صورت ہی صورت ہوتی ہے۔ قلب اس کی طرف مشغول نہیں ہوتا۔ چنانچہ جس نماز میں وساوس آتے ہیں۔ اس میں قلب نماز میں پورا مشغول نہیں ہوتا۔ ورنہ النفس لا توجه الٰی شیئین فی ان واحد کے قاعدہ سے پوری مشغولی کے ساتھ وساوس آ نہیں سکتے۔

اب اس پر ایک اور شبہ رہا۔ وہ یہ کہ جب قلب متوجہ نہیں ہوتا۔ پھر ادا کیسے ہوتا ہے۔ کیونکہ فعل اختیاری تو بدوں ارادۂ قلب کے ہو ہی نہیں سکتا اور ارادہ کے لئے توجہ لازم ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ کلیہ صحیح ہے۔ مگر اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب بالکل توجہ نہ ہو تو فعل نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ شروع توجہ سے کیا ہو۔ مگر استمرار میں توجہ نہ رہی ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھیئے کہ جیسے دو آدمی ساتھ ساتھ چلیں اور باتیں کرتے ہوئے راستہ طے کریں۔ تو باتیں کرتے وقت توجہ فقط باتوں کی طرف رہے گی۔ چلنے کی طرف نہ رہے گی۔ مگر مشی پھر بھی واقع ہوتی ہے۔ جیسے گھڑی کی کوک کہ ابتداء میں حرکت چابی کو دینی پڑتی ہے۔ پھر اس کی رفتار کے استمرار و بقا کے لئے کوکنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح مشی ممتد کے ساتھ قصد متجدد کی ضرورت نہیں۔ وہی پہلا قصد کافی ہے اور وہی ساری مشی میں مؤثر ہے۔ یا جیسے ہارمونیم باجہ کہ جب ایک دفعہ کوئی اسے بجانے بیٹھ گیا۔ تو ہر قرعہ پر جدید قصد کی حاجت نہیں۔ بلکہ ابتداء پڑتا ہے۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے۔ اب وہ ارادہ تو کیا کرتا۔ اسے بعض دفعہ ایسی محویت ہوتی ہے۔ کہ ہاتھ چلنے کی بھی خبر نہیں ہوتی اور جیسے قاری ہے۔ کہ قراءت میں اگر ہر

ہر لفظ پر نیا قصد کرے۔ تو اس کا لہجہ بے تکلف اور بے ساختہ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ بارہا تجربہ ہوا ہوگا۔ کہ جب کسی نے بنا کر پڑھا۔ وہیں اس کا لہجہ بگڑ گیا۔ بلکہ بے ساختہ اور بے ارادہ پڑھنے سے نہایت اچھا پڑھا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی فعل اختیاری کی جب عادت اور مشق ہو جائے۔ تو پھر ابتداء کے لئے تو قصد کی ضرورت ہوتی ہے۔ استمرار کے لئے قصد متجدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ تمام مثالوں سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ فعل اختیاری کے صدور کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر ہر آن میں اس پر توجہ ہو۔ بس ابتداء کے لئے توجہ ضروری ہے۔ بس اب نماز اور وساوس کے جمع ہونے میں کوئی اشکال نہیں رہا۔ کیونکہ ابتدائی توجہ سے نماز شروع ہوگئی اور وہ ہو رہی ہے اور درمیان میں وساوس کی طرف توجہ مبذول ہوگئی۔

اس لئے وساوس بھی آرہے ہیں۔ کیونکہ توجہ نماز کے ہر جزو کے ساتھ متعلق نہیں ہے۔ وہاں تو تکبیر تحریمہ سے السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک کسی توجہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاتھ پاؤں اس کام کے لئے اس قدر منجھے ہوئے ہیں۔ کہ جب موقع رکوع کا آتا ہے۔ خود رکوع کر لیتے ہیں اور جب سجدہ کا وقت ہوتا ہے۔ خود ہی سجدہ کر لیتے ہیں۔ پس یہ شبہ حل ہو گیا۔ کہ نماز جس میں سب سے زیادہ ذکر ہے۔ یہ کیوں مانع نہیں ہوئی ہے۔ وساوس کو۔

حاصل جواب کا یہ ہوا۔ کہ یہ مانع کیسے ہو۔ وہاں تو یاد اور توجہ ہی نہیں۔ ورنہ یہ ممکن نہیں کہ توجہ کامل ہو اور پھر وساوس آویں۔ جب چاہو آزمالو۔ صاحب! تم ذرا ایک خط لکھنے بیٹھو۔ پھر دیکھو کیسے وساوس آتے ہیں؟ میں نے بعض دفعہ ایسا کیا ہے۔ کہ قرآن پڑھنے بیٹھا ہوں اور یہ چاہا کہ پڑھنے میں خط بھی لکھ لوں۔ تو نہیں ہوسکا۔ شاید الحمد اور قل ہو اللہ کی دوسری بات ہو۔ کیونکہ وہ تو خوب یاد ہے۔ وہاں شاید توجہ کی ضرورت نہ ہو باقی اور جگہ یا تو پڑھنے میں اٹکے گا۔ یا لکھنے میں بھٹکے گا۔ اب تمام شبہات دور ہو کر وہ دعویٰ اچھی طرح ثابت ہو گیا۔ کہ نفس بے شغل بھی نہیں رہ سکتا۔ اور دو شغل میں بھی نہیں لگ سکتا۔ اس لئے فقط مضر سے بچنا کافی نہیں ہے۔ بلکہ نافع میں مشغول ہونے کی ضرورت ہے۔

غیر ضروری کے ترک کی دو صورتیں

حق تعالیٰ نے ان دو جملوں میں یہی رعایت کی ہے۔ کہ پہلے تو یہ مرض بیان فرمایا۔ کہ

انسان غیر ضروری امور میں مشغول ہے اور غیر ضروری امور کی سب سے بڑی فرد یہ ہے کہ دنیا میں اس کو انہماک ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس کی مذمت بیان فرمادی اور اس کے بعد امر ضروری یعنی آخرۃ کا ذکر کر دیا۔ کہ ذکر آخرت میں مشغول ہونا چاہیے۔ تا کہ اس انہماک کا ازالہ ہو۔ سو غیر ضروری کے ترک کرانے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اسکی مذمت کر دی جاوے اور اس سے ہٹایا جاوے۔ مگر ابھی معلوم ہو چکا ہے۔ کہ اس سے نفع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مشغلہ ضروری بتانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ یہ شخص اس غیر ضروری کو چھوڑ کے دوسرے غیر ضروری میں مبتلا ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر ضروری سے ہٹایا جاوے اور ضروری کی طرف متوجہ کیا جاوے۔ یہی دوسرا طریقہ جو اسلم واحسن ہے۔ یہاں اختیار کیا گیا ہے۔

مذمت دنیا

چنانچہ ارشاد ہے:

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ.

کہ نہیں ہے۔ حیٰوۃ دنیا۔ مگر لہو ولعب۔ یعنی فضول و بیکار ہے۔

دیکھئے! صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ کہ حیات دنیا کی مذمت کر دیں۔ آگے فرماتے ہیں:۔

وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ

اور بے شک دار آخرت ہی حیات ہے۔ یعنی زندگی تو واقع میں آخرت ہی کی زندگی ہے۔ دنیا کی کیا زندگی۔ یہ تو اس کے سامنے بالکل ہیچ ہے۔ تو مذمت دنیا کے بعد آخرت کی طرف متوجہ کیا گیا۔ اس اسلوب ہی سے سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ کہ یہ مرض ایسا ہے۔ جس کا مریض دائم المرض ہے۔ جس کو آج کل کے جاہلانہ محاورہ میں دائم المریض کہتے ہیں۔

آج کل یہ بھی فیشن ہو گیا ہے۔ کہ جس لفظ پر دیکھو الف لام داخل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قریب المرگ ایک مولوی صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ اب تک تو الف لام چار ہی قسم کا تھا۔ یعنی استغراقی۔ جنسی۔ عہد ذہنی، عہد خارجی۔ مگر آج کل ایک پانچویں قسم الف لام نیچریت کی ایجاد ہوئی ہے۔ یعنی نئے فیشن کے لوگ کتاب کا نام بھی رکھیں گے۔ تو الف لام ضرور داخل کریں گے۔ مثلاً المامون۔ الفاروق۔ اگر فقط مامون و فاروق نام رکھ دیتے تو کیا

حرج تھا۔ ایسے ہی الجزائر، الجبراء۔ غرض ہر چیز میں الف لام۔ ایسے ہی قریب المرگ۔ دائم المریض کا الف لام کہ اس کے کوئی معنی ہی نہیں اور الف لام سے قطع نظر کر کے دائم المریض کی تو ترکیب ہی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمیشہ کے بیمار کو دائم المرض کہہ سکتے ہیں۔ نہ کہ دائم المریض اگر مریض ہی کا لفظ لانا ضروری تھا۔ تو دائمی مریض کہہ لیتے۔ البتہ دائم المریض کے معنی تو یہ ہو سکتے ہیں۔ کہ جس کے پاس ہمیشہ مریض رہیں۔ جس طرح دائم المرض کے معنی یہ ہیں۔ کہ جس کو ہمیشہ مرض رہے۔ پس اس معنی کو دائم المریض حکیم یا ڈاکٹر کو کہہ سکتے ہیں۔ نہ کہ مریض کو۔ بہر حال جو دائم المرض ہوگا اس کو دوا بھی دائمی ہی دی جائے گی۔

ضرورت شیخ

تو جب یہ مرض حب دنیا ہمیشہ کا ہے۔ تو ہمیشہ اس کی دوا استعمال کرتے رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ اگر اتفاق سے بزرگ بھی ہو جاویں۔ تو اس وقت بھی اس مرض سے اور اس کے علاج سے بے فکر نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اپنے نزدیک بزرگ بن جانے سے واقع میں بزرگ نہیں ہو سکتا۔ مگر اب تو یہ حالت ہے۔ کہ جہاں ذرا بھی کوئی درجہ مقصود کا حاصل ہو گیا۔ مثلاً معصیت سے نفرت ہو گئی۔ یا نفل میں بھی دل لگنے لگا یا وساوس و خطرات بند ہو گئے۔ تو بس گمان ہو گیا۔ کہ اب میں کامل ہو گیا ہوں۔ پھر کیا تھا۔ سب مجاہدے اور ریاضات چھوڑ بیٹھا۔ اسی لئے ضرورت ہے ہر وقت شیخ کی۔

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا عیسیٰ نتواں گشت بہ تصدیق خرے چند

(اپنا موتی کسی صاحب نظر کو دکھلا دو کیونکہ چند گدھوں کی تصدیق سے تم عیسیٰ نہیں ہو سکتے) یعنی کسی کامل سے تشخیص کراؤ کہ یہ حالت کمال کی ہے یا نہیں۔ ورنہ وہ حالت ہوگی جیسے دق والے کو اگر ایک دن بخار نہیں آیا تو وہ یہ سمجھے کہ میں اچھا ہو گیا اور علاج چھوڑ بیٹھے۔ یاد رکھو مرض کا نکس (یعنی لوٹنا) بداء سے (یعنی شروع ہونے سے) بھی اشد ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری بے احتیاطی سے مرض پھر لوٹے اور علاج مشکل ہو جائے تو جس طرح بعض مریض ظاہری ذرا بخار نہ آنے کو صحت سمجھ لیتا ہے۔ اسی طرح بعض اہل طریق بھی جہاں

تھوڑی سی سنسناہٹ بدن میں پیدا ہوئی اور سمجھ گئے۔ کہ بس ہم کامل ہو گئے۔ پھر تسبیح بھی چھوٹ گئی اور مجاہدہ بھی گیا اور یہ گمان ہو گیا۔ کہ بس اب تو ہم منتہی ہو گئے۔ ہمیں اب کسی ریاضت کی حاجت نہیں رہی اور ہم اس کے مصداق ہو گئے۔

خلوت و چلہ بروا لازم نماند (خلوت اور چلہ ضروری نہیں)

حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اجی تم تو جیسے تھے۔ ویسے ہی ہو گئی۔ بلکہ اس سے بھی بدتر ہو گئے۔ کیونکہ جیسے ابتدائے مرض سے عود مرض سخت ہوتا ہے۔ اسی طرح تمہاری یہ حالت اشد ہے پہلی مجوبی کی حالت سے۔ جس پر یہ حالت پیش آئے۔ وہ خود غور کر کے دیکھ لے کہ اس وقت بہ نسبت پہلے کے طبیعت کی کیا کیفیت ہے۔ حالت یہ ہوتی ہے کہ طاعت سے دل گھبرانے لگتا ہے۔ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے وحشت سی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ سے اباء و اعراض و انکار پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حالت یہاں تک ترقی کرتی ہے۔ کہ اس کے بعد شدہ شدہ حق تعالیٰ سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا کو اپنے سے اور اپنے کو خدا سے ناخوش پاتا ہے۔ بس یہ سرحد ہے۔ کفر کی۔ (نعوذ اللہ منہ)۔

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب فوائد الفوائد میں لکھا ہے کہ حجابات کے سات درجے ہیں۔ ان میں ایک درجہ عداوت ہے۔ اولاً طبعی اور عداوت طبعی کے بعد پھر آخری درجہ کفر ہے۔ اختیاری اور ادنی درجہ حجاب کا معمولات کا اختلال ہے کہ خدا کے ساتھ جو برتاؤ اور تعلق چلا آ رہا ہے۔ اس میں کمی کر دے۔ یہ ادنیٰ حجاب ہے اور اسی سے بڑھتے بڑھتے حجابات کثیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس ادنیٰ سے بھی بچنا چاہیے۔

اسی واسطے حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

یا عبداللّٰہ لا تکن مثل فلان کان یصلی من اللیل ثم ترکھا

(الصحیح للبخاری ۲:۲۸)

کہ اے عبداللہ! ایسے مت ہو جانا جیسے فلاں شخص تھے۔ کہ اول تہجد کی نماز پڑھتا تھا، پھر چھوڑ دی۔

نفس کا دھوکہ

باقی یہ سمجھنا کہ مجھے کمال حاصل ہو گیا ہے۔ یہ تو صاف اعجاب اور کبر کا شعبہ ہے۔

صاحب! تھوڑی سی سنسناہٹ پیدا ہو جانے سے کمال حاصل نہیں ہو جاتا۔ اسے کسی شیخ کی تشخیص پر چھوڑ دو۔ اپنی رائے سے کچھ مت سمجھو۔

صوفی نشود صافی تا درنکشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

صوفی کے صاف ہونے کے لئے ایک جام کی اور خام کی پختگی کے لئے بہت سفر کی ضرورت ہے۔ بڑی مدت میں خام کے اندر پختگی آتی ہے۔ یہ نفس کا دھوکا ہے۔ کہ اپنے کو کامل سمجھ کر سب کام چھوڑ بیٹھے۔ اس دھوکے میں نہ پڑنا چاہیے اور اپنی حالت پر کبھی اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ جو تجویز کسی مبصر نے کر دی ہے۔ عمر بھر اسی میں مشغول رہنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کے ترک میں یہ ہوتا ہے۔ کہ بتدریج کمی ہوتی رہتی ہے۔ جس کا ادراک بھی مشکل ہے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھیئے۔ کہ کسی نے ایک پھول کا درخت لگایا۔ اسے خوب پانی دیا اور بڑھ گیا۔ اب کثرت سے پھول بھی لگنے لگے۔ اب یہ سمجھ کر پانی دینا چھوڑ دیا۔ کہ اب تو یہ مکمل ہو گیا ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پہلے تو پھول چھوٹا پڑ جاوے گا۔ پھر پھول لگنا بند ہو جائے گا اور اس کے بعد درخت مرجھا کر خشک ہو جائے گا۔

ہاں اتنا تو کر سکتا ہے۔ کہ پہلے کثرت سے مجاہدے کرتا تھا۔ مگر اب کبھی کر لے۔ جیسے ابتدا میں درخت کو پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ بڑھ جانے کے بعد اتنی ضرورت نہیں رہتی۔

منتہی کی طاعت

اسی طرح مبتدی و منتہی کی طاعت میں بڑا فرق ہے۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ جتنے مجاہدے ریاضات مبتدی کرتا تھا۔ اتنے ہی منتہی بھی کرے۔ مگر یہ تو ضرور ہے کہ منتہی بھی کچھ کرے۔ اس کے تھوڑے مجاہدے بھی مبتدی کے بیسوں مجاہدوں سے افضل ہیں اور صورت بھی دونوں مجاہدوں کی جدا جدا ہو جاتی ہے۔ اور مولانا نے جو منتہی کی نسبت فرمایا ہے:

خلوت و چلہ بر ولازم نماند (خلوت اور چلہ اس پر ضروری نہیں)

سو یہ نہیں فرمایا: کہ طاعت واحکام دین لازم نماند۔ بس اس کی شان عوام الناس کی سی ہو جاتی ہے۔ اس کی عبادت بھی ایسی لطیف ہوتی ہے کہ دوسرا ادراک نہیں کر سکتا۔ نہ وہ نفلیں بہت پڑھتا ہے۔ نہ تلاوت بہت کرتا ہے۔ بلکہ وہ خلق اللہ کی خدمت میں مشغول ہوتا ہے۔ جس کو دیکھ کر بظاہر لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ اس کو وعظ وتقریر میں خوب حظ نفس ہوتا ہے۔ حالانکہ جو کچھ بات چیت منتہی کر رہا ہے۔ وہ محض خدمت کے خیال سے کر رہا ہے۔ اس میں اسے کچھ حظ نہیں ہوتا۔ بلکہ زبان سے تو بات چیت کر رہا ہے اور دل منقبض ہو رہا ہے۔ مگر دوسرے کی مصلحت کے واسطے سب کچھ برداشت کر رہا ہے۔ اس آیت سے اس کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ

یعنی اپنے نفس کو ضبط کر کے اور گھونٹ کر بیٹھے۔

یہاں حق تعالیٰ نے صبر کا لفظ ارشاد فرمایا ہے۔ اور صبر کے معنی ہیں حبس النفس علی ما تکرہ یعنی نفس کو ایسی بات کا پابند کرنا جو اس کو ناگوار ہو۔ اور اس سے معلوم ہوا۔ کہ آپ مجمع سے گھبراتے تھے۔ مگر لوگوں کی مصلحت کے لئے مجبوراً بیٹھتے تھے۔ صاحبو! ہمیں تو دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے۔ مگر اہل اللہ کو پریشانی ہوتی ہے۔ کیوں کہ ان کی نظر تو اور ہی طرف ہے۔ جس کو جامی فرماتے ہیں:

خوشا وقتے وخرم روزگارے   کہ یارے برخورد از وصل یارے

(اس کے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے خواہ اپنے زخموں پر نظر پڑے یا اس کے زخموں پر مرہم)

اور ان کی یہ شان ہوتی ہے۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم   گوش را نیز حدیث شنیدن ندہم

(مجھ کو اپنی آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے رخ انور کو نہ دیکھنے دوں اور نہ کانوں کو اس کی باتیں سننے دوں)

ان کو تو خود اپنا نفس بھی حجاب معلوم ہوتا ہے۔ تو دوست تو کیوں نہ موجب پریشانی ہوں گے۔ لوگ ان کو تعظیم وتکریم کی شان میں دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں۔ کہ بڑے چین میں ہیں۔

مگر کوئی انہی کے دل سے پوچھے کہ ان پر کیا گزرتی ہے۔

اے ترا خارے پانشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرا نے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہوں جس کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

کسی کو کیا خبر ہے۔ کہ وہ کس طرح ان مصائب کو یعنی مخلوق کی مجانست و مخالطت کو برداشت کرتے ہیں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

(جب خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا تو تطویل کلام سے کیا فائدہ، پس سلامتی اسی میں ہے کہ اس بارے میں سکوت اختیار کیا جائے)

غرض ان کو اپنے اوپر قیاس مت کرو۔ کہ جس طرح تمہیں دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے۔ اسی طرح انہیں بھی آتا ہوگا۔

کار پاکان را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو، گو ظاہر میں دونوں کے فعل یکساں ہیں، جس طرح لکھنے میں شہر اور شیر یکساں ہیں)

انہیں بے حد انقباض ہوتا ہے دوستوں سے اور وہ اس سے اس قدر پریشان ہوتے ہیں۔ کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا مگر باوجود اس کے وہ ظاہر میں سب سے بول بھی رہے ہیں اور ہنس بھی رہے ہیں۔

منتہی کا مجاہدہ

اس پریشانی اور ضحک کے اجتماع پر ایک قصہ یاد آیا۔ لکھا ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہنستے بہت تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام روتے بہت تھے۔ ایک بار دونوں میں مناظرہ ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ معلوم ہوتا ہے آپ رحمت سے مایوس ہوگئے ہیں۔ جو اس قدر روتے ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ شاید آپ عذاب

سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ جو اس قدر ہنستے ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ فیصلہ کے لئے آیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا:۔

"کہ اے یحییٰ! آپ خلوت میں تو ایسے رہیے۔ جیسے اس وقت ہیں اور جلوت میں ایسے رہیے جیسے عیسیٰ ہیں اور اے عیسیٰ! آپ جلوت میں تو ایسے ہی رہیے جیسے اس وقت ہیں اور خلوت میں ایسے رہیے جیسے یحییٰ ہیں۔ آپ کو خلوت میں ہنسنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو نڈر اور بے خوف کا کام ہے۔ اور اے یحییٰ! اگر آپ جلوت میں بھی ایسے ہی روتے رہیں گے تو میرے بندے ناامید ہو جائیں گے۔"

تو وہ اس لئے ہنستے ہیں۔ تاکہ مخلوق ناامید نہ ہو جائے۔ ان کی ہنسی لوگوں کی مصلحت کے لئے ہوتی ہے۔ کہ انہیں نفع پہنچے اور تاکہ وہ دل شکستہ نہ ہوں۔

تو صاحبو! ان کی عبادت اس قسم کی ہوتی ہے۔ کہ لوگ اسے لذت اور حظ نفس سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں وہ مجاہدات ہیں۔

یہی وجہ ہے۔ کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم سے زیادہ ضحک کبھی نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کے دل پر چوٹ لگی ہوتی ہے اور غم کا اثر ہوتا ہے۔ وہ جب بھی ہنسے گا۔ کوشش اور قصد سے ہنسے گا اور قصد کی ہنسی قابو میں ہوتی ہے۔ اس لئے آپ کی ہنسی تبسم سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ شب و روز دیکھ لو۔ اگر کسی کو ذرا رنج ہوتا ہے۔ تو یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ جہاں کسی نے اس سے ہنسی کی بات کی فوراً غصہ آ جاتا ہے۔ لیکن اگر رنج کا سبب قابل اخفاء ہوتا ہے۔ تو اس کو اس خیال سے ہنسی کی صورت بنانی پڑتی ہے۔ کہ اگر نہ ہنسوں گا۔ تو راز کھل جائے گا۔ اس لئے زبردستی منہ چڑانا پڑتا ہے۔ غرض بڑی مصیبت سے ہنسی آتی ہے۔ بس یہی حال اہل فکر کا ہوتا ہے اور ایک ہم بے فکرے ہیں۔ کہ ذرا سے اشارہ میں محلہ کو سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ معمولی سی ہنسی کی بات پر لوٹ جاتے ہیں اور ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہنسنا ہے۔ کہ فقط تبسم فرماتے تھے اور وہ بھی امت کی مصلحت کے لئے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہنستے بھی کیسے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو امت کے لئے طویل الاحزان دائم الفکر رہتے تھے۔ جو ہر وقت فکر میں ہوگا۔ اسے کیوں کر ہنسی آئے گی۔

چوں چنیں کارے است اندر راہ ترا خواب چوں می آیدا ے ابلہ ترا

(جب تو اپنی راہ میں کام میں مصروف رہے گا تو اے بے وقوف تجھے خواب کیسے آئے گا)

اعتقاد کمال

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے۔ کہ ان کے سامنے سے ایک جماعت بےفکروں کی نکلی۔ ہنستے ہوئے جارہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ کہ تم کو پل صراط پر چڑھنا تو معلوم ہے اور اترنے کی خبر نہیں۔ پھر کیسے ہنسی آتی ہے؟ (مطلب یہ تھا کہ بحوائے اِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا۔ ہر شخص کو جہنم کے اوپر سے گزرنا ضرور ہے۔ اور یہ خبر نہیں کہ پھر پار ہوں گے یا دوچار ہوں گے۔ اس حالت میں تمہارا ہنسنا حیرت انگیز ہے۔ واقعی خوب کہا ۱۲) ایسی بے ساختہ ہنسی تو اسی کو آتی ہے۔ جس کے قلب میں بےفکری ہو۔ غرض ہمیں ہر وقت اپنی حالت کو سوچتے رہنا چاہیے اور کبھی اپنے متعلق کمال کا گمان نہ ہونا چاہیے۔ جس سے عبادت میں کمی کردی جاوے۔

اور بالفرض اگر کمال کو حاصل بھی فرض کرلیا جاوے تب بھی بےفکری کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر خلوت و چلہ لازم نہیں رہا۔ تو عبادت سے تو خالی نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ اس درجہ پر پہنچ کر تو عبادت زیادہ دقیق ولطیف ہو جاتی ہے۔ جس کی رعایت میں خاص اہتمام کی حاجت ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ عبادت کا ترک ہر وقت مضر ہے اور کمال کا اعتقاد بھی مضر ہے۔ کہ یہ عبادات ترک کرادیتا ہے۔ اسی واسطے یہ مضمون یعنی فکر اصلاح و تکمیل دین ہر وقت کی ضرورت کا ہے۔

آدابِ مکان

اور ہر چند کہ اس کا بیان ضرورت کی قدر بھی کافی تھا۔ کیونکہ سب کے نزدیک مسلم ہے۔ زیادہ تطویل کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اس کے متعلق زیادہ بیان کرنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے۔ کہ جس مکان میں اس وقت بیان ہو رہا ہے۔ اس وقت اس کی تکمیل ہو چکی ہے اور اس کے مالک کا سکونت کے لئے اس میں آجانے کا ارادہ ہے اور یہ حالت مظنہ تھا۔ اس کے ساتھ زیادہ شغل قلب کا جو ایک قسم کا انہماک ہے۔ دار دنیا کے ساتھ اس لئے ضرورت تھی کہ

اس انہماک کی مذمت اور شغل آخرت کی ضرورت کا کسی قدر خاص اہتمام سے بیان کیا جاوے۔ یہ وجہ ہوگئی کسی قدر تطویل کی۔ بہرحال اس آیت میں دارِ دنیا اور دارِ آخرت کے ساتھ جو معاملہ کیا جاوے اس کا ذکر ہے۔ جس کے عموم میں خاص مکان بھی آ گیا۔

اور ایک آیت میں خاص مکان یعنی مساکن کا معاملہ بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دنیوی مساکن کے ساتھ اتنا محفوظ ہونا کہ آخرت سے غافل کر دے۔ نیز مذموم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ﹰاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ.

یعنی فرما دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبے والے اور وہ مال جس کو تم نے محنت سے حاصل کیا ہے اور وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے۔ اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ زیادہ محبوب ہیں۔ تمہارے نزدیک خدا اور اس کے رسول سے اور اس کے راستہ میں جہاد کرنے سے۔ تو انتظار کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اپنے حکم کو لاوے۔

یہ محل وعید میں ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اگر تمہیں یہ سب چیزیں جو مذکور ہوئی ہیں۔ خدا سے اور اس کے احکام سے زیادہ محبوب ہیں۔ تو حکم ثانی کا انتظار کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حق تعالیٰ کی کتنی رحمت ہے۔ کہ محض حب مساکن پر وعید نہیں ہے اور نہ رضا بالمساکن پر وعید ہے۔ یعنی مکان کو پسند کرنے پر بھی وعید نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اچھا اور پسندیدہ مکان بنانے کی اجازت ہے۔

اب وعید کا ہے پر ہے۔ صرف احب الیکم پر۔ کہ وہ خدا سے زیادہ محبوب ہوں۔ تب محل وعید ہیں۔ اس میں بھی مطلق محبوب ہونے پر وعید نہیں۔ تو مکان کا نہ مرضی ہونا محل وعید ہے نہ محبوب ہونا۔ بلکہ احب من اللہ ہونا محل وعید ہے۔ اب اگر کوئی شخص بقدرِ ضرورت مکان بنوالے۔ جس میں اسراف و تفاخر نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔

اور یہ ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے۔ کہ اس کو کتنا مکان ضروری ہے کیونکہ لوگوں کے درجات

مختلف ہیں اور انہیں درجات کے لحاظ سے ضروریات بھی مختلف ہیں۔ کسی کو ایک حجرہ آسائش و راحت کے لئے کافی ہو جاتا ہے اور کسی کو ایک بڑا مکان بھی مشکل سے کافی ہوتا ہے۔ بہر حال عمدہ، پختہ اور بڑا مکان بنانا شرعاً ماذون فیہ ہے۔ چنانچہ اسکے عدم جواز کا کسی کا بھی مذہب نہیں ہے۔ ایک شخص کو زیادہ سردی لگتی ہے۔ وہ لحاف اوڑھتا ہے۔ اور ایک شخص کا جاڑا ہلکی رضائی میں چلا جاتا ہے۔ دونوں کا اسراف الگ الگ ہے۔ بہر حال ہر شخص اپنی ضرورت کو خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ ہاں ضرورت سے آگے ایک درجہ آرائش کا ہے۔ وہ بھی جائز ہے۔ بشرطیکہ اس میں اسراف اور حدود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو اور نہ قصد فخر و عجب کا اختلاط ہو۔ کیونکہ یہ درجہ نمائش کا ہے۔ جو ناجائز ہے۔

اور اسراف کے معنی یہ ہیں۔ کہ منہی عنہ کا ارتکاب نہ ہو اور جو خرچ بھی ہو وہ معصیت میں خرچ نہ ہو۔ اس میں بھی تھوڑی سی تفصیل ہے۔ بعض دفعہ ایک ہی شے ایک شخص کے اعتبار سے اسراف ہو سکتی ہے اور دوسرے شخص کے اعتبار سے اسراف نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شخص کو دس روپے گز کا کپڑا پہننے کی وسعت ہے اور ایک شخص کو ایک روپیہ گز کے کپڑے کی بھی وسعت نہیں۔ یہ اگر دس روپے گز کا کپڑا خریدے گا۔ تو ضرور قرض دار ہوگا۔ اب دونوں نے یہ کپڑا خریدا تو جس کو وسعت ہے۔ اس کے لئے تو کچھ حرج نہیں۔ نہ اس پر اسراف کا الزام اور جس نے قرض لیا۔ وہ بے ضرورت گردن پھنسانے سے گنہگار ہوگا۔ مسرف شمار ہوگا۔ کیونکہ بلا ضرورت مقروض ہونا گناہ ہے۔ دیکھئے۔ دس روپے گز کا کپڑا خریدنا ایک ہی فعل ہے۔ مگر ایک کے لئے گناہ نہیں ہے اور ایک کے لئے گناہ ہے۔ بات یہ ہے کہ واقع میں تو وہ فعل مباح ہے۔ مگر ایک عارض کی وجہ سے اس کے لئے موجب گناہ بن گیا اور وہ عارض کیا تھا۔ بلا ضرورت قرض لینا۔ اگر یہ اس قدر قیمتی لباس نہ پہنتا تو بے ضرورت قرض کی معصیت میں مبتلا نہ ہوتا۔ اس لئے اس کے لئے اتنا اچھا اور قیمتی کپڑا پہننا بھی گناہ ہے۔ کیوں کہ مقدمہ گناہ بھی گناہ ہی ہوتا ہے۔

تو بہر حال ہر چیز میں تین درجے ہیں۔ ایک آسائش اور ایک آرائش ایک نمائش۔ تو۔

آسائش تو ہر ایک کے لئے مستحب ہے اور آرائش یا زیبائش میں اگر معصیت کا مثلاً بلا ضرورت قرض وغیرہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو یہ بھی مباح ہے۔ گو اس کا ترک اولی ہے اور نمائش جس میں ریا و کبر و عجب اور فخر ہوتا ہے۔ یہ حرام ہے۔ اب اس کا فیصلہ ہر شخص کے تدین پر ہے۔ کہ اس کی نیت کیا ہے۔ اگر دل میں غور کر کے یہ دیکھے کہ یہ کام میں نے نمائش کے لئے کیا ہے۔ تو تاویل کر کے اس کو آرائش میں داخل نہ کرے۔ مگر اس کے ساتھ دوسرے کے فعل کو بھی خواہ مخواہ معصیت میں داخل نہ کرے۔ کہ ہر ایک کے فعل کو نمائش پر محمول کرنے لگے۔ بلکہ حسن ظن رکھے۔ تو خلاصہ یہ ہوا۔ کہ مساکن مرضیہ اگر احب من اللہ ہوں۔ تب محل وعید ہیں، ورنہ نہیں۔ سو مدارِ وعید مساکن مرضیہ نہیں۔ پس قید ترضونہا بیان فرما کر پھر اس پر وعید کا مدار نہ رکھ کر اپنی پسند کا مکان نہ بنانے کی اجازت مستنبط ہوتی ہے۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ پھر اس سے محبت کرنے کی بھی اجازت ہے۔ یعنی اس کی جانب میلان قلب کی بھی اجازت ہے۔ بشرطیکہ وہ محبت خدا اور رسول کی محبت سے بڑھ کر نہ ہو۔ اگر زیادہ ہوگی۔ تو گنہگار ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ مساکن کے متعلق یہ آداب ہیں۔ جنہیں میں بقدر ضرورت اس کے قبل کے وعظ میں جو اسی مکان کے دوسرے حصہ میں ہوا تھا۔ بیان کر چکا ہوں۔

ضرورت فکر آخرت

حق تعالیٰ نے اس آیت مقصودہ بالبیان میں بھی دار آخرت کے مقابلہ میں حیات دنیا کو بیان کیا ہے اور مقصود یہ ہے۔ کہ دارِ آخرت پر حیات دنیا کو ترجیح نہ ہونی چاہیے۔ تو لفظی مناسبت تو اس مضمون کے اختیار کرنے کی ظاہر ہی ہے۔ کہ افتتاحِ دار کے لئے یہ وعظ ہوا ہے اور ان آیات میں بھی دار آخرت کا تذکرہ ہے۔ مگر معنی کے اعتبار سے ان میں سے ایک عام مضمون کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہ آخرت سے بے فکری نہ ہونی چاہیے۔ اور گو اس کے لئے یوں بھی فرما سکتے تھے۔ کہ:

اطلبو ا الآخرۃ و اترکو ا الدنیا

کہ آخرت کی جستجو کرو اور دنیا کو چھوڑ دو۔ مگر اس طرح نہیں بیان کیا۔ کیونکہ حق تعالیٰ کو اس مضمون کے ساتھ ساتھ دونوں کی حالت کا دکھلانا بھی مقصود ہے۔ جس سے اشارہ اس

امر کی طرف بھی کرتا ہے۔ کہ اس حالت کے بعد ہر شخص خود ہی فیصلہ کر لے۔ کہ دونوں میں کون توجہ کے قابل ہے اور کون ترک کے قابل۔ اسی لئے امر و نہی کے صیغہ سے نہیں بیان کیا۔ بلکہ بصورت اخبار یوں فرمایا ہے:۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ

یہاں حق تعالیٰ نے دنیا کے لئے دو لفظ اختیار کئے ہیں۔ ایک لہو اور ایک لعب اور دونوں کے مفہوم میں لغۃً کچھ فرق ہے۔ وہ یہ کہ لہو کہتے ہیں شغل کو اور لعب کہتے ہیں عبث کو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا ایسی چیز ہے۔ کہ اس میں دو صفتیں ہیں۔ ایک تو لہو ہونے کی۔ کہ یہ لوگوں کو اپنی طرف لبھاتی اور مشغول کرتی ہے۔ اور دوسرے لعب یعنی عبث ہونے کی۔ کہ اس میں مشغول ہونا عبث یعنی بے نتیجہ ہے۔ اس پر کوئی معتد بہ ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔ جیسے بچوں کا کھیل۔ کہ اس پر بھی کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔

اصلاحِ زاہد خشک

اس سے ایک اور دقیق علم کی طرف بھی اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ تمام حیات دنیا مذموم نہیں۔ بلکہ وہ حیات دنیا مذموم ہے۔ جس میں محض لہو و لعب ہو۔ یعنی جو بے نتیجہ ہو اور اس کا کوئی معتد بہ ثمرہ نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ دنیائے صوری کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس پر ثمرہ مرتب ہو اور ایک وہ کہ جس پر ثمرہ مرتب نہ ہو۔ جس پر ثمرہ مرتب نہ ہو وہ مذموم ہے اور جس پر ثمرہ مرتب ہو وہ واقع میں دنیا ہی نہیں۔

یہاں سے اصلاح ہے۔ غالی فی الزہد اور زاہد خشک کی۔ کہ وہ یہ سمجھتا ہے۔ کہ دنیا کی ہر چیز مذموم ہے۔ عمدہ کپڑا، اچھا کھانا، ٹھنڈا پانی سب مذموم ہے۔ بعض لوگ اسی خیال سے نکاح بھی نہیں کرتے۔ کہ عورت بھی دنیا ہے اور بعض کر بھی لیتے ہیں۔ تو نان و نفقہ نہیں دیتے اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ بیوی کی طرف التفات کرنے کو التفات الی الدنیا سمجھتے ہیں۔

میں ایک مرتبہ گھر میں کے معالجہ کے لئے میرٹھ گیا۔ تو وہاں ایک عورت نے مجھ سے بیعت کی درخواست کی۔ تو ایک دوسری عورت نے اس عورت کو یہ رائے دی۔ کہ تو ہمارے

پیر سے بیعت کرنا جو ایسے بزرگ ہیں۔ کہ پچاس برس سے بیوی سے بولے بھی نہیں اور جس مولوی سے تو مرید ہونا چاہتی ہے۔ وہ تو بیوی کو علاج کے لئے ساتھ لئے لئے پھرتے ہیں اور جاہل نے یہ نہ خیال کیا۔ کہ یہ پیر صاحب تو پچاس برس سے حقوق العباد تلف کرنے کی وجہ سے خدا کی نافرمانی میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ یہ بزرگ کیسے ہو سکتے ہیں۔

غرض اس آیت سے ایسے زہدان خشک کی بھی اصلاح ہوگئی۔ کہ دنیا اسے ہی نہیں کہتے۔ جسے تم دنیا سمجھتے ہو۔ یعنی روپیہ پیسہ وغیرہ۔ بلکہ دنیا تو درحقیقت لہو ولعب کا نام ہے۔ جہاں یہ نہ ہو وہاں دنیا بھی نہ ہوگی اور جہاں یہ ہو، وہاں دنیا ہوگی۔ گو ظاہری سامان کچھ نہ ہو۔

دنیائے مذموم

اور اصل بات یہ ہے کہ یہاں دنیا مقابل آخرت کے ہے اور دنیا کا اطلاق دو معنی پر آتا ہے۔ ایک تو دین کے مقابلہ میں دنیا بولی جاتی ہے۔ جس کے معنی بے دینی کے ہوتے ہیں۔ اور ایک آخرت کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے۔ جس کے معنی حیات دنیا کے ہوتے ہیں اور قرآن و حدیث میں دنیا کا استعمال دونوں معنی میں آیا ہے۔ سو آیت میں تو دنیا مقابلہ میں آخرت کے ہے۔ اس میں دو قسمیں ہیں۔ مذموم یعنی لہو ولعب وغیر مذموم یعنی اموال امتاع وغیرہ۔ پس وہ علی الاطلاق مذموم نہیں اور مذموم وہ ہے جو دین کے مقابلہ میں ہو۔ جیسے:۔

حب الدنیا رأس کل خطیئة. (اتحاف السادة المتقین: ۱۸۱:۳، ۳۵۴:۷، ۸۱:۸)

کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔ یہاں دنیا مقابلہ میں دین کے بولی گئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ بے دینی کی باتوں سے محبت نہ کرنا چاہیے اور یہ معنی نہیں۔ کہ بیوی بچوں سے بھی محبت نہ کرے۔ کیونکہ یہ بے دینی کی چیزیں تھوڑا ہی ہیں۔ بلکہ یہ تو نکاح کا نتیجہ ہیں۔ جو دین ہے۔ غرض دنیا وہ مذموم ہے جو دین میں مضر ہو۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن   نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

(خدا تعالیٰ سے غافل ہونے کا نام دنیا ہے، سونا، چاندی اور بیوی بچوں کو دنیا نہیں کہتے)

یعنی دنیا کسے کہتے ہیں۔ خدا سے غافل ہونے کو نہ کہ مال و دولت اور بیوی بچوں کو۔

آگے ایسے ہی دنیا والوں کو کہتے ہیں۔

اہل دنیا چہ کہیں و چہ مہیں　　　لعنۃ اللہ علیہم اجمعین

یہاں پر ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ سب اہل دنیا پر لعنت کیسے کردی۔ جواب یہ ہے۔ کہ اصل میں یہ ترجمہ ہے۔ ایک حدیث کا۔ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

الدنیا ملعونٌ و ملعون ما فیها الا ذکر الله وما والاہ او عالم او متعلم

(سنن ابن ماجة: ۴۱۱۲، کنز العمال: ۶۰۸۳)

یعنی دنیا خدا کی رحمت سے دور ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی خدا کی رحمت سے دور ہے۔ مگر خدا کا ذکر اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے چیز اور عالم یا متعلم ذکر اللہ اور اس کے مقدمات و متعلقات اور عالم و متعلم کو تو خدا کی رحمت سے بعد نہیں ہے۔ باقی سب رحمت سے بعید ہیں اور واقع میں یہ استثناء منقطع ہے۔ متصل نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا کے مفہوم میں ذکر اللہ اور عالم و متعلم پہلے ہی سے داخل نہیں۔ تو لعنت یعنی بعد عن الرحمۃ کا حکم خاص ان پر کررہے ہیں۔ جن کو دین سے تعلق نہ ہو۔ چنانچہ قرینہ اس کا وہ شعر ہے۔ جو بعد میں کہتے ہیں۔

اہلِ دنیا کافران مطلق اند　　　روز و شب در زق زق و بق بق اند

(صرف کفار اہل دنیا ہیں رات دن زق زق، بق بق میں گرفتار ہیں)

اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے۔ کہ یہ تو لعنت سے بھی بڑھ کر ہے۔ کہ یہاں سب اہل دنیا کو کافر ہی کہہ دیا۔ مگر ایک بزرگ نے اس کی خوب توجیہہ فرمائی۔ جس کے بعد یہ قرینہ ہوگیا بعد عن الرحمۃ کے محل کا وہ توجیہہ یہ فرمائی۔ کہ اہل دنیا مبتداء اور کافران مطلق خبر نہیں ہے۔ بلکہ اہل دنیا خبر مقدم ہے اور کافران مطلق مبتدائے مؤخر ہے۔ یعنی جو کافران مطلق ہیں وہی اہل دنیا ہیں۔ مومن اہل دنیا ہے ہی نہیں۔ کیونکہ ابھی حدیث سے معلوم ہوگیا ہے۔ کہ خدا کے ذکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے ملعون نہیں ہیں۔ تو کون مومن ایسا ہوگا۔ جو خدا کے ذکر سے کچھ بھی علاقہ نہ رکھتا ہوگا۔ غرض وہی دنیا مذموم ہے جو آخرت بمعنی دین کے مقابلہ میں ہو۔

اسباب دنیا

باقی اسباب دنیا تو اس میں حدیث نے دو قسمیں کردی ہیں۔ ایک وہ جو آخرت میں کچھ دخل

اوراس سے تعلق رکھتی ہوں تو جو دنیا آخرت میں دخل نہیں رکھتی یہ حقیقت میں دنیائے محضہ اور مذموم ہے اوراسی کولہوولعب فرمایا گیا ہے۔تو حق تعالیٰ نے اس مقام پر فیصلہ فرمادیا ہے۔کہ ایسی دنیا متوجہ ہونے کے قابل نہیں۔بلکہ توجہ کے قابل تو آخرت ہے۔اسی کوارشاد فرماتے ہیں:۔

وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَ ةَ لَهِيَ الْحَيَوَان.

کہ حیات آخرت ہی سراپا حیات ہے۔جس میں حصر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ مرض تھا ہمارے اندر۔جس کا حق تعالیٰ نے کس خوبی سے فیصلہ فرمادیا ہے۔کہ دنیا و آخرت دونوں کے حالات یعنی لہو ولعب کے ہونا اور حیات کاملہ ہونا بتادے۔تا کہ دونوں کے حالات سننے کے بعد ہر عاقل نہایت آسانی سے خود ہی فیصلہ کر سکے۔کہ ان میں سے کون توجہ کے قابل ہے اور کون عدم توجہ کے قابل۔

ضرورت اخلاص

اور حالت بتلا کر یہ بھی بتلا دیا۔کہ جس طرح بعض کام جن کی صورت دنیا ہے اور وہ دخل رکھتی ہیں۔آخرت میں۔واقع میں دنیا نہیں ہیں۔کیونکہ وہ لہو ولعب نہیں۔اسی طرح اس کے مقابل وہ آخرت کا کام جو صورت میں آخرت کے ہیں اور واقع میں دنیا کے لئے ہیں۔وہ آخرت نہیں ہیں۔

کلید درِ دوزخ است آن نماز ۔۔۔ کہ در چشم مردم گزاری دراز

(وہ نماز دوزخ کی کنجی ہے، جو لوگوں کو دکھلانے کی خاطر لمبی کر کے پڑھی جائے)

یعنی وہ نماز دوزخ کی کنجی ہے۔جس سے دوزخ کا دروازہ کھل جائے گا۔جو ریا اور شہرت کے واسطے پڑھی جاوے۔کیونکہ لہو ولعب کے معنی اوپر معلوم ہو چکے ہیں۔کہ لعب وہ شغل ہے۔ جو ثمرہ سے خالی ہو اور یہ نماز بھی فی الواقع ثمرہ سے خالی ہے۔تو یہ دنیا ہوئی آخرت۔بمعنی دین نہیں ہوئی۔حدیث شریف میں ہے۔کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ ایک شہید کو بلائیں گے۔

فیسئل عنه ماذا قدمت فیقول قاتلت فی سبیلک حتی استشهدت فیقال لابل انما قاتلت لیقال انک لجریٔ فقد قیل فیؤمر به فیلقی فی النار او کما قال.

اس سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے لئے کیا کام کیا۔ وہ کہے گا۔ اے رب میرے میں نے آپ کے راستہ میں جہاد کیا تھا۔ یہاں تک کہ شہید ہوگیا۔ ارشاد ہوگا۔ نہیں تم نے جہاد اس لئے نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس لئے کیا۔ تا کہ لوگ کہیں کہ بھئی بڑا بہادر ہے۔ تو یہ کہہ دیا گیا یعنی جس کے لئے تم نے جہاد کیا۔ وہ تم کو حاصل ہو چکا۔ پس اس کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

اسی طرح ایک سخی کو بلائیں گے اور اس کا بھی یہی حشر ہوگا۔ کہ ہمارے لئے تم نے سخاوت نہیں کی۔ بلکہ اس لئے تم نے سخاوت کی تھی۔ لیقال انک جواد فقد قیل۔ تا کہ لوگ یہ کہیں کہ بڑا سخی ہے۔ تو بہت تعریف ہو چکی۔

اسی طرح ایک عالم کو بلائیں گے۔ سوال ہوگا۔ تم نے کیا کیا۔ عرض کرے گا۔ میں نے آپ کی رضا کے لئے وعظ کہا اور یہ کیا۔ وہ کیا۔ ارشاد ہوگا نہیں۔ اس لئے یہ کام نہیں کیا بلکہ اس لئے لیقال انک لقاری۔ کہ یہ کہا جاوے۔ کہ یہ بڑے عالم ہیں۔ تو آپ کی بھی بہت تعریف ہو چکی۔ اب یہاں کیا رکھا ہے۔ تو دیکھئے! شہادت، سخاوت، علم دین کی خدمت، جو اس طریقہ مذکورہ فی الحدیث سے ہو۔ وہ بھی دنیا ہی ہے۔ اگرچہ صورت اس کی آخرت کی ہے۔ چنانچہ ایک خرچ کرنا کفار کا تھا۔ کہ اپنے نزدیک نیک کام سمجھ کر کرتے تھے۔ مگر پھر بھی ان کی مذمت کی گئی۔ کیونکہ وہ محض صورت دین تھی اور حقیقت میں بھی وہ انفاق دین نہ تھا۔

چنانچہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ.

یعنی کفار اپنے اموال اس لئے خرچ کرتے ہیں۔ تا کہ لوگوں کو خدا کے راستہ سے باز رکھیں اور ایک خرچ اہل ایمان کا تھا۔ کہ لِتَکُوْنَ کَلِمَةُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا تا کہ خدا ہی کا نام بلند ہو۔ جیسے ارشاد ہے:۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ.

کہ جو لوگ خدا کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کے خرچ کی ایسی مثال ہے۔ جیسے

ایک دانہ (زمین پر ڈالا گیا) جس سے سات بالیاں اگی ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ گویا ایک سے سات سو ہو گئے۔ دیکھئے حالانکہ اہل ایمان اور اہل کفر دونوں خرچ کرتے ہیں اور دونوں کا انفاق بھی حیات دنیا ہی میں ہوتا ہے اور دونوں کا مقصد بھی بزعم منفق اعانت دین ہی ہوتا ہے۔ جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فعل میں اشتراک ہے۔ مگر چونکہ یہ دین مقبول ہے۔ اس لئے اس کے لئے انفاق بھی دین ہے اور وہ دین باطل ہے۔ اس کے لئے انفاق دنیا ہوا۔ گو صورۃً اتحاد واشتراک ہے۔ مگر حقیقۃً دونوں میں بڑا فرق ہے اور اسی فرق کی وجہ سے ایک دنیا ہے اور ایک دین۔

اسی طرح ہر عمل کی یہی کیفیت ہے۔ کہ محض صورۃً دین ہونے سے وہ دین نہیں بن سکتا اور نہ صورۃً دنیا ہونے سے دنیا بنتا ہے۔ پس اس کی بڑی ضرورت ہے۔ کہ نظر وغور کر کے دیکھا جائے۔ کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں آیا وہ دین کے لئے خلوص اور خوش نیتی سے کر رہے ہیں یا ایسا نہیں۔ اگر خلوص سے کر رہے ہیں تو وہ مقبول ہے۔ ورنہ کچھ بھی نہیں۔

اقسام عامل

اب اس کے بعد دو قسم کی طبیعت کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو دین کو دنیا کے واسطے کرتے ہیں۔ جس کا مذموم ہونا ظاہر ہے اور ایک وہ ہیں۔ جو دین کا کام اس لئے بالکل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ کہ نیت تو آخرت کی ہے ہی نہیں۔ پھر بلا نیت کے کر کے کیا کریں۔ چنانچہ یہی سمجھ کر بہت سے جاہل لوگوں نے نماز چھوڑ دی۔ کہ جیسی مطلوب ہے ویسی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ تو پڑھنے سے کیا فائدہ۔ بعض نے روزہ چھوڑ دیا۔ کہ جیسا ہونا چاہیے۔ ویسا تو ہو نہیں سکتا۔ پھر رکھنے سے کیا فائدہ ہے۔ اے صاحبو! یہ بڑی غلطی ہے۔ روزہ و نماز حقیقی کے حاصل کرنے کی تدبیر بھی یہی ہے۔ کہ پہلے روزہ و نماز صوری کو اختیار کرو۔ گو خلوص نہ ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس کی ضد بھی نہ ہو۔ خلو کا درجہ ہو۔ اسی سے خلوص ہو جاتا ہے اور کرتے کرتے نیت بھی درست ہو جاتی ہے اور یہ نفس کا حیلہ و بہانہ ہے۔ کہ جب کامل عمل نہیں ہوتا۔ تو ناقص کیوں کریں۔ سبحان اللہ! کیا دنیا کے جتنے کام کامل ہوتے ہیں۔ وہ اول ہی دن سے کامل ہو جاتے ہیں۔

ہرگز نہیں۔ بلکہ مدت کے بعد عمدہ کام کرنا آتا ہے۔ یہی حال اعمالِ آخرت میں بھی ہے۔ کہ کرتے کرتے ہی کمال حاصل ہو جائے گا۔ پس ناقص عمل بھی بے کار نہیں۔ بلکہ یہ ذریعہ ہے کامل کا۔ پس اعمال صالحہ میں خلوص کا قصد تو کرو۔ لیکن اگر آج حاصل نہ ہو۔ تو عمل نہ چھوڑ بیٹھو۔ بلکہ کئے جاؤ اور قصد بھی برابر رکھو۔ ان شاء اللہ ایک دن ضرور حاصل ہو جائے گا۔

فریضہ امتِ محمدیہ

اس کے بعد کوتاہی اعمال کے اعتبار سے ایک اور تقسیم ہے۔ وہ یہ کہ ایک کوتاہی تو یہ تھی۔ کہ اعمال میں نفس کے حیلہ و بہانہ سے خود ہی مشغول نہیں ہوتے اور دوسری کوتاہی یہ ہے۔ کہ جو لوگ خود اعمال میں مشغول بھی ہیں۔ انہیں دوسروں کی فکر نہیں ہے۔ وہ اپنے نوکروں کو اپنے متعلقین کو بلکہ اپنے بچوں تک کو نماز پر مجبور نہیں کرتے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا باب ہی آج کل مفقود ہے۔

یاد رکھو! جیسے طاعت خود واجب ہے۔ ویسے ہی دوسروں کی طاعت کے لئے سعی بھی واجب ہے۔ مگر یہ سعی بقدر استطاعت واجب ہے۔ جہاں زبان کی استطاعت ہو۔ وہاں زبان سے کرے، جہاں ہاتھ پاؤں سے کر سکے۔ ہاتھ پاؤں سے کرے۔ روپے پیسے سے کرے۔ خلاصہ یہ کہ محض اپنا عمل درست کر لینا کافی نہیں۔

دیکھئے! قرآن میں جہاں اس امت کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں بطور خصوصیت کے اصلاح غیر کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ.

اس آیت میں اس امت کی تین فضیلتیں بیان فرمائی ہیں۔ جن میں فضیلت ایمان باللہ کی تو ہر شخص کے پاس اپنے لئے ہے۔ اور باقی دو فضیلتیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی۔ یہ دوسروں کے نفع کے لئے ہیں۔ کیونکہ اس سے دوسرے پر نفع کا اثر پہنچتا ہے اور مقتضا قواعد کا یہ تھا۔ کہ یہاں تو مومن باللہ کو مقدم فرماتے۔ کیونکہ وہ اساس اعمال ہے۔ مگر مؤخر کرنے میں

غالباً یہ نکتہ ہے کہ عوارض پر نظر کر کے اصلاح غیر کا اہتمام زیادہ مقصود ہے۔ کیوں کہ اپنی ضرورت کا اہتمام تو ہر شخص خود ہی کر لے گا۔ ورنہ فی نفسہ اپنی اصلاح غیر کی اصلاح سے مقدم ہے۔

اصلاح میں عملی ترتیب

مگر اس تقدیم کے یہ معنی نہیں۔ کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی بھی اصلاح واجب نہیں۔ بلکہ یہ تو محض عملی ترتیب ہے۔ کہ پہلے اپنی اصلاح کرنا چاہیے۔ پھر دوسرے کی کرے۔ یہ نہیں کہ اگر مقدم کام نہ کیا ہو تو مؤخر کو بھی نہ کرے۔ کیوں کہ دراصل یہ دو کام الگ الگ ہیں۔ ایک دوسرے کا موقوف علیہ نہیں۔ ایک کو بھی ترک کرے گا تو اس ایک کے ترک کا گناہ ہوگا۔ اور دوسرے کو ترک کرے گا۔ تو دوسرے کے ترک کا گناہ ہوگا۔ اور دونوں کو ترک کرے گا۔ تو دونوں کے ترک کا گناہ ہوگا۔ تو یہ غلطی ہے۔ کہ اپنی اصلاح نہ ہوئی ہو تو دوسروں کو بھی تنبیہ نہ کرے۔

بعضے اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ. (کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو)

وہ اس سے یہی سمجھے۔ کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی نہ کرے۔ کیونکہ ہمزہ اتأ مرون پر انکار کے لئے داخل ہوا ہے۔ تو امر بالبر منکر ہوا۔ یعنی جس حالت میں تم اپنے نفسوں کو بھولے ہوئے ہو۔ لوگوں کو امر بالبر کیوں کرتے ہو۔ مگر یہ محض غلط ہے۔ بلکہ ہمزہ مجموعہ پر داخل ہوا ہے اور انکار مجموعہ کے دوسرے جزو کے اعتبار سے ہے۔ کہ اپنے آپ کو اصلاح میں بھلانا نہیں چاہیے۔ اس آیت کا تو یہ جواب ہو گیا۔

وجوب اصلاح غیر

اب ایک دوسری آیت کا مطلب بھی سنئے۔ جس سے ان لوگوں نے اس پر استدلال کیا ہے۔ کہ بے عمل کو وعظ و نصیحت نہ چاہیئے وہ یہ ہے۔ کہ:۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ.

کہ تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو۔ جو کرتے نہیں۔ خدا کے نزدیک نہایت مبغوض ہے۔ کہ جو کام خود نہ کرو۔ اسے کہو۔

دراصل یہ لوگ محض ترجمہ دیکھنے سے دھوکے میں پڑھ گئے۔ ترجمہ سے یہ سمجھے کہ مطلب یہ ہے کہ جو کام خود نہ کرے۔ وہ دوسروں کو بھی کرنے کو نہ کہے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ تفسیر میں اسباب نزول سے آیات کے صحیح مطلب کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے۔ کہ کون سی عبادت سب سے زیادہ خدا کو پسند ہے۔ تو ہم دل و جان سے اس کو خوب بجالائیں۔

اس پر ارشاد ہوا۔ کہ جہاد فی سبیل اللہ خدا کو بہت پسند ہے۔ بس یہ سن کر بعضوں کا خون خشک ہو گیا۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ کہ ایسی باتوں کا دعویٰ یا وعدہ کیوں کرتے ہو۔ جنہیں تم پورا نہیں کر سکتے۔ تو یہاں پر لم تقولون سے لم تصحون غیر کم یا قول امری وانشائی مراد نہیں ہے۔ بلکہ قول خبری داعائی مراد ہے۔ حاصل یہ کہ یہ آیت دعویٰ کے باب میں ہے۔ دعوت کے باب میں نہیں۔ اس کے شان نزول معلوم ہو جانے کے بعد سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ کہ اس آیت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ممانعت سے کچھ بھی مس نہیں۔

غرض واجب تو دوسرے کی بھی اصلاح ہے۔ مگر اپنی اصلاح اس پر ضرورت میں مقدم ہے اور باوجود اس کے حق تعالیٰ نے اصلاح غیر کو مہمل نہیں چھوڑا۔ بلکہ جا بجا نہایت اہتمام سے بلا قید تقدیر اصلاح خود کے اس کا امر فرمایا ہے۔

اور وجہ اس کے اہتمام کی یہ ہے۔ کہ اپنی اصلاح کو تو ہر شخص ضروری سمجھتا ہے۔ اور دوسرے کی اصلاح کا کچھ ایسا اہتمام نہیں کرتا۔ اس لئے دوسرے کی اصلاح کے لئے زیادہ اس کے اہتمام کی ضرورت ہوئی اور اسی لئے آیت (کنتم خیر امة) میں اس کو اصلاح نفس سے پہلے ذکر کیا۔ تاکہ اپنی اصلاح کے بعد دوسرے کی اصلاح سے بے فکر نہ ہو جاویں۔

مدارج اصلاح

البتہ اصلاح غیر کے بقدر استطاعت مدارج ہیں۔ چنانچہ ایک درجہ یہ ہے کہ:۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْآ اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا۔

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ، اس درجہ کا حاصل اپنے خاص متعلقین کی اصلاح ہے۔

افسوس! اس باب میں بھی ہم سے کتنی کوتاہی ہورہی ہے۔ خود تو نماز پڑھ بھی لیتے ہیں۔ مگر کبھی بیوی بچوں کو، نوکروں اور متعلقین کو نہیں کہتے۔ بچے اگر امتحان میں فیل ہو جائیں تو رنج ہوتا ہے۔ مگر نماز قضا کردیں تو کچھ بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ سات برس کے بچے کو نماز پڑھنے کا حکم دو اور دس برس کے بچے کو اگر کہنے سے نہ پڑھے تو مار کے پڑھاؤ۔ اگر دس برس کا بچہ سرپرست کی غفلت سے بے نمازی ہوگا۔ تو اس کا سرپرست گنہگار ہوگا۔ تو اگر اصلاح غیر کی ضرورت نہ ہوتی۔ تو **قوا انفسکم و اهلیکم** میں اهلیکم کے کیا معنی ہوں گے۔

اور دوسرا درجہ یہ ہے:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.

کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جس کا کام صرف یہی ہو کہ لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ اس درجہ کا حاصل تبلیغ عام ہے اور ایک جگہ ہے۔ کہ:۔

وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر

اس میں بھی تخصیص نہیں اہل وعیال کی۔ یہ تو قرآن میں اس امر ونہی کی تاکید کی ہے۔

اسی طرح حدیث میں تاکید ہے۔ ارشاد ہے:۔

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ. (الصحیح للبخاری ۲:۶،۳:۱۹۶:۱، ۴:۶،۷:۳۴، ۴۱، ۹:۷۷)

یعنی ہر ایک تم میں سے نگہبان ہے اور ہر ایک سے تم میں سے اپنی رعیت کے بارے میں پوچھا جاوے گا۔ اس سے بھی معلوم ہوا۔ کہ دوسرے کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ اگر دوسرے کی اصلاح ضروری نہیں ہے۔ تو پھر آخر ان آیات اور احادیث کے کیا معنی ہیں۔ غرض یہ مسئلہ اتنا بدیہی ہے۔ کہ اب زیادہ تفصیل سے شرم آتی ہے۔

مسلمانوں کی بے حسی

مگر کیا کروں۔ اس وقت ایک واقعہ ایسا پیش آیا ہے۔ جس کی خبریں اخباروں میں آپ کو بھی معلوم ہیں۔ کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو دوسری قومیں مرتد بنا رہی ہیں۔ اس کے متعلق مجھے ایک آیت یاد آئی:

وَدُّوْ لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْ افَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْ افِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.

اس کے ترجمہ سے اس وقت کی حالت کا اندازہ کر کے آپ کو عبرت ہوگی۔ ترجمہ یہ ہے کہ کفار تو دل سے پسند کرتے ہیں۔ کہ تم بھی کافر ہو جاؤ۔ تاکہ سب برابر ہو جاویں۔ جیسے ایک کبڑے سے کسی نے پوچھا تھا۔ کہ تو اپنا اچھا ہونا چاہتا ہے یا دوسروں کو کبڑا ہونا۔ کہنے لگا۔ کہ دوسروں کا کبڑا ہونا۔ تاکہ میں بھی تو دوسروں کو اس نظر سے دیکھ لوں۔ جس نظر سے لوگوں نے مجھ کو دیکھا ہے۔ تو کفار تو یہ چاہتے ہیں۔ کہ تم سب انہی کے برابر ہو جاؤ۔

آگے مسلمانوں کو ارشاد ہے۔ کہ:۔

فَلَا تَتَّخِذُ وْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآء

ان سے دوستی اور اتحاد مت کرو۔ کیوں کہ جب ان کی یہ حالت ہے۔ کہ وہ دل سے تمہارا کافر بننا پسند کرتے ہیں۔ تو لامحالہ وہ تم سے مل کے اسی کی کوشش کریں گے۔ افسوس! مسلمانوں کو تو ان سے ملتے ہوئے اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا۔ کہ ان کو مسلمان بنا دیں اور وہ دل میں ہر وقت یہی خیال رکھتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کو کافر بنا دیں۔

صاحبو! برائے خدا تم ان سے دوستی اور اتحاد مت کرو۔ ہاں تھوڑی سی اتنی رعایت کر دیا کرو۔ کہ وہ تمہارے اخلاق کے گرویدہ ہو کر اسلام کا اثر قبول کریں۔ مگر افسوس۔ کہ وہ تو رات دن اس کوشش میں منہمک ہیں۔ کہ پرانے مسلمانوں کو بھی کافر بنا دیں۔ اور ہمیں اس کی پرواہ بھی نہیں۔ کہ ہمارے جو بھائی پہلے سے مسلمان ہیں۔ ان کو ہی اسلام کے اندر رکھنے کی کوشش کریں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی جانفشانی

صحابہ رضی اللہ عنہم نے تو کس جانفشانی سے اسلام پھیلایا تھا۔ آج ہم اپنی غفلت سے اسے مٹا رہے ہیں۔ بعض اہل کفر کا مسلمانوں پر یہ بھی اعتراض ہے۔ کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ اب ہمارا زور ہے۔ ہم اس زور سے کام لے رہیں ہیں۔ مگر یہ بالکل ہی غلط ہے۔ دراصل شمشیر کا استعمال مزاحمت کے روکنے اور مدافعت کے واسطے تھا۔ یعنی حفاظت اسلام کے لئے تھا نہ کہ اشاعت اسلام کے لئے۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے اس کا خوب ہی جواب دیا ہے کہ بزور شمشیر اسلام پھیلانے کے لئے شمشیر زنوں کی بھی تو ضرورت ہے۔ تو وہ شمشیر زن کس شمشیر کے زور سے جمع ہوئے۔ جنہوں نے بزور شمشیر اسلام پھیلایا۔

دراصل اسلام پھیلا ہے اخلاق سے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اخلاق سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے۔ چنانچہ سیر و تاریخ اس پر شاہد ہیں۔ اگر ہم بھی ویسے ہی پکے مسلمان ہو جاویں۔ تو سچ جانیئے کفار ہمیں بھی دیکھ دیکھ کر مسلمان ہونے لگیں۔ مگر اب تو ہمارے اخلاق اس درجہ گر گئے ہیں۔ کہ انہیں مثال میں پیش کر کے کفار کو نفرت دلائی جاتی ہے۔

ایک شخص نے کسی کافر سے کہا تھا۔ کہ مسلمان ہو جا۔ اس نے کہا کہ میں ایسا مسلمان تو ہو نہیں سکتا۔ جیسے بایزید ہیں۔ کیوں کہ اس پر قدرت نہیں اور ایسا مسلمان ہونا جیسے تم ہو۔ میں پسند نہیں کرتا۔ اس سے تو میں کافر ہی اچھا۔

ہماری اخلاقی پستی

صاحبو! اس کافر کا یہ کہنا تو بالکل ہی لغو ہے۔ کافر تو کسی طرح مسلمان سے اچھا ہو ہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ ظالم مسلمان رحم دل کافر سے بھی بدرجہا یقیناً بہتر ہے اور رحم دل کافر کو ظالم مسلمان سے بہتر وہی کہے گا۔ جسے دنیا کا بھی قانون معلوم نہیں۔ میں کہتا ہوں۔ کہ فرض کرو۔ ایک شخص اعلیٰ درجہ کا ڈگری یافتہ ہے اور نہایت مہذب ہے۔ مگر ہے حکومت کا باغی اور ایک جاہل جرائم پیشہ اور چور ہے۔ کہ سزا بھی پاتا ہے اور پکڑا بھی جاتا ہے۔ مگر حکومت کا باغی نہیں۔ بلکہ مطیع و فرمانبردار ہے۔ میں اہل تمدن سے پوچھتا ہوں۔ کہ بتلائیں قانون کے

اعتبار سے اور گورنمنٹ کی نظر میں کون شخص بڑھا ہوا ہے اور کون گھٹا ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ جاہل ہے گو اس میں سارے عیب ہیں۔ مگر ایک وصف فرمانبرداری اس میں ایسا ہے۔ کہ تھوڑے دنوں میں وہ سزا کے بعد پھر ویسا کا ویسا ہی مقبول و مقرب ہو جاوے گا۔ جیسا کہ جرم سے پہلے تھا اور یہ تعلیم یافتہ جس میں ہزاروں خوبیاں ہیں۔ بغاوت کی وجہ سے ہیچ در ہیچ ہے۔ کیونکہ یہ ایسا عیب ہے کہ سب خوبیاں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اسی لئے یہ ہمیشہ مبغوض اور معتوب رہے گا۔ پس یہی فرق ظالم مسلمان اور رحم دل کافر میں خدا کے نزدیک ہے۔ تو اب اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر ایسا کہے۔ کہ ظالم مسلمان سے رحم دل کافر اچھا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو حق نہیں سمجھتا۔

حیرت کی بات ہے۔ کہ اسلام کو حق سمجھنے کے بعد یہ شبہ کرے۔ کہ مسلمان سے کافر افضل ہو سکتا ہے۔ بہرحال جب یہ مسلمان خدا کے نزدیک افضل ہے۔ تو اس کافر کی یہ غلطی تھی۔ جو اس نے اپنے کفر کو اس کے اسلام پر ترجیح دی۔ مگر میں یہ کہتا ہوں۔ کہ ہماری حالت ایسی کیوں ہے۔ کہ دوسرا شخص ہمارے متعلق زبان پر یہ حرف لا سکے۔ غرض ہماری حالت ایسی گری ہوئی ہے۔ کہ کفار بھی ہم پر طعن کرتے ہیں۔

تقلید یورپ

چنانچہ اس حالت کا حاصل یہ ہے۔ کہ اگر اخلاق بھی سیکھیں گے۔ تو وہ بھی کفار سے لئے ہوئے۔ جیسے حریت، مساوات، ایثار، ہمدردی، یہ سب الفاظ یورپ ہی سے سیکھے ہیں۔ باقی جو دراصل ہمارے اخلاق ہیں ان کی تو گویا ضرورت ہی نہیں۔ کہ داڑھی رکھیں۔ نماز پڑھیں۔ روزہ رکھیں۔ استطاعت ہو۔ تو زکوٰۃ دیں اور حج کریں اور معاملات و معاشرات کو درست کریں۔

اس پر مجھے اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر یاد آیا۔ جو اس واقعہ پر کہا گیا ہے۔ کہ جب انگریزی پڑھنے کو منع کیا گیا تھا۔ کہ واہ اس میں تو اسلام کی شان بڑھے گی۔ کہ مسجد کے دروازے پر جج اور کلکٹر دکھائی دیں گے۔ حالانکہ یہ سب حساب شیخ چلی کا سا تھا۔ جس کو ایک بقال نے مزدوری پر گھی کا گھڑا سپرد کیا۔ اب وہ گھڑا سر پر رکھ کر اس کے ساتھ ہو لئے اور یہ سوچنے لگے۔ کہ مزدوری کا پیسہ ملے گا تو اس سے ایک انڈا خریدوں گا اور کسی کی مرغی کے

نیچے رکھ دوں گا۔ اس سے بچہ نکلے گا۔ پھر اس سے انڈے حاصل ہوں گے۔ پھر اس کو ان انڈوں پر بٹھادوں گا۔ تو بہت سے بچے نکلیں گے۔ تین چار بار ایسا ہی کروں گا جب زیادہ ہو جاویں گے۔ تو سب کو بیچ کر بکریاں خریدوں گا۔ پھر گھوڑا۔ پھر ہاتھی لوں گا اور پھر شادی کروں گا اور بچے ہوں گے جب بچہ پیسہ مانگے گا۔ تو میں کہوں گا ہشت۔ آخر کا فقرہ آپ نے اتنے زور سے سوچا کہ گردن کو جھٹکا لگا اور گھی کا گھڑا سر سے گر گیا۔

مالک نے کہا یہ کیا کیا؟

آپ کہتے ہیں۔ میاں جاؤ بھی میرا تو سارا کنبہ تباہ ہو گیا۔ تمہیں اتنے سے گھی کی پڑی ہے۔ تو بہر حال اسی طرح انگریزی سے انہوں نے حساب لگایا تھا۔ مگر نتیجہ یہ نکلا۔ کہ اسلام سے اور بعد ہو گیا۔ سو اس معنی میں انہوں نے یہ شعر کہا ہے۔ ؎

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس کی کیا ہے۔ کوئی جنٹ کوئی جج ہے

غرض یہ سب یورپ کی تقلید ہے۔ کہ ایثار۔ ہمدردی۔ مساوات وغیرہ الفاظ یاد کر لئے اور وہ بھی محض نقل ہی نقل ہے۔ ان جیسے وہ بھی نہیں۔ اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور داڑھی کی تو کچھ فکر ہی نہیں ہے۔

اے صاحب! اسلام پر اسلام کے طور سے نظر کرو۔ واللہ اگر ہم ویسے ہی مسلمان ہوتے۔ جیسا اسلام چاہتا ہے۔ تو ہمارے اقوال، افعال اور احوال ہی کفار کے لئے ہادی ہو جاتے اور اگر ہادی نہ بھی ہوتے۔ تو کم از کم ان کی عداوت تو ہم سے کم ہو جاتی۔ ہمارے اسلاف کے تو یہ کارنامے تھے۔ کہ غیر قومیں ان میں خود بخود جذب ہوتی تھیں۔ اگر تم غیر قوموں کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے۔ تو کم از کم اپنے بھائیوں کو تو ان میں جذب ہونے اور گرنے سے تھام لو۔ بس اب تو وہ حالت ہے۔ کہ ؎

اے آنکہ باقبال تو در عالم نیست　　　　گیرم کہ غمت نیست غم ما ہم نیست

ہم نے مانا کہ تمہیں غیر قوموں سے خود اپنا اندیشہ نہیں۔ مگر اپنے بھائیوں کا تو غم ہونا چاہیے۔ کہ غیر قومیں ان کو تباہ کر رہی ہیں۔

تبلیغ میں کوتاہی

اس معاملہ میں ایک بڑی کوتاہی یہ بھی معلوم ہوئی ۔ کہ برسوں سے حق بات اپنے بھائیوں تک پہنچائی ہی نہیں گئی۔ چنانچہ سننے میں آیا ہے۔ کہ جب مبلغین محلِ ارتداد میں پہنچے۔ تو ان لوگوں نے یہ کہا۔ کہ ہم نے دس بارہ برس میں آج عالم کی صورت دیکھی ہے۔ اگرچہ ہم ساری دنیا کی اصلاح کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی ہمیں چاہیے کہ جتنا ہم سے ہوسکے کوشش تو کریں۔ کیوں کہ اس کی ہم سے پوچھ ہوگی۔

اور کامیابی یا ناکامی پر ہمیں توجہ نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہم سے اس کی پوچھ نہیں ہوگی۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی چاہتے تھے۔ کہ دنیا میں ایک بھی کافر نہ رہے۔ اور حق تعالیٰ نے آپ کو خاص طور پر اسی کام کے لئے بھیجا بھی تھا۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا۔

مگر باوجود اس کے صاف فرما دیا گیا۔ کہ آپ سے یہ سوال نہیں ہوگا۔ کہ تمہارے زمانہ کے کچھ لوگ دوزخی کیوں ہوئے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔ کہ:

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ

شاید آپ (ان کفار کے پیچھے) اپنی جان کھپا دیں گے۔ اور ایک جگہ فرمایا:۔

لَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ۔

حاصل یہ کہ آپ ان کے (ایمان نہ لانے پر) غمگین نہ ہوں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ گو آپ کا یہ فرض منصبی نہ تھا۔ کہ آپ اس قدر تبلیغ کوشش فرماویں۔ مگر آپ اپنی طبعی رحمت وشفقت کے تقاضے سے یہ چاہتے تھے۔ کہ ایک بھی دوزخی نہ رہے اور جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ تو آپ کو صدمہ ہوتا تھا۔ اس صدمہ کے دفعہ کرنے کے یہ ارشاد ہوا ہے۔ کہ آپ اس کی کچھ فکر نہ کریں۔ نہ آپ اپنی جان کھپائیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا

اگر آپ کا رب چاہتا تو سب کو ہدایت ہو جاتی۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ.

کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر سکتے ہیں؟ استفہام انکار کے لئے ہے۔ یعنی آپ کا کام کوشش کرنا ہے اور کوشش پر پھر خدا جسے توفیق دے گا ایمان لے آوے گا۔ آپ مجبور کیوں کرتے ہیں۔ کوئی شخص بغیر خدا کے حکم کے مومن نہیں ہو سکتا۔

ثمرۂ تبلیغ

اس سے معلوم ہوا۔ کہ کوشش کے معنی یہ نہیں۔ کہ ثمرہ ضرور مرتب ہو۔ مثلاً مرتدین کو تبلیغ کریں تو وہ ارتداد سے بچ ہی جاویں۔ بلکہ کوشش کے معنی یہ ہیں۔ کہ جو کام تمہارے قبضہ میں ہے وہ کر ڈالو۔ ان کو سمجھاؤ بجھاؤ۔ اسلام کے محاسن بتلاؤ۔ بس اس طرح کوشش کرو۔ اگر خدا نخواستہ پھر بھی ناکامی ہو تو رنج مت کرو۔ کیونکہ تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے۔

یہ بھی ایک مرض ہے۔ نفس کا۔ کہ اس کو اپنی بات کا رائیگاں جانا ناگوار ہوتا ہے۔ اس وقت میں اسی کا علاج کر رہا ہوں اور ان آیتوں کا حاصل بھی یہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ کوشش کے اعتبار سے تین حالتیں ہیں۔

ایک تو یہ کہ کوشش ہی نہ کرے۔ ایک یہ کہ ایسی کوشش کرے کہ اگر ناکامی ہو تو گھل گھل کے جان دے دے۔ یہ دونوں درجے غیر محمود اور ناپسندیدہ ہیں۔ اس میں دو راز ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے کے فعل پر قدرت نہیں۔ اس پر رنجیدہ ہونے کے یہ معنی ہوئے۔ کہ یہ ہمارے قبضہ کی بات تھی۔ مگر نہیں ہوئی۔

اور دوسرا امر ذرا باریک ہے۔ وہ یہ کہ بتاؤ۔ کہ دین کس کا ہے۔ خدا کا تو اس کی حفاظت خدا کا وعدہ ہے۔ پھر تمہارے رنج کا منشاء یہ ہے۔ کہ اگر ناکامی کی یہی رفتار رہی۔ تو خدا نخواستہ ایک دن اسلام مٹ جاوے گا اور وعدہ صحیح نہ رہیگا۔ تو یہ منشاء ہی غلط ہے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم کو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ پر اعتماد نہیں رہا۔ یاد رکھو کہ کہ یہ کبھی مٹ نہیں سکتا۔ کیوں کہ اس کے محافظ تو خود وہ ہیں۔ جو تمہارے بھی محافظ ہیں۔

اب شاید یہ کہو گے۔ کہ پھر ہمیں کوشش کرنے کو کیوں کہا گیا۔ سو اس لئے کہا گیا۔ تا کہ

تم کو ثواب ہو اور اجر ملے۔ تمہارا تعلق دین سے ظاہر ہو۔ محبت کے آثار نمایاں ہوں۔ یہ تو ان کی کمال عنایت ورحمت ہے۔ کہ انہوں نے تمہارے ثواب کے لئے ایک بہانہ بتلا دیا ہے۔ باقی ثمرہ تو ان ہی کا تصرف ہے۔

کارِ زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے برآہوئے چین بستہ اند

(مشک افشانی دراصل تیری زلفوں کا کام ہے لیکن عشاق نے مصلحۃً چین کے ہرنوں پر الزام لگا دیا ہے)

بس تمہاری نیک نامی کے واسطے بظاہر تمہارے متعلق یہ کام کر دیا ہے۔ کہ تم ذرا سی کوشش کر کے مقبول ہو جاؤ گے۔ ورنہ کام تو وہ خود کرتے ہیں۔ وہی محافظ ہیں۔ اس لئے غم کبھی نہیں کرنا چاہیے۔

اور ان دو رازوں کے علاوہ تیسری خرابی اس کاوش میں یہ ہے کہ اس غم کی وجہ سے طبیعت سست ہو جاتی ہے اور اس سے رفتہ رفتہ کوشش سے معطل و بے کار ہو جاتا ہے۔ تو جو منشاء تھا غم کا یعنی ناکامی۔ وہ اور اچھی طرح واقع ہوتی ہے اور شریعت کا مقتضا یہ ہے۔ کہ مسلمان سست نہ ہونے پاویں۔ اس لئے زیادہ رنج مناسب نہیں اور گو رنج کے موقع پر رنج کو منع کرنے سے ظاہر میں شبہ ہوتا ہے۔ کہ یہ تو شفقت کی کمی کی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ مگر راز اس میں یہ ہے کہ جب ایسی چیزوں کا غم کرو گے۔ جو تمہارے قبضہ میں نہیں ہیں۔ تو خواہ مخواہ سست ہو جاؤ گے۔ اور اس سے اصل کام میں خلل واقع ہوگا۔ تو خلل کو گوارا کرنا یہ ہے۔ شفقت کی کمی اور کام جاری رکھنا تو عین شفقت ہے۔ غرض اعتدال کے ساتھ کام کئے جاؤ۔

تبلیغ میں اعتدال

اس کام کو اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ۔

سبحان اللہ کام بھی بتلا دیا اور کام کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ کہ لوگوں کو خوبصورتی اور نرمی ولطافت سے اللہ کی سبیل کی طرف بلاؤ اور راہِ راست پر لاؤ۔ یہ ہے وہ کام جو بذریعہ وعظ کے

یا مکاتب و مدارس کے ذریعہ سے ہونا چاہیے۔ یعنی مبلغین ان ناواقف مسلمانوں کو اسلام کے محاسن اور احکام جا کر سنائیں اور رفتہ رفتہ کچھ مکاتب و مدارس وہاں قائم کر دیئے جاویں۔ ان میں سے جو طریقہ زیادہ مفید معلوم ہو۔ اسے اختیار کرنا چاہیے۔ بس یہ تو ہمارا کام ہے۔ اسے پورا کرنے کے بعد نتیجہ خدا کے سپرد کر دو۔ ناکامی کے متعلق تو کہہ چکا اب کامیابی کے متعلق بھی کہتا ہوں۔ کہ اگر خوش قسمتی سے کامیاب ہو جاؤ۔ تو نازمت کرو۔ جیسے ہم سے یہ غلطی بھی ہوتی ہے اور اس وقت ہماری حالت اس شعر کا مصداق ہوتی ہے۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یعنی ہماری جو حالت ہے۔ وہ اعتدال سے باہر ہے۔ نہ ناکامی میں حدود پر رہتے ہیں نہ کامیابی میں۔ پس سنیئے کہ قرآن مجید میں مطلق کامیابی کے متعلق دو ارشاد ہیں:۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا.

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا کے فضل پر خوش ہونا چاہیے او[illegible]ک جگہ یہ ارشاد ہے:۔

لَاتَفْرَحْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ.

بہت مت خوش ہو۔ خدا پسند نہیں کرتا زیادہ خوش ہونے والوں کو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خوش نہ ہونا چاہیے۔ پس ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔ مگر دراصل ان میں تعارض نہیں۔ بلکہ یہ دونوں حالتیں جدا جدا ہیں۔ جن کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے۔ ایک خوشی اضطراری ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تمہاری ایک ہمیانی روپے یا اشرفیوں کی کھو گئی ہے۔ جس سے آپ بہت پریشان ہیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دق ہو چکے ہیں۔ کہیں پتہ نہیں چلتا۔ کہ دفعتہً کسی نے ہاتھ میں لا کر دے دی۔ ایک خوشی تو اس وقت ہے۔ یہ اضطراری اور بے اختیاری خوشی ہوگی اور ایک یہ صورت ہے۔ کہ ہمیانی گم ہونے پر تم نے نوکروں کو خوب مارا پیٹا۔ اب خدا جانے۔ وہ ان کو ملی یا نہیں۔ مگر بے چاروں نے ڈر کے مارے لا کر دے دی۔ ایک خوشی اس پر ہے۔ یہ اختیاری خوشی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلی خوشی جو آپکو ہوگی۔ وہ اترانے کی نہ ہوگی۔ بلکہ شکر کی ہوگی۔ کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ کھوئی ہوئی چیز مل گئی اور دوسری خوشی اترانے کی اور ناز و تکبر کی ہوگی۔ کہ دیکھا ہم نے کیسی اچھی تدبیر کی۔ ورنہ یہ

ہمیانی کیسے ملتی توان دونوں میں پہلی خوشی محمود ہے اور دوسری مذموم۔

اسی طرح تبلیغ کی کامیابی پر اضطراری خوشی کا تو مضائقہ نہیں۔ باقی اپنی تدابیر اور مساعی کو سوچ سوچ کر خوش ہونا۔ کہ ہم نے یوں کیا تو کیا اچھا اثر ہوا۔ یہ مذموم ہے۔ بہر حال ہم کو کوشش کرنی چاہیے اور نتیجہ کو خدا کے سپرد کرنا چاہیے اور ناکامی پر مغموم نہ ہونا چاہیے اور کامیابی پر اترانا نہیں چاہیے۔ کام شروع کر دو۔ اس کے سب راستے خود کھل جائیں گے۔ بقول مولانا رومیؒ ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید　　　خیرہ یوسف وارمی باید دوید

(اگرچہ قیود نفسانیہ سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے پھر بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح بھرپور کوشش کرنا چاہیے)

یعنی جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو قصر مسبع میں بند کیا تھا۔ تو اس وقت وہ زلیخا کے پاس سے بھاگے تھے۔ حالانکہ محل کے سات دروازے تھے اور ساتوں دروازوں میں زلیخا نے قفل ڈال دیئے تھے۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم تھا۔ مگر چونکہ نبی تھے۔ اس لئے آپ نے یہ سمجھا۔ کہ گو دروازے مقفل ہیں۔ مگر جتنا میرا کام ہے وہ تو میں کروں۔ کم از کم دروازہ تک تو بھاگوں۔ چنانچہ بھاگے، اب جس دروازہ کے پاس پہنچتے تھے۔ قفل خود بخود ٹوٹ کر گر پڑتا تھا۔ اسی طرح ساتوں دروازے کھل گئے اور یہ بچ گئے۔ مولانا اسی کو یاد دلاتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید　　　خیرہ یوسف وارمی باید دوید

(اگرچہ قیود نفسانیہ سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے پھر بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح بھرپور کوشش کرنا چاہیے)

تو بس تم بھی دوڑو اور یوں سمجھو۔ کہ نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اسی کے فضل سے سب کچھ ہوگا۔ پھر اگر کوشش کی اور تمہاری کوشش سے لوگ ارتداد سے بچ گئے۔ تو ناز مت کرنا۔ بلکہ شکر کرنا۔ غرض یہ دونوں درجے مطلوب نہیں۔ یعنی ایک یہ کہ کوشش ہی نہ کرے۔ دوسرا یہ کہ کوشش پر کامیابی کو لزوماً مرتب سمجھے۔ جیسے سودا نے ان لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے۔ جو خود بھی کام نہیں کرتے اور کام کرنے والوں کو یہ الزام دیتے ہیں۔ کہ میاں تم نے کیسا کام کیا۔ جو نتیجہ مفید نہ نکلا۔

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن | بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز | اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

تبلیغ بقدر استطاعت

مگر اس کوشش کے لئے ایک شرط بھی ہے۔ یعنی استطاعت۔ اور یہ سب کچھ میں ان ہی کے کاموں کے لئے بیان کررہا ہوں۔ جو اسباب ظاہرہ کی رو سے اپنی قدرت میں ہوں۔ یہ سب کوشش اور کوشش پر اجر اور دوسرے احکام ایسے ہی کاموں کے لئے ہیں۔

اور ایک وہ کام ہیں۔ جو اسباب ظاہرہ کی رو سے اپنی قدرت واستطاعت سے باہر ہیں۔ ان کے لئے کوشش کرنا فضول ہے۔ نہ مامور بہ اور نہ ایسی کوشش پر کچھ اجر۔ مثلاً کوئی شخص سورج کو قبضہ میں کرنے کے لئے آسمان کی طرف ہر روز کودا کرے۔ اور یہ سمجھے۔ کہ اگر کبھی گر کے مروں گا۔ تو شہید مروں گا۔ تو یہ محض خبط ہے۔ کیونکہ یہ فعل اس کی قدرت واستطاعت سے باہر ہے۔ اس لئے اس پر بجائے اجر کے باز پرس ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے۔ کہ:

لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسهٗ. (سنن الترمذی: ۲۲۵۴ ، سنن ابن ماجۃ: ۴۰۱۶)

یعنی مومن کو مناسب نہیں۔ کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے۔ صحابہ رضی اللہ عنھم نے پوچھا۔ یارسول اللہ۔ مومن اپنے کو کس طرح ذلیل کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یتحمل من البلاء لما لا یطیقه

ایسی بلا اپنے ذمہ لے لے جس کے تحمل کی طاقت نہیں ہے۔

اب میں پوچھتا ہوں۔ کہ جہاں جہاں یہ خطرۂ ارتداد رونما ہے۔ کوشش سے پہلے یہ دیکھئے۔ کہ وہاں جانا اور تبلیغ کرنا حساً وقانوناً آپ کی قدرت میں ہے یا نہیں۔ اسی طرح یہ بھی دیکھو۔ کہ اس میں چندہ دینا حساً یا قانوناً کوئی جرم تو نہیں۔ جب ان باتوں کا اطمینان ہوجاوے تو پھر یہ متعارف تدبیریں اختیار کرنی چاہیں اور اس کے بعد نتیجہ سے کچھ بحث نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ دوسرے کا فعل ہے۔ اور قادر بقدرت غیر قادر نہیں ہوتا۔ ایسی غیر مقدور چیز کے پیچھے پڑنا محض غلو ہے جس کی اسلام کو حاجت نہیں۔ اب تو دو چار ہزار کے ارتداد کی خبر ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ اگر پندرہ بیس لاکھ بھی خدانخواستہ مرتد ہوجاویں تو اسلام میں کچھ کمی نہیں آسکتی۔

چراغے را کہ ایزد برفروزد ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

(جس چراغ کو اللہ تعالیٰ روشن کرے، جو اس کو بجھانا چاہے اس کی ڈاڑھی جل جائے)

سعی تبلیغ پر شبہ

اگر کوئی کوشش کے متعلق یہ کہے۔ کہ جب اللہ میاں ہی دین کی حفاظت کریں گے۔ تو ہمیں کوشش کرنے کی کیا ضرورت؟ ہاں تو پھر قرآن بھی حفظ مت کیا کرو۔ کیونکہ انہوں نے اس کی حفاظت کا تو خاص طور پر وعدہ کیا ہے۔ اللہ میاں کی حفاظت کا مطلب یہی تو ہے۔ کہ ہمیں حفظ کرنے کا حکم دیا ہے۔ تو ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔ پس یہ سب حفاظت میں داخل ہے۔

اس حفظ کرنے پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ بعض فرقوں کو حفظ قرآن کی توفیق نہیں ہوتی۔ ان میں سے کان پور میں ایک شخص کا یہ مقولہ سنا تھا۔ کہ ہم اس واسطے قرآن حفظ نہیں کرتے۔ تاکہ ہم اور اللہ میاں برابر نہ ہو جائیں۔ کیوں کہ وہ بھی حافظ ہیں اور اگر ہم بھی حافظ ہو جاتے تو نعوذ باللہ ان کے برابر ہو جاتے۔

میں نے کہا کہ وہ تمہارا ہی خدا ہوگا۔ جس کے برابر ہر حافظ ہو سکے۔ ہمارے خدا کے برابر تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ چاہے کوئی کتنا ہی کمال حاصل کرلے۔ پھر اگر اس خیال سے حفظ قرآن ترک کیا گیا ہے۔ تو علم کو بھی ترک کیا ہوتا۔ تاکہ مساوات لازم نہ آوے۔ کیوں کہ ہم جاہل ہیں اور اللہ میاں عالم۔ تو ہم علم حاصل نہ کریں۔ تاکہ ان کی برابری لازم نہ آئے۔ مہمل اور لغو باتیں۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے۔ کہ نعوذ باللہ اللہ میاں ہمارے بڑا بنانے سے بڑے بنے ہوئے ہیں۔

بلکہ حق تعالیٰ کی اس صفت پر نظر کر کے تو اور زیادہ حفظ کا اہتمام کرنا چاہیے۔ تاکہ تخلق باخلاق الٰہیہ نصیب ہو۔ چنانچہ اللہ میاں نے اپنی تقلید و اتباع کا بعض افعال میں حکم بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

یعنی اللہ اور اس کے فرشتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ پس اے مومنو! تم بھی درود بھیجو۔ اب یہاں کہو کیا کہتے ہو۔ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو۔ کہ جب اللہ میاں درود بھیجتے ہیں۔

توہم کیوں بھیجیں۔اس میں تو برابری ہوگی۔ بلکہ یہی کہو گے۔کہ اب تو ہمیں اور زیادہ صلوٰۃ وسلام کا ورد کرنا چاہیے۔جب اللہ میاں آپ کی اتنی عظمت ظاہر فرماتے ہیں۔تو ہم کس شمار میں ہیں۔

اس پر مجھے وطن کا اپنے بچپن کا ایک قصہ یاد آیا۔کہ ہمارے والد باوجود ثروت ودولت کے منکسر المزاج بہت تھے۔ایک مرتبہ برسات کے موسم میں کھرپا لے کر وہ خود ہی چھت پر گھاس چھیلنے کو جانے لگے اور مجھ سے فرمایا تم بھی چلو۔تائی صاحبہ نے فرمایا۔جوان بیٹے سے ایسا کام نہیں لیا کرتے۔انہوں نے مان لیا اور تنہا خود چھت پر چڑھ گئے۔اس وقت تائی صاحبہ نے کہا کہ جب تمہارے والد گھاس چھیلنے گئے ہیں تو اب تمہیں بھی ضرور جانا چاہیے۔تو اسی طرح یہاں سمجھو۔کہ محافظت اسلام کا کام جب اللہ میاں خود کرتے ہیں۔تو بندہ کو ضرور کرنا چاہیے۔اور اگر اس شخص کی بے ہودہ بات مان لی جائے۔تو یہ لازم آوے گا۔کہ کوئی اچھی بات نہ کریں۔کیوں کہ وہ تو اللہ میاں بھی کرتے ہیں۔بس سب برائیاں ہی برائیاں کرنی چاہئیں۔کیونکہ وہ اللہ میاں نہیں کرتے۔نعوذ باللہ خدا کی پناہ ہے ایسی جہالت سے۔بس یہ بندہ کو سمجھنا چاہیے۔کہ جب ہمارا کام وہ خود بھی کرتے ہیں۔تو ہم خود کیوں نہیں کریں۔مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم نہ کریں گے تو یہ کام اٹکا پڑا رہے گا۔ہرگز نہیں۔وہ فرماتے ہیں:۔

وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ.

یعنی اگر تم اسلام کی حفاظت وخدمت نہ کرو گے۔تو وہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو قائم کر دیں گے۔جو تمہاری سی (نافرمان) نہ ہوگی۔نعوذ باللہ حق تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں۔

اجتماعی تبلیغ کی ضرورت

باقی اس عالم امتحان میں ان کی عادت یہ ہے۔کہ وہ ہمارے کام کسی ظاہری واسطہ سے کیا کرتے ہیں اور یہ ہماری سعادت ہے۔کہ ہم ان کاموں کا واسطہ بنیں۔بہرحال اس وقت یہ قصے اسلام کے مٹانے کے دوسری قوموں کی طرف سے پیش آرہے ہیں۔جس کی سب مسلمانوں کو مجتمع ہو کر مدافعت کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہاں کانپور میں بھی چند باحمیت مسلمانوں نے اس کام کا ارادہ کیا ہے۔مگر اس کے لئے سامان وسرمایہ کی ضرورت ہے۔تاکہ مبلغین اس سرمایہ سے وہاں جاویں اور اسلام سے

اعدائے دین کی تہمتوں کو ہٹا دیں اور چونکہ اس قسم کے کام میں عادۃ اللہ یہ ہے۔ کہ اکثر غرباء ہی کے ہاتھوں کی برکت سے انجام پاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اگر چندہ کیا جاوے۔ تو اس میں ان کو بھی شریک کریں۔

نیز جو لوگ خود جا کر تبلیغ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے پیسے ہی کو اپنا قائم مقام کر دیں اور اس میں قلیل و کثیر سے مت شرماؤ۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی دیکھ بھال نہیں ہے۔ کس کے روپے زیادہ ہیں۔ وہاں تو نیت اور خلوص کی دیکھ بھال ہے۔ ممکن ہے۔ کہ تمہارے خلوص کی بدولت ایسی کامیابی ہو جاوے۔ کہ آئندہ اس کوشش ہی کی ضرورت نہ رہے۔ مگر میرے نزدیک یہ کام اتنا ضروری ہے کہ بطور حفظ ماتقدم کے اسے ہمیشہ جاری رکھنا چاہیے۔ کیونکہ مسلمانوں میں بعض جگہ اس قدر جہالت بڑھی ہوئی ہے۔ کہ مردے تک بلا نماز جنازہ کے دفن کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایسے نام کے مسلمان نہیں ہوتے۔ جیسے یہ لوگ ہیں۔ جن میں ارتداد کا اندیشہ ہے تاہم احکام کی تبلیغ اور تعلیم نہ ہونے سے انہیں بھی کچھ خبر نہیں۔

مجھے نام کے مسلمانوں پر یہیں نواح کانپور میں موضع گجنیر کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میں نے وہاں جا کر خود دیکھا۔ کہ وہ برائے نام ہی مسلمان ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا۔ کہ میاں تم کون لوگ ہو۔ مسلمان ہو۔ کہنے لگے۔ ہم کیوں ہوتے مسلمان۔ میں نے کہا۔ اچھا تو ہندو ہو۔ کہنے لگے۔ ہم کیوں ہندو ہوتے۔

از مذہب من گبرو مسلماں گلہ دارد

(میرے دین سے گبر و مسلمان گلہ رکھتا ہے)

میں نے کہا۔ آخر پھر کیا ہو۔ کہنے لگے ہم نو مسلم ہیں۔ گویا ان کے خیال میں نو مسلم ہندو اور مسلمان کے درمیان میں تیسری قسم ہے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ وہاں کے زمیندار سے ملے اور انہیں شربت دیا گیا تو نہیں پیا۔ کہ مسلمان کے ہاتھ کا شربت پینے میں ہم اپنی برادری میں بدنام ہو جاویں گے۔

ایک مرتبہ ایک مبلغ کو وہاں ایک گاؤں میں بھیجا۔ چونکہ ان لوگوں سے روٹی تک دینے کی امید نہ تھی۔ اس لئے ان مبلغ سے کہا گیا۔ کہ بھئی! ستو باندھ کر لے جاؤ۔ تو ان

لوگوں نے ستو گھولنے کے لئے اپنے برتن تک نہ دیئے۔ان بے چاروں نے رومال پر ستو رکھ کراس پر پانی چھڑک کرتب کھایا۔

اور دراصل یہ ہماری کوتاہی ہے۔کہ ہم لوگوں کو نومسلموں کی تعلیم کا اہتمام ہی نہیں ہے۔شہروں میں مدرسے بھی ہیں۔یتیم خانے بھی ہیں۔سب کچھ ہے۔مگر کوئی نومسلم خانہ نہیں ہے۔اگر کبھی کسی کو مسلمان بھی کیا تو بڑی بڑائی یہ کی کہ اسے ایک پرچہ پر لکھ کر دے دیا۔کہ جا بھئی! مانگ اور کھا۔اگر ایسا ہوتا۔کہ کم از کم چھ مہینے تو اس کو اپنے پاس رکھتے۔اور ضرورت عقائد اور ضروری اعمال نماز روزہ وغیرہ سکھاتے۔تو کیسا اچھا ہوتا۔مگر اس کا ذرا بھی اہتمام نہیں۔اب تو بس مسلمان بنا کر سانڈ کی طرح چھوڑ دیتے ہیں۔اسی طرح کے یہ لوگ بھی معلوم ہوتے ہیں۔کہ ان کو بھی کسی نے یوں ہی مسلمان بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ان کو بھی تعلیم و تلقین نہیں کی گئی اور نہ اس کے بعد پھر کوئی ان کا پرسان حال ہوا۔نہ کوئی واعظ ان کے پاس گیا۔کیونکہ ہم لوگوں کو جہاں پلاؤ قورمہ کی امید ہوتی ہے۔وہاں تو خوب دوڑ کر جاتے ہیں اور ایسی جگہ جہاں ستو گھول کے کھانا پڑے، جانے کی ہماری ہمت نہیں ہوتی۔

امیروں تک تبلیغ

بہر حال انتظام کے ساتھ ایک جماعت قائم کر کے وہاں ہم کو چاہیے اور کام کرنا چاہیے۔اگر یہ طریقہ تبلیغ و اشاعت کا ہندوستان میں جاری ہو جائے۔تو پھر اسے امریکہ اور یورپ تک وسعت دینی چاہیے اور وہاں بھی اپنے مبلغین بھیجنا چاہئیں۔مگر پہلے ہی دن بہت اونچے نہ اڑو۔اول ہندوستان کی تو خبر لو۔

بے عمل مبلغ

بہر حال یہ بہت ضروری کام ہے۔اب اس میں چند کوتاہیاں اور بھی ہوتی ہیں۔ان کا مختصر بیان کیا جاتا ہے۔ایک یہ کہ بسا اوقات جو مبلغ ہوتے ہیں۔خود ان کی حالت درست نہیں ہوتی اور اس سے بھی بڑے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔کیوں کہ جب استاد ہی ناقص ہوگا۔تو شاگرد تو اور بھی انقص ہوگا۔تو سب سے پہلے مبلغ کو اپنے عمل کی اصلاح ضروری

ہے۔تا کہ ان پر اثر اچھا پڑے۔ یہ خطا تو اہل علم ہی کی تھی۔

عوام کی غلطی

اب ایک خطا اور کوتاہی عوام کی ہے۔اور وہ یہ کہ ان کا کام سرمایہ جمع کرنا تھا۔ پھر مولوی اس سرمایہ سے سفر کرتے اور پھر چونکہ ان کے ساتھ اپنی ضروریات بھی تھیں۔مثلاً وہاں تبلیغ کے لئے جائیں۔تو اپنے پیٹ کو کہاں رکھ کر آویں۔ بیوی بچوں کا کیا کریں۔اس لئے ضرورت تھی کہ سرمایہ سے ان کی مدد کی جاتی۔تا کہ یہ بے فکری سے کام کرسکیں۔مگر عوام کو اس کا احساس ہی نہیں۔

ایک صاحب مجھ سے ملے اور کہنے لگے۔ارے صاحب! یہ ساری خطا مولویوں کی ہے۔کہ انہوں نے ان لوگوں کی کبھی خبر نہ لی۔ میں نے کہا پہلی تو تمہاری خطا ہے۔کہ تم نے سرمایہ جمع کر کے ان کو نہیں دیا۔آخر مولوی کام کریں تو بے چارے کہاں سے کریں۔اس میں سرمایہ ہی تو بلی کی میاؤں ہے۔لیکن عوام کے ساتھ اس میں تھوڑا سا قصور مبلغین کا بھی ہے۔وہ یہ کہ جہاں سرمایہ کا انتظام بھی ہوا ہے۔وہاں بے دریغ روپیہ اڑا ڈالتے ہیں۔مثلاً خود اپنے پیسے سے چاہے تھرڈ میں بھی سفر نہ کریں گے۔مگر چندہ کا پیسہ ایسا مفت کا ہے۔کہ اب سیکنڈ سے کم میں نہیں بیٹھ سکتے۔

چندے میں احتیاط

بہرحال ان سب کوتاہیوں سے احتیاط کر کے سرمایہ ضرور جمع کرو۔سرمایہ ہی اصلی چیز ہے۔ بدوں اس کے نری تجویزیں ایسی بے کار ہیں۔ جیسے ایک دفعہ بہت سے چوہے جمع ہوئے۔ انہوں نے سوچنا شروع کیا۔کہ کوئی ایسی تجویز ہوسکتی ہے۔کہ بلی کو پکڑ لیں۔کیوں کہ یہ ہم کو بہت جانی نقصان پہنچاتی ہے۔چنانچہ مشورہ ہونے لگا۔انہوں نے کہا کہ سب مل کے ایک ایک عضو کو پکڑ لینا۔ایک نے کہا۔ میں ہاتھ پکڑ لوں گا۔ایک بولا میں ٹانگ پکڑ لوں گا۔کسی نے گردن پکڑنے کو کہا۔وعلیٰ ہذا وہاں ایک بڈھا چوہا بھی تھا۔وہ کچھ نہیں بولا۔جب اس سے پوچھا گیا۔کہ تم کیوں نہیں بولتے اس نے کہا کہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سب کچھ تم پکڑو گے۔مگر اس کی میاؤں کو کون پکڑے گا۔جس وقت وہ میاؤں کرے گی۔سب بھاگ جاؤ گے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایک اور قصہ ہے۔کہ ایک قصائی مر گیا تھا۔اس کی بیوی برادری کے سامنے اپنے

خاوند کو یاد کر کے رونے لگی۔ کہ ہائے اب اس کی دکان کو کون چلائے گا۔ تو ایک صاحب بولے میں چالوؤں گا۔ ہائے اس کے کپڑے کون پہنے گا۔ وہی بولا میں پہنوں گا۔ کہا ہائے اس کی چھریاں کون لے گا۔ وہ بولا میں لوں گا۔ اس نے کہا ہائے اس کا قرضہ کون ادا کرے گا۔ تو کہنے لگا۔ بولو بھئی۔ اب کس کی باری ہے۔ کیا سب کام میں اکیلا ہی کروں۔

اور نیز مثال ہے۔ کہ دو رفیق کسی سفر میں ہمراہ ہوئے کسی منزل پر ٹھہرے۔ تو ایک رفیق نے کہا بھئی! کنویں سے پانی میں بھروں۔ لکڑی تم جنگل سے لے آؤ۔ اس نے کہا۔ بھئی مجھ سے کچھ نہ ہوگا۔ خیر اس نے خود ہی دونوں کام کر لئے۔ اب کہا۔ مسالہ تم پیس لو۔ کھانا میں پکاؤں گا۔ کہنے لگا یہ بھی مجھ سے نہ ہوگا۔ اس نے یہ بھی کر لیا۔ اب جب کھانا پک گیا تو اس نے کہا۔ اچھا آؤ کھا تو لو۔ کہنے لگے اب ہر بات میں تمہاری کہاں تک مخالفت کروں۔ لاؤں کھا تو لوں۔ تو ایسے ہی جنٹلمین بھی چاہتے ہیں۔ کہ سب کام تو مولوی کر لائیں اور یہ خالی حکومت کرنے کو بیٹھے رہے۔ دیکھو سارا کام سرمایہ کا ہے۔ اور سرمایہ جمع کرنا مولویوں کا کام نہیں۔ بلکہ اس شخص کا کام ہے جو پچاس روپے اپنے پاس سے دے۔ تب پانچ روپے چندہ کی تحریک دوسروں سے کریں۔ غرض مولویوں کا کام سرمایہ جمع کرنا نہیں۔ مولویوں کا کام وعظ کرنا ہے اور روساء کا کام ہے چندہ جمع کرنا۔ پھر دونوں مل کر کام میں لگیں۔ کام تو اسی طرح ہوتا ہے۔ باقی باتیں بنانا سب کو آتی ہیں۔ سب سے پہلے بڑے لوگوں کو سرمایہ جمع کرنے کے لئے اٹھنا چاہیے۔

لیکن ان کے چندہ جمع کرنے میں ایک اور مصیبت ہے وہ یہ کہ چندہ جمع کرنے کون گھٹے ہوئے منصف صاحب، جج صاحب، ڈپٹی کلکٹر صاحب، تحصیلدار صاحب، تھانہ دار صاحب، تو لوگ انہیں تو مارے ڈر کے چندہ دیں گے۔ کہ کہیں یہ عدالت میں کسر نہ نکالیں۔ مقدمہ نہ خراب کر دیں۔ کبھی یہ ہوتا ہے۔ کہ جتنا آزادی میں خوشی سے دیتے۔ اب ان کے دباؤ سے اس سے بہت زیادہ دیں گے۔ یاد رکھو۔ اس طرح سے چندہ لینا بالکل حرام ہے۔ مناسب یہ ہے کہ روساء میں جو اہل حکومت ہیں وہ چندہ نہ کریں۔ بلکہ ذی وجاہت لوگ جن کا حکومت میں بالکل دخل نہیں ہے۔ چندہ کریں۔ ہاں اگر ایسا ہو۔ کہ کوئی شخص ان اہل حکومت سے اتنا بے تکلف ہو کہ صاف انکار بھی کر سکے۔ تو ایسے لوگوں کا چندہ اہل حکومت بھی لے لیں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور ایک کوتاہی بعض مبلغین کی (جیسا اوپر مذکور ہوا اور

اب مکرر ایک اور مضمون کی تمہید کے لئے بیان کرتا ہوں) یہ ہے۔ کہ وہ چندہ میں اسراف بہت کرتے ہیں۔ سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں اور جو کام خط سے نکل سکتا ہے۔ اس کے لئے تار پر تار جا رہے ہیں۔ اسٹیشن پر برف لیمنڈ بھی پی رہے ہیں۔ چائے بسکٹ بھی اڑ رہا ہے۔ چاہے اپنے پاس سے ایک دفعہ بھی ایسے کاموں میں پیسہ خرچ نہ کرتے۔ مگر چندہ کا پیسہ ایسی بے دردی سے تباہ کرتے ہیں۔ واللہ مولویوں کی نسبت ایسے واقعات سن کر بہت رنج ہوتا ہے۔ کہ یا اللہ ان پر علم کا کیسا الٹا اثر ہوا۔ علماء کو اس سے بہت ہی احتراز کرنا چاہیے۔ یہ طریقے تو لیڈروں ہی کے واسطے چھوڑ دینے چاہئیں۔

اب اس پر ایک تفریع کرتا ہوں۔ کہ جب یہ معلوم ہو گیا۔ کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو چندہ کے روپے کا درد نہیں رکھتے۔ تو اب مسلمانوں کو دو کام اور بھی کرنا چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ یہ چندہ ایسے شخص کے پاس جمع کرنا چاہیے جس پر خیانت کا احتمال نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ چندہ کا صرف ایسے شخص کے مشورہ سے ہونا چاہیے۔ جو متقی اور عالم ہو۔ مسائل فقہیہ شرعیہ کا ماہر ہو۔ اور وہ ایسا ہو کہ سب اسی کے تابع ہوں۔ یہ بات اصول شرع واسلام سے ہے۔ کہ کام دراصل ایک ہی شخص کی رائے سے ہوتا ہے اور اپنی اعانت کے لئے وہ دوسروں کی بھی رائے لے لیتا ہے۔ اس مشورہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے۔ کہ معاملہ کے سب پہلو اسے مستحضر ہو جاتے ہیں۔ جب سب پہلو نظر میں آ جاویں۔ تو اس کا کام یہ ہے کہ ان میں سے جو پہلو خود انتخاب کرے۔ اسی کا حکم دے دے۔

یہ ہی طریق مشروع ومعقول ہے۔ مگر اب یہ حالت ہو رہی ہے کہ اگر کسی کام کے لئے انتخاب کریں گے تو اسے جو خود مالدار ہو اور اس کے ذریعہ سے چندہ خوب آ سکتا ہو۔ ایسے شخص کو چندہ جمع کرنے کے کام پر مقرر کرنا تو مضائقہ نہیں۔ مگر سارے کام اسی کے سپرد کر دینا خواہ وہ نرا جاہل ہی ہو حماقت اور بے وقوفی ہے۔ انتخاب اس شخص کا کرنا چاہیے جو طامع نہ ہو۔ کسی سے ڈرتا نہ ہو۔ عالم ہو۔ متقی ہو۔

سب سے بڑا کام

چنانچہ میں نے اس جماعت کو جو یہاں کام کرنے کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ یہی

رائے دی ہے۔اب ان میں آپس میں میرا یہ مشورہ پیش ہوگا۔پھر جیسا طے ہو عمل کیا جاوے گا۔لیکن جب تک کوئی مستقل تحویلدار منتخب ہو کام تو نہ بند رکھنا چاہیے۔اس کے متعلق میں نے یہ رائے پیش کی ہے۔کہ اس وقت تک کے لئے ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو تحویلدار مقرر کردیا جائے۔چنانچہ انہوں نے چندہ جمع کرنے کا اہتمام شروع کردیا ہے۔میں نے ان سے یہ بھی کہہ دیا ہے۔کہ رسیدیں بھی چھپوالی جائیں۔اور جب تک رسیدیں چھپ کر تیار نہ ہوں۔محصل چندہ سادہ کاغذ پر یادداشتلکھ کر اہل عطا کو دے دیا کرے اور کہہ دے کہ فلاں تاریخ تک باقاعدہ چھپی ہوئی رسیدیں آجائیں گی۔اس وقت آکر اسے بدل لے جانا۔یہ سب تو میری تمہارائے ہے اب یہاں کارکنوں کی جو مرضی ہو وہ کریں۔

پھر اس کے بعد جو کام جتنا جس سے ہو سکے وہ اس کام میں شرکت کرے۔اگر کسی کے پاس علم اور روپیہ بھی نہیں ہے۔تو زبان تو ہے اسی سے کام کرو۔یعنی لوگوں کو اس کام کی رغبت دلاؤ۔ ؎

لا خیل عندک تهديها ولا مالٗ   فليسعد النطق ا لم يسعد الحال

(تیرے پاس ہدیہ دینے کے لئے نہ گھوڑا ہے نہ مال پس تم زبان سے مدد کرو، اگر تم مال سے امداد نہیں کرسکتے)

غرض پہلے تو جان سے خدمت کرو۔یعنی وہاں جا کر تبلیغ کرو۔اگر یہ نہ کرسکو تو روپیہ پیسہ کو اپنا قائم مقام بنا کر مال سے خدمت کرو اگر اس کی بھی وسعت نہ ہو تو زبان سے خدمت کرو۔وہ یہ کہ اپنے اہل وسعت دوستوں اور عزیزوں سے کہو اگر ان سے بھی کہنے کی ہمت نہ ہو تو پھر اللہ میاں سے کہو۔یعنی دعا کرو کہ اے اللہ! مسلمانوں پر فضل فرمایئے۔اور اسلام کی نصرت فرمایئے۔حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کردیجئے۔اگرچہ میں نے یہ کام بتایا۔سب مضامین سے آخر میں ہے۔مگر ہے یہ سب سے بڑا۔

غلو فی التبلیغ

اور یہ نہ سمجھنا کہ جب یہ سب سے بڑا ہے۔تو پھر اس کے ہوتے ہوئے اور سب کام چھوڑ دیئے جاویں۔جیسا کہ بعض جوشیلے لوگ ایک ہی کی طرف چل دیتے ہیں۔سو میں کہتا

ہوں کہ اگر یہی بات ہے۔ تو جاہل ایک شاہ کی بات بھی ماننا پڑے گی۔ جو نماز نہ پڑھتے تھے اور دلیل میں یہ آیت پیش کرتے تھے۔

وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ. (اور اللہ کی یاد بڑی چیز ہے)

تو بس کہنے لگے۔ کہ اب ہم اللہ اللہ ہی کیا کریں گے۔ نہ نماز کی ضرورت رہی۔ نہ روزہ کی۔ میں نے کہا۔ کسی کام کے بڑا ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ اور چھوٹے کاموں سے پہلو تہی کرلو۔ دیکھو تمہارے تین بیٹوں میں سے ایک اگر زیادہ کام کا ہے۔ تو کیا دو کا گلا گھونٹ دو گے۔ ہرگز نہیں۔ پس ولذکر اللّٰہ اکبر کے معنی یہ ہے کہ اس سے قرآن و نماز کی فضیلت ثابت کی گئی ہے۔ لانہ ذکر اللّٰہ۔ اس لئے کہ یہ بھی ذکر اللہ ہیں۔

اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔ تو نماز بہت بڑی چیز ہوئی۔ بس اب آگے شاہ صاحب کے چلنے کی جگہ ہی نہیں رہی۔ کیونکہ اب تو اس کی تفسیر میں دو احتمال ہو گئے۔ ایک یہ کہ ذکر اللہ سے مراد نماز ہی ہو۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے دوسرے یہ کہ محض ذکر متعارف یعنی اللہ اللہ کرنا مراد ہو۔ اب ذکر اللہ سے مراد جزماً صرف اللہ اللہ ہی کرنا نہیں رہا۔ بلکہ اس میں نماز کا احتمال بھی پیدا ہو گیا۔ اور دوسرے دلائل سے یہ صرف احتمال ہی نہیں رہا۔ بلکہ واقع میں بھی ایسا ہی ہے۔

اسی طرح دعا کے متعلق بعضوں کو ایسی ہی غلطی ہو رہی ہے۔ سو اس کو بھی سمجھو۔ اس کے بڑا ہونے کے معنی بھی یہی ہیں۔ کہ اور تدابیر سے مانع نہیں ہے۔ کیونکہ دعا میں وہ تدابیر بھی داخل ہیں۔ ایک دعائے قولی ہے۔ ایک دعائے فعلی ہے اور اگر واقع میں یہی معنی ہیں جو تم سمجھتے ہو۔ تو پھر نکاح بھی کرو اور کہہ دو ہم کو شاہ صاحب کی دعا پر اعتماد ہے۔ اولاد کی تو ہمیں بڑی تمنا ہے۔ مگر نکاح نہیں کریں گے۔ بس یوں ہی کسی طرح دعا سے اولاد ہو جاوے گی۔ کیونکہ اگر نکاح سے اولاد ہوئی تو پھر خدا کی قدرت کیا ہوئی۔ صاحب! اپنے دعا کے بھروسے کبھی تم نے ایسا بھی کیا ہے؟ جب نکاح میں ایسا نہیں کیا۔ تو اس معاملہ میں ایسا کیوں کرتے ہو۔ بس اب دعا کے یہ معنی ہوئے۔ کہ جتنی تدبیریں ہو سکیں۔ سب کرو اور پھر دعا بھی کرو اور محض تدبیر پر بھروسہ نہ کرو۔ بھروسہ دعا ہی پر کرو۔ اس کی نظیر میں مولانا فرماتے ہیں: ؎

گفت پیغمبر بآواز بلند | بر توکل زانوئے اشتر بہ بند
گر توکل می کنی در کار کن | کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

(پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے توکل پر اونٹ کے پاؤں باندھو، اگر توکل رکھتے ہو تو کام کرو پس کسبکر کے اللہ پر توکل کرو)

یہ مضمون مذکورہ حدیث شریف کا ہے۔ کہ ایک اعرابی نے پوچھا جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ اونٹ باندھ کر توکل کروں یا خدا کے بھروسہ پر کھلا رہنے دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اعقل ثم توکل۔ کہ باندھ پھر خدا پر بھروسہ کر۔ تو یہ ہے توکل۔ اب اس میں رسی پر نظر کرنا الحاد اور بددینی ہے۔ اور محض خدا کے بھروسہ پر اسباب کا قطع کرنا حماقت وجہل ہے اور دونوں کا جمع کرنا عقل اور توکل ہے۔

یہ ہے حقیقت توکل کی۔ اب خلاصہ وعظ کا ذکر کر کے ختم کرتا ہوں۔ وہ خلاصہ یہ ہے۔ کہ حق تعالیٰ نے جہاں دنیا کی مذمت اور آخرت کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے۔ کہ اپنی آخرت کی فکر کرو اور آخرت کی فکر یہ ہے کہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کی اور اپنے بھائیوں کی سب کی اصلاح کرو۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ وہ ہمیں فہم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔ ثم آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا و مولانا محمد و
علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین. و اٰخر دعوٰنا ان
الحمد للّٰہ رب العلمین

اشرف علی

ختم ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ

اتباع علماء

آپ داعی الی طریق اللہ ہیں۔ جس کی طرف ادعوا الی اللہ میں اشارہ ہے۔ اور یہی شان علماء میں بھی موجود ہے۔ مگر بواسطہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ رسول صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ شان بلا واسطہ ہے۔ پس واسطہ بلا واسطہ کا فرق ہے۔ مگر نفس نسبت مشترک ہے۔ تو یہ اس کی دلیل ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علماء سے بہت تعلق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو بواسطۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علمائے سے بہت تعلق ہے۔

(از حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ)

☆............اتباع علماء یعنی سعید السبیل سے موسوم یہ وعظ 3 ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ بعد از نماز جمعہ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ہوا۔

☆............مولانا سعید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ منبر دار العلوم دیو بند نے اس کی فرمائش کی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ کرسی پر بیٹھ کر حضرت علیہ الرحمۃ نے بیان فرمایا۔

☆............سامعین کی تعداد تقریباً یک صد تھی

☆............مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اسے قلم بند فرمایا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا وخطبہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہ و نؤمن بہٖ و نتوکل علیہ و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ للّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہٗ و نشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہٗ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ وبارک وسلم.

اما بعد: فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

وَ اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ

(اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے۔ جو کہ سیدھا ہے۔ پس اس راہ پر چلو ۱۲ منہ پارہ ۸ رکوع ۶)

شفقت خداوندی

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے۔ جس میں حق تعالیٰ نے تمام دین کا خلاصہ ارشاد فرمایا ہے۔ تمام دین اس کی تفسیر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے خاص عنوان سے بیان فرمایا ہے۔ جس کا اثر یہ ہے۔ کہ اس کو سن کر عمل کی رغبت ہوتی ہے اور یہ حق تعالیٰ کی حکمت ہے۔ کہ وہ احکام جو فی نفسہ آسان ہیں۔ مگر مخالفت نفس اور منازعت نفس کے عارض سے دشوار ہوگئے ہیں۔ ان کو نہایت سہل عنوان سے بلکہ شوق دلانے والے عنوان سے بیان فرمایا گیا ہے۔ تا کہ یہ عارضی دشواری شوق کی حرکت سے مغلوب ہو جائے۔

اور یہ دلیل ہے۔ حق تعالیٰ کے شفیق ہونے کی۔ حق تعالیٰ نے ہمارے ساتھ ضابطہ کا تعلق نہیں رکھا ہے۔ اور جتنے ضوابط وقواعد حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔ ان میں غور

کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ سب بندوں کی مصلحت کے لئے ہیں۔ وہ ضابطہ محضہ نہیں۔ بلکہ عین شفقت ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے کوئی بچہ کنویں میں گرنے لگے۔ تو اس کو گرنے سے اس طرح روکتے ہیں۔ کہ ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور دو چار طمانچہ لگا کر وہاں سے ہٹا دیتے ہیں۔ شفقت کا ہٹانا یہی ہے۔ نہ یہ کہ اہل حکومت کی طرح ضابطہ سنا دیا جائے۔ جیسے حکام و سلاطین اور ان کے نوائب کا طریقہ ہے۔ کہ منادی کرنیوالا ایک طرف سے منادی کرتا چلا گیا۔ چاہے کوئی سنے یا نہ سنے، سمجھے یا نہ سمجھے اور رغبت ہو یا نہ ہو۔ سو یہ ضوابط ہیں اور حق تعالیٰ کے احکام میں ایسے ضوابط نہیں ہیں۔ ہاں صورت ضوابط کی ہے۔

سو اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے حکیم دوا کی مقدار معین کرتا ہے۔ وقت مقرر کرتا ہے۔ پرہیز متعین کرتا ہے۔ تو ظاہر میں یہ بھی ضوابط ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ محض ضوابط نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر یہ ضوابط مرتفع ہو جائیں۔ تو حقیقت میں اہلاک ہوگا۔ طبیب یہ قیدیں صرف مریض کی مصلحت سے لگاتا ہے۔ اپنی مصلحت کے لئے نہیں لگاتا۔

اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے اپنی شان حکومت کے لحاظ سے ضوابط مقرر نہیں فرمائے۔ بلکہ بندوں کی مصالح اور منافع کے لئے متعین فرمائے ہیں اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتا۔ تو بندوں ہی کا ضرر تھا۔ پس احکام میں بظاہر جو کچھ قواعد و ضوابط ہیں۔ ان کا مبنیٰ شفقت ہے اور اسی شفقت کا یہ اثر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ احکام کو ایسے عنوان سے بیان فرماتا ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے۔ کہ بندوں کو انہیں اختیار کرنے کی رغبت پیدا ہوئی اور شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے باپ بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے اس کی رعایت کرتا ہے۔ کہ بیٹا سمجھ لے اور اس کی سمجھ میں بات آ جائے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی اس طرز شفقت کی پوری رعایت ہے۔ فرماتے ہیں:۔

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ۔ کہ واقعی یہ میرا راستہ ہے۔ ھذا کا اشارہ اوپر کے احکام کی طرف ہے۔ جو امہات احکام ہیں۔ جو تمام دین کا خلاصہ ہیں۔ مگر وہ تو اجمال بصورت تفصیل تھی اور یہ یعنی اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا۔ اجمال بعد تفصیل ہے۔

رفع اشکال

قبل ازیں کہ میں اس آیت کے عنوان میں طرز شفقت کو واضح کروں۔ ایک اشکال کو

رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ شاید کسی ذہین کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ تو اس پر قادر ہے۔ کہ ہم کو بدوں ابتلاء بالا حکام کے جنت عطا فرماویں اور شفقت کا مقتضی بھی بظاہر یہی تھا۔ کہ ابتلاء سے محفوظ رکھ کر ہم کو نجات عطا فرماتے۔

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ بے شک حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں۔ کہ بدوں ابتلاء وامتحان کے سب کچھ عطا فرما دیتے ہیں۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتے۔ بلکہ انسان کو ابتلاء و تکلیف کے بعد ہی دولت قرب عطا فرما دیتے ہیں۔ اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق و بعد کا نام ہے۔

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت ۔ فراقِ یار نہ آں می کند کہ بتوان گفت

حدیثِ ہول قیامت کہ گفت وعظِ شہر ۔ کنایتی ست کہ از روزگار ہجراں گفت

(پیر کنعاں نے نہایت عمدہ بات کہی وہ یہ کہ فراق محبوب ایسی مصیبت ہے جو کہ بیان نہیں کرسکتے، واعظ شہر نے قیامت کی ہولناکی کے بارے میں جو فرمایا اس میں اشارہ دوست کی جدائی وفراق کا ہے)

چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے:۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ.

(کیا لوگوں کا گمان یہ ہے کہ ان کو چھوڑ دیا جائے کہ انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے)

رہا یہ کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کے بارے میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے۔ کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے۔ ان کا طریقہ یہ ہے۔ اعموا اما ابهم الله۔ کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے۔ تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو۔ پس اجمالاً ہمارا عقیدہ یہ ہے۔ کہ ابتلاء میں حکمت ضرور ہے۔ گو ہم کو معلوم نہ ہو اور اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر انسان سے طاعت بدوں ابتلاء مقصود ہوتی۔ تو اس کے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے۔ انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ ملائکہ میں اطاعت بدوں ابتلاء رہی ہے ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے مقاومت، منازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے۔ مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کے لئے اس میں رکھا گیا

ہے۔ کیونکہ طاعت بلامنازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے بوجہ مجاہدہ کے۔

اوردرجہ خاص کی قید میں نے اس لئے لگائی ۔ کہ اگر منازعت خاص درجہ پر نہ ہوتی ۔ تو الدّین یسرٌ (الدرالمنثور للسیوطی ۱:۱۹۲، تفسیر القرطبی ۳:۳۳۲) (دین آسان ہے) کے خلاف ہوتا۔ اس لئے میں نے یہ قید لگا دی اور یہ منازعت بھی ابتداء ہی میں ہوتی ہے۔ بعد رسوخ کے یہ منازعت بھی باقی نہیں رہتی ۔ بلکہ احکام الٰہیہ امور طبعیہ بن جاتے ہیں۔

حق تعالیٰ نے افعال حسیہ میں بھی یہی قاعدہ رکھا ہے۔ چنانچہ مشی وغیرہ میں ابتداء ہی میں ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ہر قدم پر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی ۔ بلکہ وہی پہلا ارادہ مستمر قرار دیا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے اس کو فعل اختیاری کہا جاتا ہے۔ اس پر یہ شبہ نہ ہو۔ کہ شاید پھر ثواب کم ہو جاتا ہوگا۔ کیوں کہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہے۔ کہ ابتدائے منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد ثواب منازعت ہی کا ہمیشہ ملتا ہے۔ کیوں کہ اس نے تو اپنی طرف سے مقاومت منازعت کے دوام کا قصد کر کے عمل شروع کیا ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان جو نماز روزہ کا پابند ہے۔ اس کا ارادہ یہی ہے۔ کہ ہمیشہ نماز پڑھوں گا۔ ہمیشہ روزہ رکھوں گا، خواہ نفس کو کتنا ہی گراں ہو۔ اب یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے۔ کہ وہ بعد میں منازعت کو باقی نہیں رکھتے۔ مگر چونکہ بندہ نے ہمیشہ کے لئے اس منازعت کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اس واسطے اس کو زوالِ منازعت کے بعد بھی بوجہ نیت دوام کے وہی ثواب ملتا ہے۔ جو منازعت کے ساتھ ثواب ملتا۔ تو جیسے مشی کو فعل اختیاری اسی لئے کہا جاتا ہے۔ کہ ابتداء میں اختیار و ارادہ کی ضرورت ہے۔ گو بعد میں ضرورت نہیں رہتی ۔ اسی طرح یہاں بھی گو بعد میں منازعت نہیں رہتی ۔ مگر چونکہ ابتداء میں منازعت کی مخالفت کی ضرورت تھی ۔ اس لئے انتہاء تک اس مخالفت منازعت کو حکماً مستمر قرار دیا جائے گا۔

رحمت خداوندی

اور یہاں سے پتہ لگتا ہے۔ حق تعالیٰ کی رحمت کا۔ ورنہ عقل کا مقتضا یہ ہے کہ جب منازعت ختم ہو جائے اور عبادت میں لذت وحظ پیدا ہو جائے تو اس شخص کو اجر نہ ملے۔ کیوں

کہ اب طاعت مع الابتلاء نہیں ہے۔اس وقت عقل کہتی ہے کہ یہ شخص اجر کا مستحق نہیں۔مگر حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔کہ تجھے ہمارے بندہ سے محبت نہیں ہے۔ہم اس کو منازعت ہی کا اجر دیں گے گو اب محنت کچھ نہیں رہی۔مگر اب ہم اس کو پنشن دیں گے۔لیکن عقل پنشن کو جائز نہیں کرتی۔جیسے معتزلہ نے کہا ہے۔کہ گناہوں پر سزا دینا ضروری ہے۔عفو مغفرت خلاف عقل ہے۔پس یوں کہیئے۔کہ رسوخ کے بعد بندہ کی وہ حالت ہو جاتی ہے۔جو بعضے پیروں کی حالت سنی گئی ہے۔کہ جب کوئی مریدان کی دعوت کرتا ہے۔تو وہ دعوت کے بعد نذرانہ بھی لیتے ہیں۔جس کو دانت گھسائی کہنا چاہیے۔ایک پیرزادہ کو دعوت کے بعد پچاس روپے دیئے گئے۔تو اس نے پھینک دیئے اور کہا۔کہ کیا ہماری شان پچاس روپے کے لائق ہے۔غرض دو سو روپے لے کر ٹلے۔تو حق تعالیٰ نے یہ کر کے دکھلا دیا۔کہ وہ بندہ کو دانت گھسائی بھی دیتے ہیں۔کیونکہ انتہاء میں طاعت کا بجالانا کچھ کمال نہیں رہتا۔بلکہ اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے۔اخیر میں وہ حالت ہو جاتی ہے۔جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں وارد ہوا۔کان خلقه القرآن۔کہ قرآن پر عمل کرنا آپ کی طبیعت تھی۔آپ کی تو یہ فطرت ہی سے طبیعت تھی مگر کاملین کی بھی اخیر میں اسی کے قریب حالت ہو جاتی ہے اور اس وقت اس کے حق میں وعیدات کی ایسی شان ہو جاتی ہے۔جیسے ماں بچہ کو بعض دفعہ دودھ پلانا چاہتی ہے اور وہ کھیل کے شوق میں بھاگتا ہے۔تو وہ اس کے چپت لگاتی ہے۔حالانکہ وہ جانتی ہے۔کہ یہ خود دودھ پیئے گا۔کیوں کہ دودھ سے اس کو خود ہی رغبت ہے۔مگر اظہار شفقت کے لئے چپت لگاتی ہے۔ایسے ہی منتہیٰ کے لئے یہ وعیدات بغرض اظہار شفقت و رحمت ہیں۔

فطرتِ انسان

بلکہ میں کہتا ہوں۔کہ مبتدی کے لئے بھی وعیدات محض اظہار شفقت و رحمت ہیں کیونکہ بات یہ ہے کہ انسان کو فطرۃً حق تعالیٰ سے محبت ہے اور مبتدی کو جو احکام میں منازعت ہوتی ہے۔یہ خلاف محبت نہیں۔بلکہ اس کا منشاء یہ ہے۔کہ محبت کی وجہ سے اس کو حق تعالیٰ پر ناز ہے۔یہ یوں کہتا ہے کہ جب مجھے محبت ہے تو مجھے آرام دینا چاہیے۔میرے اوپر یہ تکالیف اور قیود کیوں ہیں اور بزبان حال یوں کہتا ہے ؎

ہم نے الفت کی نگاہیں دیکھیں　　جانیں کیا چشم غضب ناک کو ہم

یہ آج کل کے وعظوں کی زیادتی ہے۔ کہ مسلمانوں کو محبت حق سے خالی سمجھتے ہیں اور وعظ میں مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں۔ کہ تم کو نہ خدا سے محبت ہے اور نہ خدا کی عظمت ہے۔ حکام کے سمن اور طلبی پر تو تم فوراً بلا چون و چرا کے عدالت میں حاضر ہوتے ہو۔ خواہ گرمی ہو یا سردی یا برسات۔ کوئی چیز تم کو مانع نہیں ہوتی اور خدا کے احکام میں سو بہانے اور حیلے نکالتے ہو۔ سو یہ دلیل غلط ہے۔ کیونکہ رعایا کو حکام سے محبت نہیں۔ ان کے احکام شاقہ سے رعایا کو تعجب نہیں ہوتا۔ لوگ جانتے ہیں۔ کہ حاکم غیر ہے۔ اس سے ہم کو کیا تعلق اور وہ ہماری راحت و کلفت کا کیوں لحاظ کرے۔ اس لئے ان کے احکام میں منازعت و کشا کشی نہیں ہوتی اور حق تعالیٰ سے انسان کو محبت ہے اور خاص تعلق ہے ان کی طرف سے جو حکم اور قید آتی ہے۔ اس میں بوجہ ناز کے مچلتا ہے۔ کہ ایسے رحیم و کریم نے میرے اوپر مصیبت کیوں ڈالی۔ وعظوں نے اس فرق کو نہیں سمجھا اس لئے خواہ مخواہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت سے خالی بتلا کر ان کے دلوں کو مجروح کرتے ہیں۔ گویا بس ایک یہی وعظ صاحب تو حق تعالیٰ کے چاہنے والے ہیں۔ حضرت عارف شیرازیؒ نے ایسے وعظوں کی خوب خبر لی ہے۔ فرماتے ہیں:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　چوں بخلوت می رسند ایں کار دیگر می کنند

(واعظین جو محراب و منبر پر ارشاد فرماتے ہیں مگر جب خلوت میں ہوتے ہیں تو دوسرے کام کرتے ہیں)

اس میں بعض وعظوں کے دل میں یہ تاویل آ چکی ہے۔ کہ حافظ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ خلوت میں جا کر یہ لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں۔ جی ہاں بس خوش ہو لو؟ ذرا اس سے آگے بھی پڑھ لو۔

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس　　توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتری کنند

(مجھے یہ مشکل درپیش ہے کہ اہل مجلس سے پوچھوں کہ دوسروں کو توبہ کی تلقین فرمانے والے خود توبہ کیوں نہیں کرتے)

واعظین گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ کہ وہ خود بھی خلاف ورزی احکام کی کس قدر کرتے ہیں۔ پھر بھی اپنے بیان کے موافق محبت سے خالی نہیں اور اگر وہ خالی نہیں تو عوام بھی خالی نہیں۔ بلکہ سب کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔

تجویز محبوب

اور چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔ اس لئے اس مقام پر فرماتے ہیں:

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا.

کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا۔ جس میں اس راستہ کو اپنی طرف اس لئے منسوب فرمایا۔ کہ سننے والوں کو حظ آئے۔ کہ یہ محبوب کا راستہ ہے۔ اس عنوان سے سب کو اس کی طرف حرکت ہوگی۔ خواہ اس اضافت کا یہ مطلب ہو کہ یہ راستہ میرا ایجاد کیا ہوا۔ میرا بتلایا ہوا ہے۔ یہ مطلب ہو کہ اس پر چل کر تم مجھ تک یعنی میری رضا تک پہنچ سکتے ہو۔ خواہ کچھ ہی مطلب ہو۔ مگر ہر حال میں محبت کا یہی اثر ہے۔ کہ جب عاشق کو یہ معلوم ہو جائے۔ کہ فلاں کام کرنے سے محبوب مجھ سے راضی ہو جائے گا۔ تو اس کو اس کام میں سب مشقتیں آسان ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اگر محبوب کی تجویز رضا کا بھی علم نہ ہو۔ مگر اس کا علم ہو جاوے۔ کہ وہ میری مشقتوں کو دیکھ رہا ہے۔ تب بھی یہی اثر ہوتا ہے:۔

چنانچہ ایک عاشق رسوائی عشق کی وجہ سے پٹ رہا تھا اور ذرا اف نہ کرتا۔ ننانوے کوڑوں کے بعد جو ایک کوڑا اور لگا تو آہ کی۔ کسی نے پوچھا۔ کہ اس کی کیا وجہ تھی۔ کہ ننانوے کوڑوں پر آہ نہ کی، اخیر میں ایک کوڑے پر آہ کی۔ کہا ننانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا۔ میری حالت کو دیکھ رہا تھا۔ کہ اس کی محبت میں مجھ پر یہ مصیبت آئی ہے۔ تو اس وقت تک مجھے مصیبت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ بلکہ میں یوں کہہ رہا تھا ؂

بجرم عشق تو ام می کشند و غو غائیست   تو نیز بر سر بام آ کہ خوشنما شائیست

(تیرے عشق کے جرم میں مجھے کھینچے چلے جاتے ہیں اور بھیڑ لگی ہوئی ہے تو بھی تو کوٹھے پر آ کر دیکھ لے کہ کتنا اچھا تماشہ ہو رہا ہے)

اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔ تو اس وقت مجھے کلفت کا احساس ہوا۔ جب اطلاع محبوب کے علم میں یہ اثر ہے تو رضا و تجویز محبوب کے علم میں تو کیا کچھ اثر ہوگا۔

نسبت کا اثر

اسی بناء جب یہاں بندوں کو یہ بتلایا گیا کہ یہ میرا راستہ ہے۔ یعنی میری رضا کا راستہ ہے۔ یا میرا تجویز کیا ہوا راستہ ہے۔ یہ سن کر اس کی محبت کو حرکت ہوئی اور اب اس راستہ میں ان کو کوئی مشقت محسوس نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ سمجھیں گے کہ یہ کلفت محبوب کے راستہ میں ہے اور محبوب کے راستہ میں تو جان بھی جاتی رہے تو کچھ زیادہ نہیں۔ تو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عنوان سے طریق کی گرانی کو کیسا پھولوں کا سا ہلکا کر دیا۔ یہی وہ بات ہے جس کو میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی رحمت ہے۔ کہ اول تو دین کو فی نفسہ آسان کیا۔ پھر نفس کی کشاکشی سے جو اس میں عارضی گرانی اور مشقت آجاتی ہے۔ اس کو اس طرح دور کیا۔ کہ اس آیت میں تمام دین کا خلاصہ ایسے عجیب عنوان سے بیان فرمایا ہے۔ جس سے ساری مشقت دور ہوگئی۔ کہ اس کو اپنا راستہ فرمایا۔ اپنی طرف اس کی نسبت فرمائی۔ اس کا لطف عشاق سے پوچھو۔ کہ محبوب کے نام لگے کی کیسی محبت ہوتی ہے۔

اور یہیں سے ایک حکایت کی حقیقت معلوم ہوگی۔ جو مولوی مظہر صاحب رام پوری نے جو میرے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں موجز میں شریک تھے۔ (میں نے موجز کو موجز ہی پڑھا ورنہ مطول ہو جاتی) رام پور ریاست کا قصہ بیان کیا۔ کہ ایک شخص صاحب قبض ایک صاحب ارشاد کے پاس گیا۔ انہوں نے پوچھا تم کون ہو۔ کہا میں شیطان ہوں۔ فرمایا اگر شیطان ہو تو لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ یہ جواب سن کر اس کو مردودیت کا یقین ہو گیا۔ کہ جب ایک شیخ صاحب ارشاد نے بھی مجھ پر لاحول پڑھ دی۔ تو میرے مردود ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ تو اس نے اپنے خادم سے کہا۔ کہ اب اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ اس لئے اب میں خودکشی کروں گا۔ اگر کچھ رہے تو تم پوری کر دینا۔ چنانچہ اس نے خودکشی کی اور جان نکلنے کے بعد مرید نے الجھی ہوئی کھال کو الگ کر دیا۔ اسی حالت میں وہ

گرفتار کیا گیا۔ اس نے کہا تم مجھے کیا گرفتار کرتے ہو۔ میں تو خود زندگی سے بیزار ہوں۔ جب میرا پیر نہ رہا تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ تم شوق سے مجھے پھانسی دے دو۔ اس بیان سے حاکم کو اس کے قاتل ہونے میں شبہ پیدا ہوا۔ تو اس نے واقعہ دریافت کیا۔ اس نے سب واقعہ بتلا دیا۔ یہ خبر ان صاحب ارشاد شیخ کو بھی پہنچی۔ انہوں نے بھی تصدیق کی۔ کہ ہاں وہ قبض میں مبتلا تھا اور میرے پاس آیا تھا۔ کہ کچھ تعجب نہیں۔ کہ اس نے خودکشی کر لی ہو۔

یہ حکایت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سنی۔ تو فرمایا۔ کہ ہم تو ان صاحب ارشاد کو شیخ سمجھتے تھے۔ مگر معلوم ہوا۔ کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ ان کو چاہیے تھا۔ کہ جب اس نے کہا تھا کہ میں شیطان ہوں۔ تو جواب میں یوں کہتے کہ پھر کیا حرج ہے۔ شیطان بھی تو اسی کا ہے۔ نسبت اب بھی قطع نہیں ہوئی اس سے تسلی ہو جاتی۔ شاید تم یہ کہو۔ کہ ان الفاظ سے کیا ہوتا۔ تو تم اس کو کیا جانو؟

جس پر قبض طاری ہو چکا۔ وہ اس کے اثر کو سمجھتا ہے۔ صاحبو! الفاظ میں بڑا اثر ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ مولوی غوث علی صاحب پانی پتی سے کسی نے شیخ اکبر و فرید عطار اور مولانا رومی کے متعلق دریافت کیا۔ کہ وحدت الوجود میں گفتگو کرنے والے یہی تین حضرات بڑے ہیں۔ ان میں کیا فرق ہے۔ فرمایا، تینوں ایک ہی بات کہتے ہیں۔ فرق اتنا ہے۔ کہ تین مسافر کسی گاؤں میں ایک کنویں پر پہنچے۔ ایک عورت پانی بھر رہی تھی۔ اس سے پانی مانگا۔ مگر ایک نے تو یوں کہا کہ اماں! مجھے پانی پلا دے۔ یہ تو مولانا رومی ہیں۔ دوسرے نے یوں کہا کہ میرے باوا کی جورو مجھے پانی دے دے۔ یہ شیخ اکبر ہیں۔ تیسرے نے یوں کہا کہ میرے باوا سے یوں توں کرانے والی مجھے پانی دے دے۔ یہ شیخ فرید ہیں۔ اب غور کر لیجیے۔ کہ ان الفاظ کے اثر میں یہ فرق ہے یا نہیں۔ اگر کوئی ماں کو اماں کہے تو وہ خوش ہوگی۔ اور اگر باوا کی جورو یا باوا سے یوں توں کرانے والی کہے۔ تو اس کا منہ نوچنے کو تیار ہو جائے گی۔ حالانکہ معنی سب کے متحد ہیں۔

مجھ پر خود ایک حالت گزاری ہے۔ جس میں الفاظ کے اثر کا مجھے پورا مشاہدہ ہوا ہے۔ ایک بار مجھے سخت مرض ہوا اور ایک حکیم صاحب کے پاس قارورہ بھیجا۔ انہوں نے قارورہ

دیکھ کر یہ کہا۔ کہ اس شخص میں تو حرارت عزیزیہ نام کو بھی باقی نہیں۔ یہ زندہ کیسے ہے۔ قارورہ لے جانے والے نے یہ عقل مندی کی۔ کہ حکیم کا مقولہ مجھ سے آکر بیان کر دیا۔ جس کا مجھ پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ میں نے ان کو دھمکایا۔ کہ یہ بات کیا میرے سامنے کہنے کی تھی۔ تم نے بڑی حماقت کی۔ جاؤ اس کا تدارک کرو۔ انہوں نے تدارک پوچھا۔ میں نے کہا کہ مکان کے باہر جاؤ اور کچھ دیر میں آکر مجھ سے یوں کہو۔ کہ میں پھر حکیم صاحب کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے مکرر دیکھ کر یہ کہا۔ کہ پہلے جو بات میں نے کہی تھی وہ غلط تھی۔ حالت اچھی ہے۔ کچھ خطرے کی بات نہیں۔ وہ کہنے لگے کہ جب آپ کو معلوم ہے۔ کہ میں آپ کی سکھلائی ہوئی بات کہوں گا۔ تو اس کا کیا اثر ہوگا۔ میں نے کہا تم خواص اشیاء کو کیا جانو۔ جس طرح میں کہتا ہوں تم اسی طرح کرو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ ان لفظوں کے سننے سے میری پہلی سی حالت نہ رہی۔ بلکہ ایک گونہ قوت بدن میں پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ علاج سے قوت بڑھتی گئی اور حق تعالیٰ نے پوری شفاء عطا فرمادی۔ تو الفاظ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اثر رکھا ہے۔ گو ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ اطباء سے پوچھو۔ کہ خفقان میں کہرباء کی تعلیق کیوں مفید ہے؟ وہ اس کی وجہ بجز تجربہ کے کچھ نہیں بتلا سکتے۔ اسی طرح اہل طریق کو کلمات والفاظ کے اثر کا تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر ان کے تجربہ کو اہل ظاہر نہیں جانتے۔

شاید کسی مولوی کو یہ شبہ ہو کہ ایسے الفاظ سے تسلی کرنا تو جائز نہ تھا۔ کہ شیطان بھی تو اسی کا ہے۔ نسبت پھر بھی باقی ہے۔ کیونکہ اس سے کفار بھی اپنے کو صاحب نسبت سمجھنے لگیں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض دفعہ فوری علاج سنکھیا سے بھی کیا جاتا ہے۔ پھر بعد میں سنکھیا کی سنبھال کر لیتے ہیں۔ اس کو بھی اطباء جانتے ہیں۔ اور اہل اللہ کا تجربہ ہے۔ کہ بعض دفعہ اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسرے تم اس میں اضافت تشریفیہ کیوں لیتے ہو اور خواہ مخواہ اس کو خلاف شرع پر کیوں عمل کرتے ہو؟ معنی لغوی پر کیوں محمول نہیں کرتے۔ آخر شیطان بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ہے (یعنی ان کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ان کا بندہ ہے۔۱۲) بتلایئے اس میں کیا خرابی ہے۔ اس قصہ سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ نسبت اور اضافت کا اثر اہل محبت پر کس قدر ہوتا ہے۔ تو جب

اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا۔ کہ یہ میرا راستہ ہے۔ اس سے محبت کو ہیجان ہو گیا اور اب موانع کا ارتفاع آسان ہو گیا۔ اب یہ حال ہو جاتا ہے۔ کہ

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی خدائے تو   دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہوں)

اور اب عاشق زبان حال سے اور بعض دفعہ زبان قال سے یوں کہنے لگتا ہے:۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اس پر میں اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا (بے شک یہ میرا راستہ مستقیم ہے) کو سن کر ایک دفعہ تو کافر کو بھی اس کی طرف حرکت ہوگی اور وہ اس راستہ پر چلنا چاہے گا۔ کیونکہ خدا سے محبت کافر کو بھی ہے۔ چنانچہ میں دیکھتا ہوں اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ بعض سنیاسی ذکر و شغل کرتے ہیں اور لذائذ کو ترک کر دیتے ہیں۔ اس کا منشاء وہی محبت ہے۔ گو وہ غلط راستہ پر چل رہے ہیں۔

کیفیات کی حقیقت

اور یہاں سے ایک بات اور بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ کفار کو ذکر الٰہی سے گو آخرت میں کچھ نفع نہ ہو اور یہ ذکر وہاں ان کے لئے نجات کا سبب نہ ہو۔ مگر دنیا میں ان کو بھی کچھ مل جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ کہ وہ کسی اچھے کام کرنے والے کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے۔ بلکہ ذاکر طالب آخرت ہے۔ تو اس کو آخرت میں اجر عطا فرماتے ہیں اور دنیا میں بھی اور طالب دنیا ہے تو اس کو دنیا میں کیفیات نفسانیہ، ذوق و شوق وغیرہ عطا ہو جاتا ہے۔ یہ اس کا اجر ہے۔ اسی لئے محقق حضرات نے فرمایا ہے۔ کہ کیفیات نفسانیہ کے در پے نہ ہو۔ کیونکہ وہ تو چٹنی ہے اور چٹنی مطلوب نہیں۔ بلکہ مطلوب غذا ہے اب اگر کوئی

چٹنی ہی سے پیٹ بھر لے۔ تو اس کا معدہ خراب ہو جائے گا۔ بس چٹنی کا کام یہ ہے کہ غذا کے ساتھ تھوڑی سی کھالی جائے۔ تا کہ غذا اچھی طرح کھائی جائے۔

میں نے اس کے متعلق ایک فیصلہ کیا ہے۔ جو مختصر ہے۔ گو یہ لفظ دعویٰ کا ہے۔ مگر میرا مقصود دعویٰ نہیں۔ بلکہ یہ ایسا ہے۔ جیسے کہ ہم کو یوں کہتے ہیں۔ کہ میں نے نماز پڑھی اور روزہ رکھا اور دعویٰ تو جب ہو کہ یہ فیصلہ میں نے اپنے آپ کو کیا ہو۔ نہیں نہیں۔ بلکہ یہ ان حضرات کا طفیل ہے۔ جن کی جوتیاں سیدھی کی ہیں اور طوطا اگر کچھ پڑھنے لگے تو یہ اس کا کمال نہیں۔ بلکہ یہ پڑھانے والے کا کمال ہے۔ تو وہ فیصلہ کے بارے میں یہ ہے۔ کہ یہ کیفیات محمود تو ہیں۔ مگر مقصود نہیں۔ اور غیر مقصود بالذات کو مقصود بالذات بنا لینا عصیان باطنی اور بدعت باطنیہ ہے۔ اس لئے ان کے درپے نہ ہو۔ ان کی تمنا نہ کرو۔ ہاں دعا کا مضائقہ نہیں۔ کیوں کہ دعا میں خاصیت یہ ہے۔ کہ دعا کے قبول نہ ہونے سے شکایت وقلق پیدا نہیں ہوتا اور تمنا کے پورا نہ ہونے سے شکایت وقلق ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ نے امور اختیاریہ وغیرہ اختیاریہ کے متعلق یہی فیصلہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۔ (اور تم کسی ایسے امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے، مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں)

میرا ذوق یہ ہے۔ کہ اس آیت میں مطلوب کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک موہوب جس کو **ما فضل اللّٰہ بہ** اور **واسئلوا اللّٰہ من فضلہ** میں فضل سے تعبیر سے کیا گیا ہے۔ دوسرے مکسوب جس کو **للرجال نصیبٌ مما اکتسبوا و للنسآء نصیبٌ مما اکتسبن** میں اکتساب کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ اب حاصل یہ ہوا کہ موہوب کی تمنا نہ کرنا چاہیے۔ نہیں بلکہ مکسوب کا اہتمام وفکر کرنا چاہیے۔ مدار نجات اعمال مکسوبہ ہیں۔

اب رہا تمنائے موہوب سے جو ممانعت ہے۔ اس میں نہی تحریم کے لئے ہے یا کراہت تحریمہ یا کراہت تنزیہ کے لئے۔ اس سے مجھے بحث نہیں۔ عشاق سے پوچھو کہ جب محبوب کسی کام سے منع کر دے۔ تو کیا عاشق محبوب سے یہ سوال کر سکتا ہے۔ کہ حضور یہ بات آپ کو کس درجہ میں ناپسند ہے۔ کس قدر ناگوار ہے۔ اگر کوئی ایسا سوال کرے گا۔ تو محبوب اس کو نکال باہر کرے گا۔ کہ یہ تو عاشق نہیں۔

اس کے بعد حق تعالیٰ ہمارے جذبات کی رعایت فرماتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں۔ کہ موہوب کے لئے ان کا دل للچائے گا ضرور۔ اس لئے دعا کی اجازت دیتے ہیں وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو) کہ دعا کر سکتے ہو۔ آگے بعض اوقات عدم قبول دعا سے پریشان نہ ہونے کی تعلیم ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں) کہ اگر دعا قبول ہونے میں دیر ہو اور قبول کے آثار معلوم نہ ہوں تو گھبراؤ نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یعنی وہ ہر چیز کی مصلحت کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ پس اس بات کو بھی وہی خوب جانتے ہیں۔ کہ یہ نعمت موہوبہ تمہارے لئے مناسب ہے یا نہیں۔ اور مناسب ہے تو کس وقت اور کس حالت میں مناسب ہے۔

یہ تو کیفیات کے متعلق فیصلہ کا ذکر تھا اور اس سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کیفیات کفار کو بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ تو جو چیز کافر کو بھی حاصل ہو سکے اس کے درپے نہ ہونا چاہیے۔ اور نہ ان کیفیات کے حصول پر اکتفاء کرنا چاہیے۔ کیوں کہ نجات کا مدار اعمال مکسوبہ ہے۔ ان کیفیات سے قرب و نجات میں کچھ زیادہ ترقی نہیں ہوتی (ہاں یہ ضرورت ہے کہ عادۃً عمل مجرد عن الکیفیت سے عمل مع الکیفیۃ میں خود شان اکتساب کی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اکمل ہونے کے سبب افضل ہوگا۔۱۲) غرض خدا کا راستہ سن کر کفار کو بھی حرکت ہوتی ہے اور وہ بھی ایک دفعہ کو بے اختیار اس راستہ پر چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ سے سب کو محبت ہے۔ جس کی وجہ سے جس چیز کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہو جائے۔ اس سے بھی محبت ہوتی ہے۔ آگے ارشاد ہے۔ کہ بس لذت نسبت پر ہی کفایت

نہ کرنا۔ بلکہ آگے بڑھواور کام کرو۔ فا تبعوا۔ کہ اس راستہ کا اتباع کرو، اس راستہ پر چلو۔ کیونکہ یہی وہی چیز ہے۔ جو کافر سے نہیں ہوسکتی۔ کیفیات تو کفار کو بھی حاصل ہوسکتی ہیں۔ مگر صراط خداوندی کا اتباع کافر سے بحالت کفر نہیں ہوسکتا۔

مقام علمائے کرام

یہ تو تمہید تھی۔ اب میں مقصود کو عرض کرتا ہوں۔ جو مختصر ہی ہے اور مقصود تو ہمیشہ مختصر ہی ہوتا ہے۔ جیسے روٹی مختصر ہے اور تمہید اس کی بہت لمبی ہے۔ یہ تو حسیات میں ہے۔ اور طریق باطن میں بھی مقصود مختصر اور تمہید مطول ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا گنگوہیؒ کا ارشاد ہے۔ کہ سلوک کا جو حاصل پندرہ سال کے بعد معلوم ہوا ہے۔ اگر پہلے معلوم ہوتا۔ تو اس کے لئے ہم اتنا وقت صرف نہ کرتے میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ حاصل پندرہ برس کی محنت سے پہلے معلوم ہی کیوں ہوتا (اور یہ بھی حضرت قدس سرہ کا کمال تھا۔ کہ ان کو پندرہ برس کی محنت سے خلاصہ معلوم ہوگیا۔ بہت سوں کو تو تیس اور چالیس سال کے بعد جا کر کہیں مقصود کا پتہ لگتا ہے۔۱۲) پس یہ مختصر ایسا ہے۔ جیسے ایک بڑے دفتر حساب کا خلاصہ میزان کا ایک سطر میں لکھا ہوتا ہے۔ کہ کل میزان دس ہزار پانچ سو دس ہے۔ مثلاً یہ لفظ تو ایک سطر سے کم میں بھی آجائے گا۔ مگر کیا آپ میزان کو بدوں تمام دفتر جمع کئے معلوم کر سکتے تھے۔ ہرگز نہیں۔ غرض حق تعالیٰ نے یہاں تو صراط کو اپنی طرح منسوب فرمایا ہے اور ایک جگہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی اضافت فرمائی ہے:۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ

(اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمادیں یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، انا اور میرے متبعین بصیرت سے جس راہ پر ہیں)

اور ایک مقام پر انبیاء وعلماء سب کی طرف اس کی اضافت ہوتی ہے۔

وَ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ

(اور اس شخص کے راستہ کی پیروی کرو جو میری طرف جھک گیا)

اور ایک مقام پر خود سالک کی طرف اضافت کی گئی ہے۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلاً (پارہ ۲۹ سورۂ مزمل ۱۲)

''سو جس کا جی چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرے''

گو یہ اضافت صریح نہیں۔ مگر سالک کو اس طریق کے ساتھ تلبس ہونے پر یہ آیت ضرور دال ہے۔ کیوں کہ لفظ سبیل اس میں اتخذ کا مفعول بہ ہے اور فاعل سالک ہے۔ اور متخذ و متخذ میں تلبس ضرور ہوتا ہے۔ اور اضافت سے میری یہی مراد ہے۔ اضافت نحویہ مراد نہیں۔

اب ان اضافات متعددہ کے اسباب سنیئے۔ حق تعالیٰ کی طرف تو اس طریق کی اضافت اس لئے ہے۔ کہ وہ واضح طریق ہیں اور منتہائے طریق ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس لئے ہے کہ آپ داعی اور مبلغ ہیں۔ اور یہی وجہ نسبت الی العلماء کی ہے اور سالک کی طرف اضافت کا منشاء یہ ہے کہ وہ طالب سبیل ہے اور فقہاء نے اصول میں بیان فرمایا ہے۔ کہ جہاں ایک چیز دو کی طرف منسوب ہو۔ وہاں ان دونوں چیزوں میں غایت تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ اصولیین نے حرمت مصاہرت کے مسئلہ میں اس کی تقریر کی ہے اور بیان فرمایا ہے کہ ولد منسوب ہے، واطی اور موطوکی طرف۔ اس لئے کہ ان دونوں میں تعلق قوی ہو گیا۔ پس دونوں کے اصول و فرع ایک دوسرے پر حرام ہو جائیں گے۔ تو ایسے ہی یہاں سمجھیئے۔ کہ سبیل حق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی یہ غایت تعلق مع الرسول کی دلیل ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ کو بہت تعلق ہے اور منشاء اضافت الی الرسول کا یہ ہے۔ کہ آپ داعی الی طریق اللہ ہیں۔ جس کی طرف ادعوا الی اللّٰہ میں اشارہ ہے اور یہی شان علماء میں بھی موجود ہے۔ مگر بواسطۂ رسول کے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ شان بلاواسطہ ہے۔ پس واسطہ اور بلاواسطہ کا فرق ہے۔ مگر نفس نسبت مشترک ہے۔ تو قاعدہ مذکورہ بالا کے موافق یہ اس کی دلیل ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علماء سے بہت تعلق ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھی بواسطۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علماء سے بہت تعلق ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ جب نسبت مشترک ہے اور سالک کی طرف بھی اس کی اضافت ہے۔ تو جو اس راستہ پر چلنا شروع کرتا ہے۔ اس سے بھی اللہ تعالیٰ کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص تعلق ہو جاتا ہے۔

جب یہ سمجھ گئے تو اب سنو! کہ مجھے یہاں سے ایک مسئلہ مستنبط کرنا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے ؎

چونکہ گل رفت گلستاں شد خراب | بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب
چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ | چارہ نبود در مقامش از چراغ

جب موسم گل ختم ہوگیا اور چمن اجڑ گیا، گلاب تو ہے نہیں جس سے خوشبو حاصل ہو اب عرق گلاب سے اس کی خوشبو حاصل کرلو، جب آفتاب چھپ گیا اور ہمیں داغ مفارقت دے گیا تو اب اس کی جگہ چراغ ہی کافی ہے)

یعنی اس وقت مجھے علماء کی شان بیان کرنا اور ان کا درجہ بتلانا ہے۔ جو اس اضافت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت جو شخص اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہے اور خدا تعالیٰ کو راضی کرنا چاہے۔ اس کے لئے بجز اتباع علماء کے کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے۔ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی حیات ہی ہے۔ مگر حیات صوریہ کے مقابلہ میں اس کو وفات کہنا ضرور صحیح ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ لا یموت ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ سے بجز انبیاء کے بلا واسطہ کوئی مستفید نہیں ہوسکتا۔ اور ہم تو صحابہ ؓ کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بلا واسطہ مستفید نہیں ہوسکتے۔ تو اب بجز اتباع علماء کے ہمارے لئے دین پر چلنے کی کوئی صورت نہیں رہی۔

نا اہل مجتہدین

مگر حالت یہ ہے کہ بہت لوگوں کو اتباع علماء سے آج کل عار ہے۔ بلکہ بعض کو تو اتباع آئمہ سے بھی عار ہے۔ آج کل بعض لوگوں کو مشکوٰۃ و بخاری کا ترجمہ پڑھ کر اجتہاد کا دعویٰ ہے۔ مگر اس اجتہاد کی حالت یہ ہے کہ ایک عامل بالحدیث تنہا نماز پڑھتے تو سکون سے پڑھتے اور امامت کرتے تو خوب ہل ہل کر نماز پڑھتے۔ کسی نے ان کو ٹوکا۔ کہ تم امامت کے وقت اس قدر کیوں ہلتے ہو۔ تو کہا۔ حدیث میں اس کا حکم آیا ہے اور مشکوٰۃ کا ترجمہ نکال کر لائے۔ جس میں من ام منکم فلیخفف کا ترجمہ لکھا تھا۔ کہ جو شخص امام بنے۔ وہ ہلکی نماز پڑھے۔ مجتہد صاحب نے ہلکی کو ہل کے پڑھا اور نماز میں ہلنے لگے۔

صاحبو! میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ آج کل دعویٰ اجتہاد ہی کرتا ہے جس کو علم سے مس بھی نہیں۔ ورنہ صاحب علم کبھی دعویٰ اجتہاد نہیں کر سکتا۔

کیونکہ جب کمال علم حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم جاہل ہیں۔ چنانچہ مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے۔ کہ عمر بھر پڑھنے پڑھانے کا یہ نتیجہ نکلا۔ کہ ہم جہل مرکب سے جہل بسیط میں آ گئے۔ بھلا ایسا شخص دعویٰ اجتہاد کیوں کر سکتا ہے۔ بس مدعی وہ لوگ ہیں جن کو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ ان کو اجتہاد کی حقیقت بھی معلوم نہیں۔

ایک صاحب نے ریل میں مجھ سے سوال کیا تھا۔ کہ اجتہاد کسے کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ تم اس کی حقیقت اصطلاحی الفاظ میں تو کیا سمجھو گے۔ میں ایک مثال سے اس پر تنبیہ کئے دیتا ہوں۔ بتلاؤ اگر دو شخص سفر میں ہوں اور صبح کی نماز کا وقت آئے اور پانی موجود نہ ہو۔ اس لئے دونوں کو تیمم کرنا پڑے۔ مگر ایک نے تو وضو کا تیمم کیا۔ دوسرے نے بوجہ رات کو احتلام ہو جانے کے غسل کا تیمم کیا۔ تو ان دونوں میں سے امام کون بنے اور کس کی امامت افضل ہے۔ کہا کہ اس شخص کی جس نے وضو کا تیمم کیا ہے۔ کیونکہ طہارت تو دونوں کو برابر حاصل ہے۔ اور حدث ایک کا اصغر ہے اور دوسرے کا اکبر۔ اس لئے وضو کے تیمم والے کی طہارت اقوی ہے۔

میں نے کہا۔ یہ تو تمہارا اجتہاد ہے۔ اب سنو! فقہاء نے تیمم غسل والے کو امامت کے لئے افضل فرمایا ہے۔ وہ یہ بات سن کر بڑے حیران ہوئے اور وجہ پوچھنے لگے۔ کہ فقہاء نے یہ بات کہاں سے فرمائی۔ میں نے کہا۔ کہ فقہاء فرماتے ہیں۔ کہ جب پانی موجود نہ ہو۔ تو تیمم طہارت کاملہ ہے۔ حدث اکبر کے لئے بھی اور حدثِ اصغر کے لئے بھی۔ جب تیمم طہارت کاملہ ہے۔ تو جس نے غسل کا تیمم کیا ہے۔ وہ افضل ہے۔ کیونکہ نائب اکمل کا اکمل ہے۔ اس لئے غسل والے کا تیمم اکمل ہے[1]۔

اس دلیل کو سن کر ان کی آنکھیں کھل گئیں اور کہنے لگے۔ واقعی اجتہاد کرنا انہی حضرات

---

[1] اسی طرح عطاء بن ابی رباح سے سوال کیا گیا کہ عورتیں اگر باہم جماعت کریں۔ تو امامت کے لئے ان میں کون افضل ہے۔ فرمایا کہ جو حاملہ ہو۔ لکون طہرہا اکمل من طہر غیر الحامل لبراءۃ تھا من الحیض مادامت حاملا۔ یہ جواب غیر مجتہد کبھی نہیں دے سکتا۔ ۱۲ ظ

کا کام تھا۔ صاحبو! تم جب چاہو امتحان کرلو۔ کہ حدیث سے بیس احکام تم مستنبط کرو اور وجہ استنباط پیش نظر رکھو۔ پھر ان احکام کے متعلق فقہاء کا کلام اور ان کا استدلال معلوم کرو۔ تو واللہ خود قسم کھا کر کہو گے۔ کہ فقہاء حدیث اور قرآن کو خوب سمجھتے ہیں۔ اہل حدیث کو فقہاء پر یہ اعتراض ہے۔ کہ یہ احادیث کے خلاف مسائل بیان کرتے ہیں۔ میں اس کا یہ جواب دیتا ہوں۔ کہ عمل بالحدیث کے معنی اگر عمل بکل الحدیث ہے۔ تو اس معنی کو تو تم بھی عامل بالحدیث نہیں کیونکہ بہت سی احادیث کو جو حنفیہ کے موافق ہیں، تم چھوڑتے ہو اور اگر اس کے معنی عمل ببعض الحدیث ہیں۔ تو اسی معنی کو ہم بھی عامل بالحدیث ہیں۔ یہ اور بات ہے۔ کہ تمہارے دلائل بخاری و مسلم میں ہیں اور ہمارے دلائل مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق میں ہیں۔ تو وہ بخاری مسلم کے بھی استاد اور استاد الاستاد ہیں۔ گو شاگرد زیادہ مشہور ہو جائے۔ پھر اس کی کیا وجہ کہ تم آئمہ فقہاء کو حدیث کا مخالف کہتے اور ان پر طعن کرتے ہو۔

غیر مقلدین سے شکایت

اور دراصل ہم کو غیر مقلدوں سے اسی کی زیادہ شکایت ہے۔ کہ وہ ہمارے آئمہ کو برا کہتے ہیں۔ اگر وہ آئمہ کو برا نہ کہیں۔ تو تقلید یا ترک تقلید سے ہم کو زیادہ بحث نہیں۔ تو ہر شخص کا خدا کے ساتھ اجتہادی معاملہ ہے۔ خواہ تقلید سے خدا کو راضی کرے۔ یا ترک تقلید سے ہمارا اجتہادی خیال یہ ہے۔ کہ ہم بدون تقلید کے دین پر عمل نہیں کر سکتے۔ اگر کسی کا اجتہادی خیال یہ ہے کہ ترک تقلید سے بھی دین پر عمل ہو سکتا اور خدا راضی ہو سکتا ہے۔ تو اس کو اختیار ہے۔ ہم اس کے ساتھ نہ الجھیں گے۔ مگر اس کی کیا وجہ کہ وہ مقلدوں سے الجھتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے آئمہ کو برا کہتے ہیں۔ حالانکہ ہم ان کے آئمہ کو برا نہیں کہتے۔ بلکہ ہم تمام محدثین کو اپنا امام سمجھتے اور ان کی عظمت کرتے ہیں اور کسی کی تحقیر کو جائز نہیں سمجھتے۔

ایک دفعہ میں قنوج گیا۔ تو غیر مقلدوں نے میری دعوت کی۔ حنفیوں نے تو مجھے منع کیا اور کہا کہ ان لوگوں کا کیا اعتبار۔ کہیں سنکھیا نہ دے دیں۔ مگر میں نے دعوت قبول کی اور کھانے کے بعد یا قبل ان سے کہا کہ میں آپ کا بالقوہ یا بالفعل نمک خوار ہو گیا ہوں۔ اس

لئے میرے ذمہ آپ کی خیر خواہی لازم ہوگئی۔اس خیر خواہی کی بناء پر میں آپ کو دو نصیحت کرتا ہوں۔ایک یہ کہ بدگمانی نہ کرو۔دوسرے یہ کہ بدزبانی نہ کرو۔غیر مقلدوں میں یہ دو مرض زیادہ غالب ہیں۔اسی وجہ سے وہ آئمہ کو حدیث کا مخالف سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک تاویل وقیاس کے معنی مخالفت حدیث ہیں۔گو وہ مستند الی الدلیل ہی ہو۔

ایک عامی نے ایک غیر مقلد عالم کو اسی بناء پر سخت الزام دیا۔ان سے پوچھا کہ من ترک الصلوٰۃ متعمد افقد کفر (کنز العمال:۵۰۰۸) کے کیا معنی ہیں۔کہا کہ معنی کیا ہوتے تاویل ہی کی کیا ضرورت ہے۔بس جو نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے۔عامی نے کہا کہ حنفی لوگ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے اور حدیث میں ہے کہ:

لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بام الکتاب۔(الصحیح للبخاری:۱:۱۹۲) تو یہ لوگ آپ کے اصول پر کہ اس میں کچھ تاویل نہیں تارک صلوٰۃ ہوئے اور تارک صلوٰۃ کافر ہے۔تو کیا حنفی سب کافر ہیں۔جناب وہ عالم دم بخود ہوگئے اور ایسے خاموش ہوئے۔کہ کچھ جواب نہ بن پڑا۔کیونکہ وہ محض اس بات پر ان کی تکفیر نہیں کرتے۔پس نہ حنفیوں کو کافر کہہ سکے اور نہ حدیث میں تاویل کر سکے۔کیونکہ تاویل اور قیاس کرنا ان کے نزدیک شرک وکفر میں داخل ہے۔مگر عامی نے ان کو الزام دے کر بتلا دیا۔کہ بدوں تاویل وقیاس کے چارہ نہیں اور یہ الزام دینے والا ایک عامی لوہار تھا۔غرض مشکوٰۃ وبخاری کا ترجمہ دیکھ کر اجتہاد کرنا جاہلوں کا کام ہے۔اپنے منہ میاں مٹھو بننا اور بات ہے۔مگر وہ کسی محقق عالم کے سامنے اپنے اجتہادات بیان کریں۔تو حقیقت معلوم ہو جائے۔وہ ان کے سب اجتہادیات کی قلعی کھول کر رکھ دے گا اور ان سے اقرار کرائے گا۔کہ تم اجتہاد کے ہرگز اہل نہیں۔اسی لئے کہا گیا ہے۔؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا   عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اپنا موتی کسی صاحب نظر کو دکھلا دو کیونکہ چند گدھوں کی تصدیق سے تم عیسیٰ نہیں بن سکتے)

عارف فرماتے ہیں:؎

شاہد آں نیست کہ موے ہر میانے دارد   بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

(معشوق وہ نہیں جو اچھے بال اور پتلی کمر رکھتا ہو بلکہ حسین وہ ہے کہ اس میں کچھ آن ہو)

اجتہاد ایک خاص آن ہے۔ جو امر ذوقی ہے۔ محض کتابوں کے یاد کر لینے کا نام اجتہاد نہیں۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند　　نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک تر ز مو اینجاست　　نہ ہر کہ سر بتراشید قلندری داند

(ضروری نہیں کہ جو شخص اپنا چہرہ روشن کرے وہ دلبری بھی جانتا ہو اور ہر وہ شخص جو آئینہ بناتا ہو وہ سکندری بھی جانتا ہو، اس میں بال سے زیادہ باریک نکات ہیں اور ہر وہ شخص جو سر منڈاتا ہو ضروری نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو)

البتہ دو علموں میں اب بھی اجتہاد باقی ہے۔ ایک طلب باطنی میں۔ ایک ظاہری میں۔ جو شخص ان میں مجتہد نہ ہو اس کو علاج کرنا جائز نہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ آج کل عوام کو اتباع علماء سے عار ہے۔ حتی کہ بعض کو آئمہ کے اتباع سے بھی عار ہے۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ خدا کا راستہ بدوں اتباع علماء و اتباع آئمہ کے نہیں مل سکتا۔ عوام اگر خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے طریقہ یہی ہے۔ کہ علماء سے احکام پوچھ پوچھ کر ان کا اتباع کریں۔ ان کو علماء سے دلائل و حکم دریافت کرنے کا حق نہیں۔ صرف احکام دریافت کرنے کا حق ہے۔

علماء کے لئے نصائح

اور علماء کو بھی چاہیے کہ عوام کے سامنے دلائل و حکم بیان نہ کیا کریں۔ میری یہی طرز ہے۔ چنانچہ علی گڑھ میں ایک پروفیسر نے جو عربی ادب کے بڑے ماہر تھے۔ مجھ سے ایک حدیث کا متن پڑھ کر جس میں آیا ہے۔ کہ زنا کی کثرت سے طاعون پھیلتا ہے۔ سوال کیا۔ کہ کیا یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کہا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا جنایت و عقوبت میں وجہ ربط سمجھ میں نہیں آئی۔ کہا ربط سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا کہ ربط کے سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس پر کوئی دین کا کام اٹکا ہوا نہیں ہے۔ آپ بدوں علم ربط ہی کے حدیث پر ایمان رکھیئے۔ کہا اس میں ایک نفع ہے میں نے کہا وہ کیا۔ کہا زیادت اطمینان۔ میں نے کہا۔ خود اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل؟ کہا دلیل اس کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ۔ میں نے کہا یہ کیا ضرر ہے۔ کہ جو چیز حضرت ابراہیم علیہ

السلام کو نافع تھی۔ وہ آپ کو بھی نافع ہو۔ بس اس پر وہ خاموش ہو گئے علماء کو عوام کے ساتھ یہی طرز اختیار کرنا چاہیے۔ کہ دلائل و حکم و اسرار ان کے سامنے بیان نہ کریں۔ اس سے ان کا دماغ خراب ہوتا ہے۔ پھر وہ کوئی حکم بدوں علت و حکمت معلوم کئے بغیر قبول نہ کریں گے اور بعض احکام کی علل و حکم دقیق ہوتی ہیں۔ عوام بیان کے بعد بھی ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہاں عوام یا تو عمل ترک کریں گے یا علماء علت و حکمت کے سمجھانے میں اپنا دماغ اور وقت ضائع کریں گے۔ اس سے بہتر یہی ہے۔ کہ علماء کا اتباع کریں۔ خود اجتہاد نہ کریں۔ ان سے احکام دریافت کریں۔ علل و حکم دریافت نہ کریں۔

علماء کو ایک بات کی اور نصیحت کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ جس کے سر پر بڑے موجود ہوں۔ اس کو اپنی شہرت کی کوشش نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ جہاں تک ہو اپنے کو گم کرو۔ گمنامی میں رہو۔ کیونکہ بڑا بننا سخت خطرہ کی بات ہے اور شہرت سے دنیوی مصائب کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

خویش را رنجور ساز درزار زار ... تا ترا بیروں کنند از اشتہار
اشتہار خلق بند محکم است ... بند ایں از بند آہن کے کم است
چشمہا و خشمہا و اشکہا ... بر سرت ریزو چو آب از مشکہا

(اپنے آپ کو رنجیدہ اور آہ وزاری میں مصروف رکھ تا کہ تو شہرت و اشتہار سے باہر نکلے، مخلوق کی شہرت اللہ اور اسکے بندہ کے درمیان مضبوط بند ہے یہ بند لوہے کے بند سے کیا کم ہے، غصے اور آنکھیں اور اشک تیرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے)

یعنی اشتہاری آدمی مجرم ہوتا ہے۔ (یہ لطیفہ ہے) یہ تو آج کل قانون بھی ہے۔ پس سلامتی اسی میں ہے۔ کہ چھوٹے بن کر رہو۔ اس میں دین کی بھی سلامتی اور دنیا کی بھی اور جس کے سر پر کوئی بڑا نہ ہو۔ اس کے لئے میں دوسرا طریقہ بتلاتا ہوں اور اس کے مستحسن ہونے پر قسم کھا سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ اپنے چھوٹوں سے مشورہ کیا کرے۔ ان شاءاللہ غلطیوں سے محفوظ رہے گا۔

اس کے بعد میں ایک نئی بات کہتا ہوں۔ جو اکثر لوگوں کے ذہن میں نہیں ہے۔ کہ مرید کو شیخ کی رائے سے مخالفت کا حق نہیں۔ اگرچہ دوسری شق بھی مباح ہو۔ کیونکہ مرید کا

تعلق شیخ سے استادشاگرد جیسا نہیں ہے۔ بلکہ اس طریق میں مرید شیخ کا معاملہ ایسا ہے۔ جیسے مریض اور طبیب کا معاملہ ہے کہ مریض کوفتویٰ طبیب کی مخالفت جائز نہیں۔ ایسے ہی یہاں مرید مریض ہے اور شیخ طبیب ہے۔ اس لئے مرید کو شیخ کی مخالفت جائز نہیں۔ ہاں دوسرا شیخ اس شیخ کے اجتہاد سے مزاحمت کرسکتا ہے۔ جیسے ایک طبیب دوسرے طبیب سے مزاحمت کرسکتا ہے۔ مگر مرید تو تربیت میں طبیب نہیں اور جب تک طبیب نہیں۔ اس وقت تک مریض ہے۔ پس اس کے ذمہ اتباع قول طبیب لازم ہے۔ ہاں یہ شرط ہے کہ اس کا قول خلاف شریعت نہ ہو۔ اگر مرید کے نزدیک شیخ کا قول خلاف شرع ہو تو مخالفت جائز بلکہ لازم ہے۔ مگر ادب کے ساتھ (گو واقع میں خلاف شریعت نہ ہو۔ مگر یہ تو اپنے علم کا مکلّف ہے) جیسے حضرت سید صاحب بریلوی کو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تصور شیخ تعلیم فرمایا۔ تو سید صاحب نے اس سے عذر کیا۔ کہ مجھے اس سے معاف فرمایا جائے۔ شاہ صاحب نے فرمایا

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید — کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

(وہ امر مباح جو بظاہر طریقت کے خلاف ہو، اگر تجھ کو مرشد بتلائے تو اس پر عمل کرو کیونکہ جو شخص راہ چلا ہو اور راہ دیکھا ہوا ہو وہ منازل کے طریق اور آثار سے بے خبر نہیں ہوتا)

سید صاحب نے عرض کیا۔ کہ مے خواری تو ایک گناہ ہے۔ آپ کے حکم سے میں اس کا ارتکاب کرلوں گا۔ پھر توبہ کرلوں گا۔ مگر تصور شیخ تو میرے نزدیک شرک ہے۔ اس کی کسی حال میں اجازت نہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ جواب سن کر سید صاحب کو سینہ سے لگالیا کہ شاباش، جزاک اللہ، تم پر مذاق توحید و اتباع سنت غالب ہے۔ اب ہم تم کو دوسرے راستہ سے لے چلیں گے۔ تصور شیخ وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں۔ غرض نبوت تو ختم ہوچکی ہے مگر سبیل حق منقطع نہیں ہوا۔ اس کو علماء سے معلوم کرو اور یہ رحمت ہے۔ کہ نبوت ختم ہوگئی۔ ورنہ انکار نبوت سے کفر لازم آجاتا اور بہت سے مسلمان نبی کے انکار سے کافر ہو جاتے۔ اب کفر سے تو بچ گئے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں۔ بس حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کے بعد کسی امتی کے انکار سے کفر لازم نہ آئے گا۔ ہاں گناہ لازم آئے گا۔

اگر علماء و مجتہدین سے مخالفت و منازعت کی گئی۔ صاحبو! مجتہدین کا وجود بھی ہمارے حق میں رحمت ہے۔ کہ ان حضرات نے محنت کر کے احکام دین کو مدون کیا اور ہم کو پکی پکائی روٹی مل گئی۔ مگر بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم تو خود ہی پکائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ بہت اچھا پکا کر دیکھ لو۔ پھر دونوں کا موازنہ کر لو۔ خود فرق واضح ہو جائے گا۔ پس اجتہاد نہ کرو۔ بلکہ اہل اجتہاد کا اتباع کرو۔ مجتہدین فی الاحکام الظاہرہ کا بھی اور مجتہدین فی الاحکام الباطنہ کا بھی تو یہ سبیل حق قیامت تک بواسطہ علماء کے باقی رہے گا۔ جو اتباع علماء ہی سے آپ کو مل سکتا ہے۔ بدوں اس کے راستہ نہیں مل سکتا۔ مقصود تو ختم ہو گیا۔

اب ایک بات باقی رہی۔ کہ اس سبیل کی اضافت سالک کی طرف جو کی گئی ہے۔ یہ باعتبار غایت ہونے کے ہے۔ کیونکہ یہ اس کا مقصود ہے۔ سالک نہ اس کا موجد ہے۔ نہ مبلغ وداعی ہے۔ نہ داعی کا وارث ہے۔ خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ کو علماء سے خاص تعلق ہے۔ پس علماء کو چاہیے کہ وہ بھی حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کریں۔ تاکہ فیض میں برکت ہو۔ محض تعلق علم کافی نہیں۔ بلکہ تعلق عملی و حالی کی ضرورت ہے اور عوام کو علماء سے خاص تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ یعنی تعلق اتباع۔ کہ ان کو خدا تعالیٰ سے بواسطہ علماء ہی کے تعلق ہو سکتا ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ کیونکہ وقت زیادہ نہیں ہے۔ جن حضرات کی فرمائش سے یہ بیان ہوا ہے۔ وہ اسی ریل سے جانے والے ہیں اور اب ریل کا وقت قریب آ گیا ہے۔ پس دعا کیجئے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا ومولانا محمد و علی آلہ و

اصحابہ اجمعین

اشرف علی

۵ رجب ۴۹ھ

التبشیر

(آداب اصلاح)

اے وہ لوگو! جو اتفاق اتفاق پکارتے ہو۔ اتفاق اس طرح نہیں پیدا ہوا۔ صرف چالیس دن کسی اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو۔ تمہیں طریقہ معلوم ہو۔

قال را بگذار مرد حال شو　　　پیش مردے کاملے پامال شو

(از حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

☆......آداب اصلاح کے بارے میں یہ وعظ (موسوم بالتبشیر) ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون ۵۰-۲ تک بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔

☆......جناب مولوی احمد عبدالحلیم صاحب نے اسے قلمبند فرمایا۔

☆......سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا وخطبہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہ و نؤمن بہٖ و نتوکل علیہ و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ للّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہٗ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ وبارک وسلم.

اما بعد:. فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا وتطاوعا ولا تختلفا. (ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آسانی کرنا دشواری مت کرنا، خوشی کی باتیں کرنا نفرت مت دلانا، ایک دوسرے کا کہا ماننا اختلاف مت کرنا)

(الصحیح للبخاری ۴: ۷۹، الصحیح لمسلم کتاب الأشربۃ: ۱۷۵)

تمہید

یہ ایک حدیث ہے۔ جس کے تین جملے ہیں۔ تین اس کے معنی ہیں۔ کہ باعتبار تعلق معنوی کے دو دو جملے مربوط ہیں۔ کہ جو حکم میں ایک ہی کے ہیں۔ ورنہ یوں تو چھ جملے ہیں اور اس کے مخاطب اول حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں اورا ول کی قید اس واسطے لگائی۔ کہ مخاطب ثانی تمام امت ہے۔ وہ امت جن کو ان احکام کی ضرورت پیش آئے۔ وہ سب اس کے مخاطب ہیں اور خطاب اس وقت کا ہے۔ جب کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے دو علاقوں پر ان دونوں حضرات کو حاکم بنا کر بھیجا تھا۔ ایک علاقہ پر ایک کو اور دوسرے پر دوسرے کو۔ اور دونوں کی سرحد ملی ہوئی تھی۔ اس

لئے عادۃً یہ بات لازم تھی کہ دورہ میں جب اپنی اپنی سرحد پر پہنچیں گے۔ تو التقات ہوگا۔ نیز ملکی معاملات میں بھی باہم ایک کا اثر دوسرے پر پہنچے گا۔ اس واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں صاحبوں کو ایسے احکام تعلیم فرمائے۔ جن میں بعض وہ ہیں۔ جن کا حاکم کو رعایا سے تعلق رکھنے میں لحاظ رکھنا ضروری ہے اور بعض وہ ہیں۔ کہ جب ان دونوں صاحبوں کو سرحد کے ملے ہونے سے باہمی تعلقات رکھنا ضروری ہیں۔ تو ان احکام کا باہمی تعلقات قائم رکھنے کے لئے لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ یا یوں کہو کہ اس میں ضمناً یہ امر تھا۔ کہ باہمی تعلقات رکھیں اور اس کا یہ طریقہ بتلا دیا۔ غرض اول کے دو حکم ایسے ہیں کہ اپنے محکومین کے ساتھ ان کا لحاظ رکھیں اور اخیر کا امر ایسا ہے۔ کہ باہمی تعلقات میں اس کا لحاظ رکھیں۔ یہ حاصل ہے اس حدیث کا۔

یہ مضمون گو نمکین نہ ہوگا۔ مگر تلخ بھی نہ ہوگا۔ بلکہ شیریں ہوگا کہ بعض اوقات طبائع سلیمہ کو شیریں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس معنی کو وہ نمکین سے بڑھ جاتا ہے اور تفصیل کی ضرورت ہی نہیں۔ ہاں ضمناً اگر کوئی ڈلی نمک کی آپڑے تو اور بات ہے۔ میں نے اس واسطے تمہید میں مصرح کر دیا۔ کہ شاید پہلے کے بعض[1] مضامین کی طرح اس میں بھی منتظر رہیں کہ شورش و جوش کا انتظار نہ کریں اور ہاں شیریں سے وہ مراد نہیں۔ جس کی تفکہاً کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔ بلکہ یہ شیریں ایسا ہے جس کے استعمال کی ہر حالت میں ضرورت ہے نہ کہ تفکہ۔ کہ کبھی کبھی استعمال کر لیا جاوے۔

ہر شخص کی دو حالتیں

وجہ اس کے اختیار کرنے کی یہ ہے۔ کہ یوں تو بہت سے مضامین ضروری ہیں۔ مگر پھر بھی ان میں کئی قسم ہیں۔ بعض تو وہ ہیں جن کی حاجت بھی شدید ہے اور لوگوں کی اس طرف توجہ بھی زیادہ ہے۔ اور بعض وہ ہیں جن کی حاجت تو شدید بلکہ اشد ہے۔ مگر توجہ بہت کم ہے۔ تو مضمون

---

[1] اس سے پہلے کوئی وعظ ایسا ہوا ہوگا۔ ۱۲ منہ

اول قسم سے زیادہ قابل بیان کے ہوگا۔ چنانچہ یہ مضمون بھی بالخصوص ایسا ہے کہ جس کی طرف توجہ کم اور حاجت بہت زیادہ ہے اور حاصل اور خلاصہ اس کا یہ ہوگا (اس کو بطور مقدمہ کے پہلے سمجھ لیا جائے۔ تا کہ اس سے اس حدیث کا پورا پورا لطف آئے) کہ ہر شخص کی دو حالتیں ہیں، ایک صلاح کی اور دوسری اصلاح کی۔ یا یوں کہو ایک صالح بننے کی۔ دوسری مصلح بننے کی۔

ہر چند کہ پہلی حالت بھی اصلاح کے مصدر سے مشتق ہو سکتی تھی کہ حاصل دونوں کا ایک ہی ہوتا۔ مگر ضرورت کیا۔ کہ مصلح کا لفظ کہہ کر ایک مضاف الیہ بڑھاؤں۔ یعنی مصلح النفس کہوں۔ اس لئے یہی کہنا مناسب ہے۔ کہ ایک حالت صلح کی ہے اور ایک اصلاح کی۔ اس میں قافیہ بھی ہو گیا اور فن بدیع کی رعایت بھی ہوگئی۔

بہر حال ہر شخص کی دو حالتیں ہیں اور ان میں سے ہر وقت ایک نہ ایک ضرور رہے گی اور یہ تردید بطور مانعۃ الخلو ہے۔ کیا معنی کہ یہ تو جائز نہیں۔ کہ یہ حالت صلاح نہ حالت اصلاح۔ کیونکہ اگر اصلاح غیر کسی وقت نہ بھی ہو۔ مگر اپنی صلاحیت تو ہر وقت ضروری ہے۔ اس سے کوئی شخص کسی وقت خالی نہیں۔ ہاں یہ جائز ہے کہ حالت صلاح بھی ہو اور حالت اصلاح بھی ہو۔ بہر حال یہ دو حالتیں ہیں اور ہر حالت کے کچھ آداب ہیں اور کچھ حقوق ہیں۔ سو حالت صلاح کے حقوق و آداب تو اکثر بیان ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے اس وقت دوسری حالت یعنی اصلاح کے حقوق و آداب کو بیان کے لئے اختیار کیا۔

سو جاننا چاہیے۔ کہ آج کل اول تو کسی کو کسی کی اصلاح کی فکر ہی نہیں۔ عام طور آزادی ہے۔

کسے را با کسے کارے نہ باشد

(کسی کو کسی سے کام نہیں)

ہر شخص کا عمل ہے۔ لیکن بہت تاسف کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ کہ یہ برتاؤ فقط دینی امور میں ہے۔ اگر یہ حالت عام ہوتی۔ کہ جس طرح دینی امور میں دوسروں سے لاپروائی ہے۔ دنیوی امور میں بھی ایسی ہی لاپروائی ہوتی۔ تو یہ جب بھی نہ ہوتا۔ کہ شکایت نہیں۔ شکایت تو جب بھی ہوتی مگر کم ہوتی۔ نفس شکایت کی وجہ تو یہی ہوتی۔ کہ دین کو دنیا پر قیاس نہیں

کر سکتے۔ کہ ایک شخص اگر ایک کو دنیوی امور میں آزاد رکھتا ہے تو دینی امور میں بھی آزاد رکھے۔ تو کوئی شکایت نہ ہو۔ اس لئے کہ دین بہت مہتم بالشان ہے۔ بخلاف دنیا کے۔ کہ دین کے مقابلہ میں کچھ بھی اہتمام کے قابل نہیں۔

کسب دنیا

میں یہ نہیں کہتا۔ کہ دنیا سعی و تحصیل کے قابل نہیں۔ کیوں کہ اہتمام اور شئے ہے سعی اور شئے ہے۔ اہتمام مقاصد کا ہوتا ہے۔ سعی مبادی کی بھی ہوتی ہے۔ تو دنیا کی سعی و تحصیل سے ممانعت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں الدنیا رأس کل خطیئة (اتحاف السادة المتقین:۳:۱۸۱، ۷:۳۵۴،)(دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے) فرمایا ہے۔ وہاں کسب الحلال فریضة بعد الفریضه (حلیة الأولیاء ۷:۱۶۲)(حلال روزی کمانا فرضوں کے بعد ایک فرض ہے) بھی فرمایا ہے۔ دیکھئے کسب کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرض فرما رہے ہیں۔ گو یہ حکم کم ہمت لوگوں کے لئے عیناً ہے اور جس کو ہمت ہو۔ اس کے لئے فرض کفایہ ہے۔ یعنی اگر ساری دنیا کے آدمی تحصیل دنیا چھوڑ دیں تو گنہگار رہوں گے۔ ہاں اگر اہل ہمت چھوڑ دیں اور کم ہمت مشغول ہوں۔ تاکہ تارکان اسباب کو معونت ہو۔ تو سب کے ذمہ سے فرض ادا ہو جائے گا۔ دیکھئے ہم تو دنیا کو فرض بتاتے ہیں۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ دنیا چھڑاتے ہیں۔ لوگ یہ چاہتے ہیں۔ کہ تحصیل دنیا میں اتنا توغل کیا جائے۔ کہ تمام اہل دنیا پر دنیا کی پرستش واجب کر دی جائے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنا بھی بہت ہے کہ ہم فرض کہتے ہیں۔ مگر اس میں تفصیل ہے۔

سنیئے! اگر اہل دنیا متفق ہو کر تجارت، ملازمت، زراعت چھوڑ دیں تو سب کے سب گنہگار ہوں گے۔ اس واسطے جہاں انسان کی حقیقت روح ہے۔ وہاں اس کا قوام بدن سے ہے اور وہ بغیر اجتماع و اہتمام کے قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے تمام اہل دنیا پر فرض ہے۔ کہ اتنا اسباب جمع کر دیں۔ کہ لوگ کافی طور پر تدبیر بدن کر سکیں۔ اگر اتنا اسباب مہیا ہو جائے۔ تو جو لوگ ترک اسباب کر دیں۔ ان کے لئے کچھ حرج نہیں۔ لیکن کم ہمت پر اب بھی فرض ہے۔ کہ وہ زراعت

پیشہ ہوتو زراعت کرے۔تجارت پیشہ ہو۔تو تجارت کرے۔ملازمت پیشہ ہوتو ملازمت کرے۔

غیر شرعی ملازمت

اسی واسطے جب ہمارے حضرت سے کوئی شخص بیعت ہو کر پوچھتا کہ نوکری چھوڑ دوں۔ تو فرماتے تھے۔نہیں نہیں۔ایسا ہرگز نہ کرنا۔میں تو یہاں تک کہتا ہوں۔کہ اگر کوئی نوکری ایسی بھی ہو کہ نامشروع ہو اور مشروع نہ ملتی ہو تو نہ چھوڑو۔ہاں اپنے کو گنہگار سمجھو۔اگر کوئی کہے کہ امر نامشروع کے چھوڑنے سے منع کرتے ہیں۔تو صاحبو! ہم نامشروع کے چھوڑنے سے منع نہیں کرتے۔بلکہ ایک نامشروع کو سپر بناتے ہیں۔بہت سے نامشروع کے لئے۔یعنی اس وقت اگر چھوڑے گا۔نہ معلوم کتنے معاصی میں مبتلا ہوگا۔کہیں چوری کرے گا۔جواء کھیلے گا،جھوٹی گواہی دے گا۔لوگوں کا قرض لے لے کر مارے گا اور نہ معلوم کیا کیا آفتیں کرے گا۔

پھر جب آگے بڑھے تو یہ خیال ہوگا۔کہ اے نفس تو اس قدر معاصی میں مبتلا ہے۔ تیری نجات کیا ہوگی۔بس جب نجات نہ ہوگی تو الگ کرو۔سارا جھگڑا اور خوب جی کھول کے جو کچھ ہو سکے کرلو۔اے لیجئے ایک نامشروع کے ترک سے کفر کی حد تک پہنچ گیا۔

اب بتایئے یہ اچھا ہے۔کہ ایک نامشروع میں مبتلا ہو کر مسلمان رہے۔یا یہ اچھا ہے کہ ایک نامشروع کو چھوڑ کر بہت سے نامشروع میں بھی مبتلا ہو اور پھر مسلمان بھی نہ رہے۔

من ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما.(کشف الخفاء للعجلونی: ۲:۲۲۳)

جو شخص دو مصیبتوں میں مبتلا ہو۔اس کو چاہیے کہ ہلکی مصیبت کو اختیار کرے۔مثلاً ایک طرف میں گز کی کھائی ہے اور ایک طرف کنواں ہے۔جس میں پچاس ہاتھ پانی ہے۔وہاں ممکن ہی نہیں کہ گر کر زندہ رہ سکے۔جب یہ معلوم ہوگیا۔کہ بغیر گرے پناہ نہیں ۔تو عقل کا فتویٰ تو یہی ہے کہ کھائی اختیار کرے کہ بلا تو ہاتھ منہ ٹوٹنے پر ٹلے گی،جان تو بچ جائے گی۔اسی طرح یہاں بھی واقع میں ایک مصیبت کی اجازت نہیں ہے۔بلکہ اور سینکڑوں معاصی سے بچانا ہے۔

جب ہماری نیت بخیر ہے۔تو ممکن ہے کہ ہم پر حق تعالیٰ کے یہاں ملازمت نہ ہو۔بلکہ ہم

تو کہتے ہیں۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ پر جو اشکال و جواب ہے۔ وہی ہمارا بھی جواب ہے:۔

قَالُوْا يَا مُوْسٰى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّا اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ. قَالَ اَلْقُوْا الآية.

موسیٰ علیہ السلام سے ساحروں نے پوچھا۔ کہ تم اپنا عصا ڈالتے ہو یا ہم ڈالیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ تم ہی ڈالو۔ اشکال یہ ہے۔ کہ ساحروں کا یہ کہنا کہ:۔

اِمَّآ اَنْ تَكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ. (تم اپنا عصاء ڈالتے ہو یا ہم ڈالیں)

جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم کفر کریں۔ کیونکہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے آئے اور گویا یہ کہتے تھے۔ کہ تم اظہار حق کرتے یا ہم اظہار کفر کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اَلْقُوْا یعنی تم اظہار کفر کرو۔ تو کیا موسیٰ علیہ السلام نے اظہار کفر کی اجازت دے دی۔ پس جو جواب ہے اس اشکال کا وہی ماخذ ہے ہمارے قول مذکور کا۔

جواب اس اشکال کا یہ ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کو احقاق حق مقصود تھا۔ اس احقاق کے لئے اجازت اظہار کفر کو وسیلہ بنایا۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام یہ جانتے تھے۔ جب میں عصا ڈالوں گا۔ تو یہ سارے سحر مضمحل ہو جاویں گے۔ جب تک سارے سحر ظاہر نہ ہو لیں گے تو ظہور معجزہ ہوگا کیسے؟ تو واقع میں اظہار کفر کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ احقاق حق کی تمہید تھی۔ پس جو اس جواب کا حاصل ہے۔ وہی ہمارا جواب ہے۔ کہ ظاہراً اجازت ہے امر غیر مشروع کی۔ مگر حقیقت میں روکنا ہے۔ بہر حال ہمارے حضرات ضعفاء کے واسطے اسباب کا چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔

ترک دنیا

ہاں جو لوگ خدام دین اہل ہمت ہیں۔ ان کے لئے یہی زیادہ مناسب ہے۔ کہ وہ اسباب ترک کر دیں۔ کہ دو کام ایک شخص سے نہیں ہو سکتے۔ دیکھو ملازم گورنمنٹ کو کسی اور ملازمت یا تجارت وغیرہ کی اجازت نہیں ہوتی۔ اسی طرح سرکار حقیقی کے ملازم کو بھی نازیبا ہے کہ اور کسی کی ملازمت کرے یا تجارت کرے۔ جس طرح ملازم گورنمنٹ سلطنت کو اپنے مصارف کا کفیل سمجھتا ہے۔ اسی طرح اسے بھی حق تعالیٰ کو اپنی معیشت کا ذمہ دار سمجھنا چاہیے۔ اگر کوئی عالم قاضی ہو جائے یا اور کسی اور منصب پر بھی فائز ہو جائے تو جو اس کا اصلی کام ہے۔ اسے پورے طور پر ہرگز ادا نہیں کر سکتا۔

اہل دین سے دنیا کا سوال

قاضی ثناء اللہ صاحبؒ پانی پتی سے ایک شخص نے نماز کا مسئلہ پوچھا۔ قاضی صاحب نے حوض پر وضو کیا اور دو رکعت شکریہ کی پڑھیں۔ پھر مسئلہ بتایا۔ اس نے پوچھا۔ حضرت مسئلہ بتانے میں اتنا توقف کیوں کیا۔ فرمایا کہ کئی سال میں نماز کا مسئلہ پوچھا گیا۔ ورنہ حدود وقصاص بیع وشریٰ ہی کے مسائل سے سابقہ تھا۔ کیوں کہ قاضی تھے۔ قاضی کے یہاں تو دنیا کے جھگڑے پیش ہوتے ہیں اور غیر ممکن ہے کہ لوگ قاضی صاحب سے اس لئے نماز کے مسئلے نہ پوچھتے ہوں۔ کہ سمجھتے ہوں کہ فرصت نہیں۔ مگر ہمیں تو فرصت ہے کہ کوئی ویسا مشغلہ نہیں۔ مگر لوگوں کو خود توجہ نہیں۔ کہ کوئی شخص ہم ہی سے کوئی مسئلہ پوچھنے آتے بھی ہیں۔ تو یہی فرمائش ہوتی ہے کہ تعویذ دے دو۔

صاحبو! علماء سے تعویذ کی درخواست کرنا ایسا ہی ہے۔ جیسے سنار سے یہ کہنا کہ گھاس کھونے کا کھرپا بنا دو۔ سنار کا کام تو یہ ہے۔ کہ وہ عمدہ نازک زیور بنائے۔ اسی طرح علماء کا کام مسئلے بتانا ہے۔ افسوس! گوشہ نشینوں سے دنیا کے کام کراتے ہو۔ کیا انہوں نے تمہارے دنیا کے کام کرنے کے لئے دنیا کو چھوڑا ہے۔ ہاں دنیا کے کاموں کے لئے دعا کرانا جائز ہے۔ شکایت تو تعویذ کی ہے۔ ہاں اگر دس باتیں دین کی پوچھیں، تو اس میں ایک دنیا کی بھی پوچھ لی تو کچھ حرج نہیں۔ اب غضب تو یہ کرتے ہیں۔ کہ دو ماہ میں تو تشریف لائے اور کہا گیا۔ کہ ایک تعویذ دے دو۔ فلاں کو بخار آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ ریاضت کرتے ہیں۔ اس سے قوت متخیلہ بہت بڑھ جاتی ہے۔ بس جسے تعویذ دیدیں گے وہ جھٹ پٹ اچھا ہو جاوے گا۔

اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ ہماری مثال ایسی ہے۔ کہ ایک شخص بخیل تھا۔ اس نے بہت سے باورچی نوکر رکھ چھوڑے تھے۔ مگر کوئی عمدہ کھانا کبھی کسی سے نہ پکواتا تھا۔ ایک دن ان کے داروغہ نے اس بخیل سے کہا کہ حضور کبھی مہینے دو مہینے میں تو کوئی عمدہ چیز پکوا لیا کیجئے۔ اور یوں خالی بیٹھے رہنے سے تو ہم اپنا فن بھی بھول

جائیں گے۔ بس یہی ہماری حالت ہے۔ کہ کوئی ہم سے مسئلے پوچھتا نہیں۔ جس سے یہ نوبت پہنچی۔ کہ ہم مسئلے بھولنے لگے۔ کوئی بیع وشرا کا مشکل مسئلہ آجاتا ہے تو یاد ہی نہیں۔ جو بغیر کتاب کے بتلاسکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شریعت کے موافق معاملہ کرتا ہی نہیں۔

بہر حال دنیا کے اندر اتنے منہمک ہو رہے ہیں کہ اہل دین سے بھی دنیا ہی کا سوال کرتے ہیں۔ اس وقت بے توجہی کی وجہ سے دین کی بات نہیں پوچھتے۔ اس وقت لوگوں کو اتنی بے توجہی تو نہ تھی مگر خود قاضی صاحب کو فرصت نہ تھی۔

ایک آدمی ایک کام کرسکتا ہے

ایک آدمی ایک کام کرسکتا ہے۔ بہر حال دو کام جمع نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے۔ کہ مولانا محمد مظہر صاحب فرمایا کرتے تھے۔ کہ لوگ کہتے ہیں۔ ذکر و شغل اور درس وتدریس جمع نہیں ہوسکتے۔ یہ ہم نہیں مان سکتے۔ کیوں کہ دونوں کام دین کے ہیں۔ نہ جمع ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ مولانا نے فرمایا۔ خیر نہ مانیئے۔ پھر جب خود ذکر و شغل کیا تو تمانع ہوا۔ بس اقرار کرلیا۔ کہ واقعی دونوں جمع نہیں ہوسکتے۔

میں دیوبند میں طالب علم تھا۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ وہاں تشریف لے گئے۔ میں نے بیعت کی درخواست کی۔ فرمایا اس وقت یہ شیطانی خیال ہے۔ جب کتابیں ختم ہوجائیں گی۔ اس وقت اس کا قصد کرنا۔ اس وقت تو مولانا کے اس طرح فرمانے سے بہت تعجب ہوا۔ مگر اب معلوم ہوگیا کہ واقعی ٹھیک فرمایا تھا۔ کیونکہ تحصیل علم فرض ہے۔ گو یہ بھی فرض ہے۔ اور ہم نے مانا کہ تحصیل علم سے بڑھ کر ہے۔ مگر جس طرح نماز فرض ہے اور وضو سے بڑھ کر ہے مگر بغیر وضو کے نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح درویشی بھی فرض سہی اور بڑھ کر سہی تحصیل علم سے۔ مگر تحصیل علم اس کے لئے بمنزلہ وضو کے ہے۔ تو جس طرح وہاں اہمیت باعتبار موقوف علیہ ہونے کے وضو میں ہے۔ یہاں تحصیل علم میں ہے۔ تو بہر حال جب دو کام دین کے جمع نہیں ہوسکتے۔ تو ایک کام دنیا کا اور ایک دین کا کہاں جمع ہوسکتا ہے۔ اس لئے ہمارے حضرات صاحب ہمت کے لئے افضل سمجھتے ہیں۔ کہ سوائے حق تعالیٰ کے کسی سے اس کا تعلق نہ ہو۔ اسی کو فقہاء نے سمجھا ہے۔

قبولیت دعوت کے لئے دستور

لوگ کہتے ہیں فقہاء درویش نہیں تھے۔ ہاں اس معنی کرنہ تھے۔ کہ رونا رلانا نہیں آتا۔ مگر رونا ہی عبادت نہیں۔ ہر چیز عبادت ہے۔ ہنسا رونا سب۔ بعض تو فقہاء کو یہاں تک کہتے ہیں۔ کہ کوتوال تھے۔ ہم نے مانا کہ کوتوال تھے۔ مگر اس کی کیا دلیل کہ دوسرا وصف ان میں نہ تھا۔ تو فقہاء نے علماء کے واسطے یہ دستور العمل لکھا ہے۔ کہ ہر جگہ کی دعوتیں مت کھاؤ۔

میں نے مدرسہ کانپور میں یہ قانون مقرر کر دیا تھا۔ کہ طلباء دعوت کھانے کہیں نہیں جائیں گے۔ جس کو کھانا کھانا ہو یہیں لا کر کھلایا جائے۔ لوگ کہتے ہیں بڑے متکبر ہیں۔ اچھا صاحب! متکبر ہی سہی۔ کیا کیا جائے۔ جب لوگ طلبہ کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی اکرام کرے تو وہاں جانے میں کچھ حرج نہیں مگر اب تو کچھ پوچھو نہیں۔ کہ لوگ کیسا سمجھتے ہیں۔

ایک طالب علم ایک تحصیلدار کے یہاں کھانا لینے جایا کرتے تھے۔ کھانا ملنے میں دیر ہو جایا کرتی تھی۔ یہ خالی بیٹھے رہا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے تحصیلدار صاحب سے کہا۔ میں اتنی دیر خالی بیٹھا رہتا ہوں۔ آپ کا لڑکا جو انگریزی پڑھتا ہے۔ اس وقت تعطیل کے وقت بے کار پھرتا ہے۔ میں اسے عربی بھی شروع کرا دوں۔ وہ تحصیلدار کہنے لگے۔ مولانا آپ نے عربی پڑھی تو میرے دروازے پر مانگنے آتے ہیں۔ یہ پڑھے گا تو آپ کے دروازہ پر مانگنے جایا کرے گا۔ اس پر اتنا تعجب نہیں۔ جتنا ان طالب علم پر ہے کہ وہ پھر بھی کھانا لاتے رہے۔

بئس المطاعم حین الذل تکسبها　　　القدر منتصب والقدر مخفوض

(بہت سے کھانے تیری ذلت کا موجب ہیں، کہ ہانڈی تو چڑھی ہے مگر قدر و منزلت رسوا ہو رہی ہے)

ہمارے بعض اہل علم عذر میں یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

آں کہ شیراں را کنند روبہ مزاج　　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

(جو چیز شیروں کو لومڑی مزاج بنا دیتی ہے وہ احتیاج ہے احتیاج ہے احتیاج ہے)

مگر اس کا جواب میں وہی دوں گا جو شہزادۂ ایران نے دیا تھا۔ میرے بڑے ماموں

صاحب ایک نواب کی حکایت بیان کرتے تھے۔ کہ ایک مرتبہ سرائے لکھنؤ میں ایک مسافر شہزادۂ ایران نے ان کی دعوت کی۔

شریف گر متضعف شود خیال مبند　　　　کہ پائے گاہ رفیعش ضعیف خواہد شد

(شریف اگر متواضع نہ ہو تو خیال مت کرو کہ اس کا بلند مقام کمزور ہو جاتا ہے)

نواب صاحب نے دعوت کھائی۔ مگر اس وقت شہزادہ کی کچھ خدمت نہ کر سکے اور یہ کہا ۔ کہ آپ ہماری ریاست میں تشریف لائیے۔ یہ ایک بار وہاں آئے ٹٹو پر سوار۔ مگر پھٹے حال۔ نواب صاحب کو اطلاع ہوئی۔ غایت شوق میں باہر آگئے اور ان کی خستگی کو دیکھ کر ہمدردی سے یہ بے جوڑ شعر پڑھا دیا۔

آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج　　　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

(جو چیز شیروں کو لومڑی مزاج بنادیتی ہے وہ احتیاج ہے، احتیاج ہے احتیاج ہے)

یہ سننا تھا کہ شہزادہ بھڑک اٹھا اور فی البدیہ یہ پڑھ دیا۔

شیر نر کے می شود روبہ مزاج　　　　می زند بر کفش خود صد احتیاج

(شیر نر کب لومڑی مزاج بن سکتا ہے، وہ سو ضرورتوں پر ٹھوکر مارتا ہے)

یہ پڑھ کر وہاں سے لوٹا۔ پھر نواب صاحب نے ہزار ہاتھ جوڑے مگر وہ نہیں ٹھہرا۔ تو حضرت ہم بھی آپ کے عذر کا یہی جواب دیں گے۔ ہاں اگر کہیں عزت ہوتی ہو اور اہانت نہ ہوتی ہو تو جاؤ کچھ حرج نہیں بلکہ وہاں نہ جانا تو ایک قسم کا تکبر ہے۔

بہرحال علماء کو حضرت بہلول کا مذہب اختیار کرنا چاہیے۔ کہ ایک مرتبہ شہر میں شدت کی قحط سالی تھی۔ کسی نے عرض کیا۔ حضرت روٹی بہت مہنگی ہوگئی ہے۔ فرمایا بھائی یہ اس سے کہو جس کے ذمہ تقسیم ہے۔ ہمیں کیا ہمیں تو برابر ملے جاوے گی۔ جاؤ اپنا کام کرو۔

صاحب حال کا حکم

ایک اور بزرگ دنیا سے تائب ہونے کی وجہ بیان فرماتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ سخت قحط سالی تھی۔ تمام لوگ فکر میں تھے۔ میں نے ایک غلام کو دیکھا۔ کہ خوب موٹا تازہ ہے اور بے

فکری سے گیند اچھالتا پھر رہا ہے۔ میں نے کہا تمام مخلوق کو قحط سالی سے پریشانی ہے۔ تمہیں بالکل فکر نہیں۔ جو اس آزادی سے پھر رہے ہو۔ اس نے کہا مجھے فکر کی کیا ضرورت ہے۔ میرا نفقہ آقا کے ذمہ ہے۔ اس کے دس گاؤں ہیں۔ اب مجھے کیا فکر۔ فرماتے ہیں وہ بزرگ اس کے جواب سے میرے قلب پر چوٹ لگی۔ کہ اس کا آقا صرف دس گاؤں کا مالک ہے۔ اس پر اسے اتنے بے فکری ہے اور اے نفس! تیرا مالک تو تمام سماوات وارض کا مالک ہے۔ پھر تجھے اس قدر فکر۔ بس میں نے فوراً توبہ کی۔

اس حکایت سے کوئی صاحب کہیں یہ نتیجہ نہ نکالیں۔ کہ بس ہم بھی فکر ہو کر بیٹھ جائیں۔ نہ ہمیں نوکری کی ضرورت ہے نہ تجارت و زراعت کی۔ کیونکہ یہ بزرگ صاحب حال تھے۔ گر تم پر حال طاری ہو تو بسم اللہ مبارک ہو سب کو چھوڑ دو۔ خوب سمجھ لینا چاہیے۔

اکابر دیوبند کی دقت نظر

ہمارے حضرت کی اتنی دقیق نظر تھی۔ کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ جیسے زبردست عالم ایک سوال کریں اور حضرت انہیں جواب مسکت دیں۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت مولانا کی اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی ایک ریاست سے نوکری آئی۔ سو روپے تنخواہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی تھی اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تین سو روپے تھی۔ مولانا محمد قاسم جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ میں فلاں مطبع میں دس روپے کا ملازم ہوں۔ ملاحظہ کیجئے۔ کہ مولانا اور دس روپے۔ قرآن کی تصحیح کا کام کرتے تھے۔ ہر چند مالک مطبع نے اضافہ کرنا چاہا۔ مگر یہی فرمایا کہ میں تصحیح کا کام کر سکتا ہوں۔ اس کے لئے یہی بہت ہیں۔ تو تحریر فرماتے ہیں۔ کہ میں دس روپے کا نوکر ہوں۔ مجھے اسی کے خرچ کرنے کی فکر رہتی ہے۔ سو پانچ روپے تو اہل وعیال کو دیتا ہوں اور پانچ روپے طالب علموں کی ضروریات میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ تین سو ملیں گے۔ تو مجھ کو تو وہی پانچ روپے کافی ہوں گے۔ بقیہ کے لئے ہر وقت میں اسی خلجان میں رہا۔ کہ کیوں کر خرچ ہوں گے۔ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تجویز فرماتے ہیں۔ کہ میں تین سو روپے سے کم پر نہیں آسکتا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا، حضرت آپ نے یہ کیا کیا۔

اگر وہاں سے منظوری ہو جاوے۔ تو پھر کیا کیجئے گا۔ آپ کے مقابلہ میں تو ایک لاکھ بھی تھوڑے ہیں۔ تو اس کے آگے مولانا نے تحریر فرمایا۔ کہ لیکن جب چاہوں گا۔ گھر رہوں گا۔ جب چاہوں گا نوکری پر۔ جب خط وہاں پہنچا۔ معلوم ہو گیا کہ یہ حضرات کہیں نہیں جائیں گے۔ تو بس حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی یہ دس روپے کی نوکری برائے نام نوکری تھی۔ نام تو تھا نوکری کا۔ مگر حقیقت میں کیا یہ نوکری کی تھی۔

اس حالت میں حضرت حاجی صاحبؒ سے رائے لیتے ہیں۔ نوکری چھوڑنے کی۔ حضرت فرماتے ہیں۔ پوچھنا دلیل تردد کی ہے۔ تو وہ دلیل خامی کی ہے۔ خامی میں نوکری چھوڑنا مناسب نہیں۔ جب قوت ہوگی تو رسے تڑوا کے بھاگو گے۔ بلکہ پوچھیں گے بھی نہیں۔ اللہ اکبر سارے ارسطو، افلاطون، بقراط وسقراط جمع ہو کر تو ایسا کلیہ نکال دیں تو ضعیف کے لئے یہی مسئلہ ہے کہ نوکری نہ چھوڑے۔

ایک صاحب میرے پاس آئے تھے۔ اپنی زمینداری سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ میں نے منع کیا۔ بعد چند روز کے ان کی حالت سنبھلی۔ تو احساس ہوا۔ میرے بڑے شکرگزار ہوئے۔

حضرت حاجی صاحبؒ سے ایک بی بی نے اپنی جائیداد وقف کرنے کی اجازت چاہی۔ حضرت نے منع کیا۔ اگر کوئی کہے نیک کام سے منع کیا۔ تو صاحب نے نیک کام سے منع نہیں کیا۔ بلکہ شر سے روکا۔ ہاں کسی میں قوت ہو جاوے تو وہ مستثنیٰ ہے۔ اگر کوئی کہے۔ کہ ہمیں کیوں کر معلوم ہو کہ ہم میں اتنی قوت پیدا ہوگئی ہے۔ کہ ہم ترک اسباب پر صبر کر سکتے ہیں۔ کیا وہی ہوگا۔ تو بات یہ ہے۔ کہ ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں۔ جن سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ کہ ہم میں قوت پیدا ہوگئی ہے اور اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو شیخ کامل سے پوچھے۔ اگر بزرگ سے ترک اسباب کی اجازت ہو جاوے۔ تو اگر کمی بھی ہو تو شیخ کی برکت سے قوت بہت ہو جاتی ہے۔ بہرحال یہ تفصیل تھی ترکِ اسباب کی۔ جس کا حاصل یہ تھا۔ کہ جو اقویا ہیں ان کے لئے ہمارے حضرات ترکِ اسباب تجویز کرتے ہیں۔ ایسا شخص حق تعالیٰ کا مہمان ہوتا ہے۔

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا۔ کہ حضرت معاش کی کیا سبیل ہے فرمایا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ضیافت تین دن ہے۔ ہم اللہ کے مہمان ہیں اور اللہ میاں کے یہاں ہر دن

ایک ہزار برس کا ہوتا ہے۔تو ہم تین ہزار برس تک تو اللہ میاں کے مہمان ہیں۔جب چوتھا ہزار شروع ہوگا تو معاش کی سبیل پوچھنا۔سواتنی مدت تک ہمیں ہی نہیں رکھیں گے یہ نہ سمجھو کہ یہ شاعری ہے بلکہ ان کی یہ حالت ہوتی ہے اسی کو ایک لطافت سے ظاہر کر دیا پس اس پر استدلال کے متعلق حرج نہیں ہوسکتا۔مثلاً اگر کوئی طالب علم شبہ کرنے لگے کہ ہزار برس کا ایک برس یہ آج کے لئے تھوڑی ہے۔یہ تو قیامت کے واسطے ہے۔تو بات یہ ہے کہ یہ تو بزرگوں کے لطائف ہیں۔دلیل نہیں ہے۔دلیل تو یہ ہے:

آفتاب آمد دلیل آفتاب　　　گر دلیلت باید از وے رومتاب

(سورج اپنے وجود کی خود دلیل ہے اگر تمہیں اس کی دلیل مطلوب ہوتو اس سے منہ پھیرو)

یعنی ان کی دلیل تو قوت قلب ہے وہ نظر آوے تو پھر کچھ بھی شبہ نہیں اور جسے نظر نہیں آتی اسے اسی طرح سمجھاتے ہیں۔ان کا استدلال تو قوت قلب ہے۔جب یہ حالت پیدا ہو جائے تو ایسے لوگوں کو ترک اسباب جائز ہے۔الحاصل دنیا کو دین پر قیاس نہیں کر سکتے۔کیوں کہ کسب دنیا ضعفاء کے اور کسی کے لئے ضروری نہیں۔تو بہر حال کوئی مادہ تو ایسا نکلا جہاں دنیا چنداں ضروری نہیں۔اگر اس میں کسی کو بے فکری ہو تو کچھ حرج نہیں۔اگر اس میں یہ حالت ہو کہ

کسے را با کسے کارے نبا شد　　　(کسی کو کسی سے کوئی کام نہیں)

تو کچھ مضائقہ نہیں۔

دین میں بے فکری

لیکن دین میں تو کوئی مادہ ایسا نہیں نکل سکتا جس میں وہ ضروری نہ ہو۔بلکہ دین ہر مادہ میں ہر وقت ضروری ہے۔سو دنیا میں بے فکری ہونے سے بھی دین میں بے فکری کی اجازت نہیں ہو سکتی۔لیکن خیر پھر بھی اگر کسی شخص کو دین میں بھی بے فکری ہو اور دنیا میں بھی۔کہ اگر اپنے بچہ کو کنویں میں گرتے دیکھے اور پھر بے فکری سے منہ پھیرے اور گرنے دے تو ہمیں صبر آجاتا کہ ان کی آزادی طبعی ہے۔شکایت بالکل تو رفع نہ ہوتی۔کہ کہاں دین اور کہاں دنیا۔مگر ہاں قلیل ہو جاتی اور اب تو بہت بڑی شکایت ہے۔کہ دین میں آزادی ہے اور دنیا میں نہیں۔یہ تفاوت کیوں ہے؟۔

تفاوت کی بناء صرف یہی ہے کہ جس کو اپنے نزدیک ضروری سمجھا۔ اس میں تو توجہ کی اور جسے غیر ضروری سمجھا۔ اس میں بے فکری اختیار کرلی۔ چنانچہ نفع دنیا کو جب ضروری سمجھتے ہیں تو اپنی اولاد کو صنعت وحرفت بڑی توجہ کے ساتھ سکھاتے ہیں اسی طرح ضرر دنیا کو عظیم سمجھتے ہیں اسی لئے اپنے بچہ کو کنویں میں گرنے سے بچاتے ہیں۔ وہاں پر تو دیکھئے اپنی آزادی میں بھی خلل ڈالتے ہیں اور ان کی آزادی میں بھی خلل ڈالتے ہیں۔ یہ کیا دنیا کے بارے میں تو ہمیں اتنی توجہ دیں کہ باب میں ہم اتنے کیوں آزاد ہیں کہ دوسرے کی اصلاح سے تو خبر ہی نہیں اور اس تعرض سے میرا یہ مطلب نہیں ہے شاید کسی کو غلط فہمی ہو۔ کہ ساری دنیا سے لڑتا جھگڑتا پھرے۔ میں اس کو صاف کہے دیتا ہوں۔ کیوں کہ مجمع عام اور خطاب عام میں ضرورت ہوتی ہے کہ مختلف پہلو صاف کردیئے جائیں۔ خطاب خاص میں تو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

صوفیاء کی تعلیم

یہی راز ہے صوفیاء کی خلوت کی تعلیم کا۔ لوگ سمجھتے ہیں وہ شریعت نہیں۔ اس لئے خلوت میں تعلیم دیتے ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت لوگوں کا یہ گمان تھا کہ ان کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی خاص باتیں تعلیم فرمائی ہیں جو اوروں کو نہیں بتائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ:

هل خصكم رسول الله صلى الله عليه وسلم بشي ء من دون الناس

یعنی کیا تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی باتیں بتائی ہیں جو اوروں کو نہیں بتائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

والله ما خصنا رسول الله صلى الله عليه وسلم بشي ء الا فهما اديته الرجل في القران.

بخدا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے ساتھ مجھے مخصوص کیا ہو ہاں مجھے ایسا فہم ضرور ملا ہے جس سے قرآن سمجھتا ہوں اور اس فہم سے کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے معنی سمجھ میں آتے ہیں جن پر عوام کی دسترس نہیں ہے۔

اور وہ معنی وہ نہیں ہیں۔ جو صوفیاء بیان کرتے ہیں۔ مثلاً
اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (فرعون کی طرف جا، بے شک اس نے سرکشی اختیار کی ہے)
کہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہے۔ فرعون کی طرف جانے کا تو وہ موسیٰ سے مراد روح لیتے ہیں اور فرعون سے مراد نفس لیتے ہیں تو معنی یہ ہوئے کہ جا اے روح نفس کی طرف اور قرآن کے جو دو معنی ہیں ایک ظاہر اور ایک باطن، سو صوفیاء جو ایسے معانی بیان کرتے ہیں۔ نہ یہ ظاہر قرآن ہیں نہ باطن قرآن۔ ظاہر کیا ہے مدلول اولیٰ قرآن کا۔ کہ جسے عام لوگ سمجھتے ہیں۔ مثلاً لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الأية فئی کا ذکر ہے۔ یعنی فیٔ (مال غنیمت) مہاجرین کے لئے ہے۔ اس کو سب سمجھ گئے اور باطن کیا ہے۔ وہ وہ ہے۔ جو مثلاً اسی آیت میں مجتہدین سمجھے اور ان کے سمجھنے کے بعد ہم بھی اب سمجھ گئے کہ واقعی یہی معنی ہیں۔ مثلاً ابوحنیفہ اور دیگر آئمہ میں (رحمہم اللہ تعالیٰ) اس مسئلہ میں گفتگو ہوئی۔ کہ اگر کفار قہراً مسلمانوں کے مال پر قابض ہو جائیں۔ تو مالک بن جاتے ہیں یا نہیں۔ سب ائمہ کی رائے تھی کہ مالک نہیں ہوتے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ مالک ہو جاتے ہیں اور دلیل اس کی یہی آیت ہے۔ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ کیوں کہ فقیر کی تعریف یہ ہے۔

من لا يملک شيئا

جو کسی چیز کا مالک نہ ہو اور ظاہر ہے کہ مہاجرین ہجرت سے پہلے مال دار تھے۔ مگر ہجرت کے وقت وہ مال کفار مکہ کے قبضہ میں ہو گیا تھا۔ اگر کفار مکہ قبضہ سے ان کے مال کے مالک نہ ہوتے۔ تو ان کو فقراء کیوں کہا جاتا اور مجاز خلاف اصل ہے۔ دیکھئے اب ہماری سمجھ میں بھی آ گیا۔

اور امام صاحب کا یہ مسئلہ ہم لوگوں کے حق میں بڑی رحمت ہے اگر یہ مسئلہ نہ ہوتا تو آج ہمیں حلال روزی نہ ملتی۔ اس واسطے کہ آج کل غیر مسلم سلطنتوں میں تحصیل واصول شریعت کے موافق کہاں ہوتی ہے۔ ہم جن کی نوکری کرتے ہیں وہ ہمیں تنخواہ دیتے ہیں اور ان کی تحصیل اصول شریعت کے موافق نہیں۔ اس لئے اور آئمہ کے نزدیک وہ خود مالک نہیں ہوئے۔ تو ان کے دینے سے ہم کب مالک ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ تملیک تو فروع ہے۔ ملک کی مگر امام صاحب کے نزدیک وہ مالک ہو گئے اس لئے ان کے دینے سے ہم بھی مالک ہو

جاتے ہیں۔اسی واسطے اسلامی ریاستوں کی نوکری سے غیر اسلامی ریاستوں کی نوکری کو اچھا سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یہ شرعاً مالک ہوگئے اور وہ مالک نہیں ہوئے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ بات ہے بڑی عجیب۔ کہ مسلم کی نوکری سے غیر مسلم کی نوکری اچھی۔ ہاں جی عجیب ہی سہی۔ تو یہ مصلحت ہے امام صاحب کے مذہب میں۔ ایک انگریز کا قول ہے کہ امام صاحب کے مذہب پر تو سلطنت چل سکتی ہے اور آئمہ کے مذہب میں یہ بات نہیں۔ چونکہ یہ لوگ اہل تمدن وسیاست ہیں۔ اس لئے اسباب میں ان کی شہادت معتبر ہے۔ تو یہ ہے باطن قرآن اور یہ ہر شخص کے ائمہ کے موافق متفاوت ہوتا ہے۔ مثلاً امام صاحب کے مرتبہ سے جن کا مرتبہ بڑا ہے۔ وہ اس سے آگے کے باطن تک پہنچتے ہیں۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام اسی کو کہتے ہیں:

حرف حرفش راست در بر معنے　معنے　در معنئے　در معنے

(ہر ہر حرف معنی میں درست ہے معنی اندر معنی اندر معنی میں)

غرض صوفیاء جو خلوت میں تعلیم دیتے ہیں۔ وہ تعلیم شرعی ہی ہوتی ہے۔ مگر عوام میں بیان کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اب لوگ نا معلوم کیا سمجھتے ہیں۔

اسی واسطے ایک غیر مسلم نے آج کل سلطنت کو رائے دی ہے کہ صوفیوں کی خلوت کی تعلیم قابل نگرانی ہے۔ کیونکہ مولوی تو جو کچھ کہتے ہیں منبر پر بیٹھ کر کہتے ہیں۔ جو سب پر آشکارا ہو جاتا ہے اور یہ لوگ چپکے سے کہتے ہیں۔ تو ان سے بڑا اندیشہ ہے۔ کہ خدا جانے کیا سکھا دیں۔ استغفر اللہ وہ کیوں ایسا کرنے لگے۔ اگر یہ کہو کہ ایسا نہیں۔ تو الگ کیوں تعلیم کرتے ہیں۔ الگ اس لئے تعلیم کرتے ہیں کہ ایک شخص کی طبیعت کے موافق وہ ایک ہی پہلو پر گفتگو کرتے ہیں۔ اگر مجمع عام میں بیان کریں تو ایک ہی بات سے ہر شخص اپنی اپنی طبیعت کے موافق ایک ایک پہلو نکال لے گا۔ اس لئے ان کو اس کی ضرورت ہوگی۔ کہ تمام پہلو خود ہی بیان کر کے ان پر منطبق کرے۔ تو اس کے لئے بڑا وقت چاہیے۔

آداب اصلاح

چنانچہ میں اس وقت اس پہلو کو بیان کر رہا تھا۔ کہ دنیا کی فکر تو ہے۔ دین کی فکر کیوں نہیں ہے۔ اس پر یہ بیان کرنا چاہتا تھا کہ اگر دین کی فکر ہو۔ تو اس طرح نہ ہو۔ جیسے ہمارے بعض احباب ہوا سے لڑتے پھرتے ہیں۔ کہ ہم بزرگ ہیں۔ تو ساری دنیا بھی بزرگ بن جائے۔ اگر کسی نے تمہیں نسخہ بخار کا لکھ دیا ہے تو تم خود پیو۔ ساری دنیا کو کیوں پلاتے پھرتے ہو۔ تو دین کی فکر کرتے ہیں تو ایسی کرتے ہیں جیسے بندر کے ہاتھ ادرک کی گرہ لگ گئی تو وہ بھی پنساری بن بیٹھا۔ دو چار مسئلے اصلاح الرسوم سے لے لئے اور ساری دنیا سے لڑنے لگے۔ جو کچھ تم کہتے ہو اگر وہ صحیح بھی ہے تو اس کے آداب کی ضرورت ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے راستہ کی حکمت اور اچھی اچھی باتوں سے بنا ہے)

دین کی طرف بلاؤ۔ مگر حکمت سے بلاؤ۔ اصلاح کیلئے بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔

یہ اصلاح کا طریقہ نہیں ہے۔ جس طرح ہمارے یہاں ایک صاحب تشریف لائے تھے۔ عصر کی نماز پڑھی۔ بعد نماز کے دعا مانگنے سے پہلے ہمارے یہاں ایک اہل علم مہمان تھے۔ وہ تنگی کی وجہ سے صف سے ذرا پیچھے کی طرف کھسک کر بیٹھ گئے۔ یہ ہمارے مصلح صاحب کیا سمجھے کہ شاید انہوں نے نماز بھی اسی طرح پڑھی ہوگی۔ بس جھٹ پکار کر کہنے لگے۔ صف ٹیڑھی کرنا جائز نہیں۔

میں نے کہا تمیز بھی ہے۔ اول تو تمہیں تحقیق کرنا چاہیے تھا۔ کہ نماز بھی اسی طرح پڑھی ہے یا نہیں۔

دوسرے اگر محقق بھی ہو جاتا۔ تو بھی نرمی سے کہنا چاہیے تھا۔

تیسرے یہ کہ تم ایک عامی آدمی تمہیں تو بعد تحقیق کے بھی کسی اہل علم کو کہنے کا منصب نہیں ہے۔ چہ جائیکہ تم اتنی سختی سے کہتے ہو۔ اسی طرح علماء کو عوام پر بھی سختی نہ کرنا چاہیے۔ ہاں کہیں خاص قدرت ہو تو مضائقہ نہیں۔ مگر بلا ضرورت وہاں بھی سختی نہ کرنا چاہیے۔

جو واقعی مصلحین ہیں۔ انہوں نے اتنی رعایت کی ہے کہ کیا ٹھکانہ ہے۔ حضرت شاہ

عبدالعزیز صاحب کے بھائی نے ایک شخص کو مسجد میں ٹخنوں سے نیچا پاجامہ پہنے دیکھا اس وقت تو اور کچھ فرمایا۔ صرف یہ فرمایا کہ بعد نماز کے ذرا ٹھہر جایئے گا۔ مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے۔ وہ ٹھہر گئے۔ سب چلے گئے تو فرمایا مجھ میں ایک عیب ہے۔ اس کے متعلق میں آپ سے مشورہ لینا ہے۔ یہ مجھے خیال ہوتا ہے۔ کہ میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتا ہے۔ اور اس پر یہ وعیدیں ہیں۔ سو تم ذرا دیکھنا۔ کہ آیا واقعی لٹک جاتا ہے۔ یا محض میرا واہم ہے۔ انہیں فوراً تنبہ ہوا اور کہا کہ حضرت آپ میں تو یہ عیب موجود نہیں۔ مگر ہاں مجھ میں ہے۔ اب میں توبہ کرتا ہوں۔ کہ ان شاء اللہ کبھی ٹخنوں سے نیچا پاجامہ نہ پہنوں گا۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے۔ اس رعایت کا۔ اسی کو شیخ شیرازی فرماتے ہیں:۔

شنیدم کہ مردان راہِ خدا　　دل دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام　　کہ بادوستانت خلاف ست وجنگ

(میں نے سنا کہ مردانِ راہِ خدا نے دشمنوں کو بھی رنجیدہ نہیں کیا، تجھ کو یہ مرتبہ کب حاصل ہو سکتا ہے، اس لئے کہ دوستوں کے ساتھ بھی تیری لڑائی اور مخالفت ہے)

ظاہری تقدس

خدا جانے ہمیں تقدس پر کیوں ناز ہے۔ ہماری تو حقیقت کیا ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے:۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ.

کہ اگر ہم چاہیں تو سارا علم سلب کر لیں۔ ہمیں اپنے تھوڑے سے علم اور تھوڑے سے تقدس پر اس قدر ناز۔ ہمیں کاہے کا ناز ہے۔ جہاں ذرا تسبیح ہلائی اور بزرگ ہو گئے۔ اب ساری دنیا سے جھگڑتے پھرتے ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں:

غافل مرو کہ مرکب میدان مردرا　　در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش　　ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل ہو کر نہ چل اس لئے مردان راہ کے گھوڑے سخت جنگل میں چلنے سے عاجز

رہے ناامید بھی مت ہو اس لئے کہ رند شرابی اچانک ایک نالہ سے منزل پر پہنچ گئے۔)
آپ کو کیا خبر ہے کہ آپ کا سارا تقدس دھرارہ جائے اور جن سے آپ جھگڑتے پھرتے ہیں ان کی آناً فاناً منزل تک رسائی ہو جائے۔
ہرہ کے ایک دوست بیان کرتے تھے۔ ایک شخص تمام عیوب میں مبتلا تھا۔ مگر یہ ہنر بھی تھا کہ خدائے تعالیٰ سے پوری محبت تھی۔ چنانچہ جب کوئی اسے کچھ کہتا تو وہ یہ کہتا کہ تم کون۔ ہم جانیں اور ہمارا خدا۔ ایک دفعہ بیٹھے بیٹھے اسے یہ خیال آیا کہ میں اس قدر گنا ہوں میں مبتلا ہوں۔ میرا کیا حال ہوگا۔ یہ خیال آنا تھا کہ رونے لگا۔ حتیٰ کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی اور کھانا پینا سب بند ہو گیا۔ تین چار دن اس کی یہی کیفیت رہی۔ اس کے بعد انتقال ہو گیا۔
میں کہتا ہوں کہ یہ گنہگار شہید بلکہ شہید اکبر مردانہ خدا کی تلوار سے مارا گیا:

نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(ناامید بھی مت ہو اس لئے کہ رند شرابی اچانک ایک ایک نالہ سے منزل پر پہنچ گئے)
حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایک بنئے کو خواب میں دیکھا کہ جنت میں ہے۔ پوچھا تم یہاں کہاں۔ کہا مرتے وقت کلمہ پڑھ لیا تھا۔ اب کیا کسی کو حقیر سمجھتے ہو۔ اگر خدا چاہے ذرا سی دیر میں ناپاکی کو دھو کر طاہر بلکہ مطہر بنادے۔ خواہ کتنا ہی بڑا کافر ہو۔
ایک شخص نے مجھ سے یہ پوچھا۔ کہ یزید کو لعنت کرنا کیسا ہے۔ میں نے کہا۔ اس شخص کو جائز ہے جسے یقین ہو کہ ہم یزید سے اچھی حالت میں مریں گے۔ بس چپ ہی تو رہ گئے۔:

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما گہ خندہ زند دیو ز ناپاکی ما
ایمان چو سلامت بلب گور بریم تحقیق شود پاکی و ناپاکی ما

(کبھی فرشتہ ہماری پاکی پر رشک کرتا ہے کبھی شیطان ہماری ناپاکی پر ہنستا ہے اگر ہم قبر تک ایمان سلامت لے جائیں تو ہماری چستی و چالاکی پر آفرین کہنا)
ابھی کیا خبر کہ مرتے وقت ہم کس حال میں ہوں گے۔ ابھی تو کشتی مجدھار میں ہے۔ اللہ جانتا ہے یہ فکر وہ فکر ہے۔ کہ اس کے بعد نہ کسی کی تکفیر کی فکر ہوتی ہے نہ تفسیق کی۔ میں اصلاح کو منع نہیں کرتا۔ مگر ہاں حقیر نہ سمجھو۔ کیونکہ یہ تو تکبر ہے۔ خدا جانے انجام کیا ہو۔ چنانچہ ابھی سن

چکے ہو۔ کہ اس شخص میں کتنے عیوب تھے۔ مگر بلا کسی وعظ، بلا کسی شیخ کے منزل تک پہنچ گیا۔

اسی طرح شیطان کو دیکھو۔ کہ خدا کی قدرت ہے۔ آٹھ لاکھ برس تک عبادت کرتا رہا۔ مگر ایک بات سے انکار کر کے مردود و مطرود ہو گیا۔ میں نے اس مقام پر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ وہاں تو ذرا میں پکڑ لے۔ ذرا میں نواز دے۔ میں کہتا ہوں یہ اللہ میاں پر تہمت ہے۔ کہ ذرا میں پکڑ لیتے ہیں۔ اس سے توبہ کرو۔ وہاں تو سبقت رحمتی علی غضبی ہے۔ ہاں یہ بالکل صحیح ہے کہ ذرا ان میں نواز دیتے ہیں۔

باقی یہ نہیں ہوتا کہ ذرا میں پکڑ لیں۔ یہ شاہ اودھ نہیں ہیں۔ کہ اندھیر نگری چوپٹ راج ہو کہ ذرا کسی سے ناخوشی ہوئی۔ اب پھانسی کے ادھر اسے مفر نہیں۔ شیطان جو راندہ گیا۔ تو کوئی تھوڑی بات نہ تھی۔ جس پر راندہ گیا۔ حکم ہوا کہ سجدہ کرو۔ تو کہتا ہے نہیں کرتے۔ اگر آپ کا کوئی نوکر اس طرح جحود کرے۔ تو بتایئے! کہ آپ کو کس قدر طیش ہوگا اور وہ نالائق تو حجت بھی کرتا ہے۔ کہ:

خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ. (تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا)

کہ میں آدم کو سجدہ کیسے کروں؟ مجھے نار سے پیدا کیا ہے اور انہیں خاک سے۔ تو اس کی رائے میں یوں ہونا چاہیے تھا۔ کہ آدم اسے سجدہ کرتے۔ حجت کے ساتھ انکار کرتا ہے۔ گویا خدا کے امر کو بے وقوفی سمجھتا ہے۔ پھر یہ کتنی بڑی بات ہے کہ حکیم مطلق ایک امر کرے اور یہ اس کا مبنی حماقت سمجھ کر اس کے امتثال سے انکار کرے۔ تو دیکھو اتنی عبادت بھی کی۔ پھر بھی ہونے والی بات ہوئی۔ تو اے نفس! کیا ناز کرتا ہے۔ اپنی عبادت پر خاقانی کہتے ہیں:۔

ابلیس گفت طاعت من بیکر از بود
سیمرغ وصل را دل و جان آشیانہ بود

آدم زخاک بود من از نور پاک او
گفتم منم یگانہ و او خود یگانہ بود

در لوح بدنوشتہ کہ ملعون شود یکے
ہردم گمان بہرکس برخود لمان نبود

شیطان کہتا ہے۔ کہ میں نے لوح محفوظ میں لکھا دیکھا تھا۔ کہ آدم مخلوق ہوں گے۔

پھر ان کو سجدہ کا حکم ہوگا اور ایک شخص سجدہ سے انکار کر کے ملعون ہوگا۔ مجھے ہر شخص پر شبہ تھا۔ کہ شاید یہ ملعون ہوں۔ مگر خود اپنے اوپر شبہ نہ ہوا۔ کیونکہ اپنی عبادت کی وجہ سے اپنے ساتھ حسنِ ظن بہت بڑھا ہوا تھا اور بڑا ناز تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ حکم ہو جائے کہ سوائے ایک شخص کے کوئی دوزخ میں نہ جائے گا۔ تو میرا گمان نہ فرعون پر ہو۔ نہ ہامان پر۔ نہ قارون پر، نہ نمرود پر۔ بلکہ مجھے یہی خوف ہوگا کہ کہیں وہ ایک میں ہی نہ ہوں۔ اسی طرح اگر یہ حکم ہو جائے۔ کہ سوائے ایک کے کوئی جنت میں نہ جائے گا۔ تو مجھے یہ احتمال ہوگا کہ شاید وہ ایک میں ہی ہوں:

او خواست تا فسانہ لعنت کند مرا ۔۔۔ کرد آنچہ خواست آدم خاکی بہانہ بود
گویند جاہلان کہ نہ کردے تو سجدہ ۔۔۔ نزدیک اہل معرفت ایں چہ بہانہ بود

(اس نے چاہا کہ اس فسانہ سے مجھ پر لعنت کرے، جو چاہا خود کیا آدم خاکی تو بہانہ تھا جہلاء کہتے ہیں کہ تو نے سجدہ نہیں کیا لیکن اہل معرفت کے نزدیک یہ بہانہ تھا)

جہلاء کہتے ہیں۔ کہ تو نے سجدہ نہ کیا۔ مگر اہل جوش جانتے ہیں۔ کہ

جف القلم بما هو كائن. (المعجم الكبير للطبراني:۱۱:۲۲۳)

یہ بڑا قطعہ ہے مجھے سب تو یاد نہیں رہا۔ مقطع کہتے ہیں۔

خاقانیا تو تکیہ بہ طاعات خود مکن ۔۔۔ کیں بندہ بہر دانش اہل زمانہ بود

(خاقانی تو اپنی عبادت پر بھروسہ نہ کر، زمانہ کے اہل دانش لوگوں نے بھی ایسا کیا ہے)

تو اپنے ظاہری تقدس پر نظر کر کے کبھی کسی کو حقیر نہ سمجھو۔ تمہیں کیا خبر ہے۔ کہ

تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

مرض سے بے خبری

امراض باطنی بہت دقیق ہیں۔ یہاں تک کہ مرض کبر میں جو اخبث الامراض ہے۔ علماء تک مبتلا پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے کو کم از کم یہی سمجھتے ہیں۔ کہ ہم میں یہ مرض نہیں۔ بس یہی مرض ہے۔

علت ابلیس انا خیر بداست ۔۔۔ ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست

(ابلیس کی بیماری اپنے کو بہتر سمجھنے کی تھی اور یہ مرض ہر مخلوق کے اندر موجود ہے)

یہ مرض تو ہر مخلوق میں ہے۔ کہ مریض ہیں۔ مگر یہ مدعی بھی نہیں سمجھتے۔ کہ ہم مریض ہیں۔ اگر کوئی مریض ہو اور وہ یوں سمجھے۔ کہ میں مریض ہوں۔ تو وہ متواضع ہے۔ مگر افسوس ہے ان پر جو مریض ہیں اور انہیں اپنے مرض کی خبر نہیں۔ یہ شخص متکبر ہے۔

ایسا شخص بہت اچھا ہے۔ جسے اپنے مرض کی خبر ہو۔ اگر چہ وہ علاج نہ کرائے۔ کیونکہ خدا کا دربار عجیب رحمت کا دربار ہے۔ کبر کو علم مرض بھی خدا کے یہاں علاج کا کام دیتا ہے۔ یہ بھی بڑی چیز ہے۔ اگر کوئی متواضع ہو کر اپنے کو متواضع سمجھے تو وہ متکبر ہے اور اگر متکبر اپنے کو متکبر سمجھے تو متواضع ہے۔

امر بالمعروف کا طریقہ

تو بہر حال امر بالمعروف کرو۔ مگر کسی کو کبر کی راہ سے نہ کرو۔ اس سے اور فتنہ و فساد ہوتا ہے۔ اگر از راہ کبر نہ بھی ہو۔ تب بھی جہاں فتنہ فساد کا اندیشہ ہو۔ وہاں کچھ مت کہو۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ بعض پیرزادوں نے اعتراض کیا۔ ایک پیرزادہ نے کہا۔ وعظ کہنا نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ تمہیں کافر ہونے سے بچا دیا۔ کیوں کہ وہ وعظ کہتے تو تم اسے رد کر دیتے اور وعظ میں شرعی احکام ہوتے ہیں۔ تو تم شریعت کا رد کرتے اور رد شریعت کفر ہے۔ واقعی موقع مصلحت کا سمجھنا یہ کام ہے حکیم کا۔

اگر اس موقع پر حضرت وعظ فرماتے تو بجائے اصلاح کے ان کا ایمان بھی جاتا رہتا۔ تو خوب سمجھ لو۔ اگر ایسے موقع پر منع کیا تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اور زیادہ کریں گے۔ یا استخفاف کریں گے۔ اگر استخفاف کریں گے۔ تو کافر ہو جائیں گے اور ان کے کفر کا باعث یہ وعظ ہوگا۔

ایسے امر کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے ماں باپ کو گالیاں مت دو۔ صحابہ رضی اللہ عنھم نے نہایت استعجاب سے پوچھا۔ کہ حضور اپنے ماں باپ کو کون گالیاں دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کسی کے ماں باپ کو گالیاں دے وہ اس کے ماں باپ کو گالیاں دے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا۔ کہ سبب بھی مباشر

کے حکم میں ہے۔ تو جب تم مسبب ہوئے ان کے کفر کے تو تم نے تعلیم دی کفر کی۔

میں ایک دفعہ کہہ کے بہت پچھتایا۔ ایک بانکے صاحب خلاف وضع بنائے ہوئے ریل میں بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ کہ شریعت کے خلاف ہے تو اس نے کہا کہ شریعت کی یوں کی یوں (ماں کو گالی دی) میں بہت پچھتایا کہ اتنا فحش آدمی ہے۔ میں نے اس سے کیوں کہا۔

میں سمجھتا ہوں۔ کہ شریعت کی گستاخی ان ناصحین کی بدولت ہوئی۔ یہ خواہ مخواہ انہیں چھیڑتے ہیں اور خود بھی برے بنتے ہیں۔ شریعت کو برا کہلواتے ہیں۔ میں بیعت کے وقت اس سے بھی منع کر دیتا ہوں۔ کبھی کسی سے لڑنا جھگڑنا نہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو کم عقل لوگ لڑتے پھرتے ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں کو گالیاں کہلواتے ہیں۔ کیونکہ دوہی حالتیں ہیں یا تو وہ اپنے بزرگوں کی تعریف کرے گا۔ تو یہ بھی مجھے پسند نہیں۔ یہ استخواں فروشی ہے کہ خواہ مخواہ اپنے بزرگوں کی تعریف کراتے پھریں۔ جسے غرض ہوگی وہ خود آ کے دیکھ لے گا۔ تمہیں کیا ضرورت ترغیب دینے کی۔

دوسری حالت یہ کہ یا وہ گالیاں دے گا۔ لوگ کیا کرتے ہیں۔ کہ ایک مسئلہ کسی کے سامنے بیان کیا۔ اس نے ابھی تک تو انہی کو برا بھلا کہا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے یہ کہہ دیا۔ کہ فلاں بزرگ فرماتے تھے۔ بس اب ان بزرگ پر گالیاں پڑنا شروع ہو گئیں۔ بھلا اس کی کیا ضرورت۔ کہ ایک مخالف کے سامنے اپنے شیخ کا ذکر کرنا اور گالیاں کہلوانا۔ اول تو آپ کو جوش ہی کیوں آیا۔ اگر آیا تھا تو اپنی ہی طرف منسوب رہنے دیا ہوتا۔ یہ بالکل نادانی ہے کہ جوش آپ کو ہوا اور نام لیں شیخ کا۔ تاکہ تبرا جو کچھ ہو وہ انہی پر ہو۔

غرض یہ کہ سب ایک ہی اصل کے شعبے ہیں۔ اس طرح اصلاح نہیں ہوتی۔ بلکہ اور عناد بڑھتا ہے اور مادۂ فاسدہ میں ترقی ہوتی ہے۔ میرا ایک وعظ ہے ''تصدی للغیر'' اس میں اس کی تفصیل ہے۔ اس لئے یہاں مختصر بیان کر دیا۔

صلح کل کی حقیقت

مگر اس سے یہ نہ سمجھیں کہ میں اصلاح سے منع کرتا ہوں۔ جو اصلاح کو ضروری نہیں

سمجھتے اور استدلال میں یہ شعر پڑھ دیتے ہیں:۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن باخاص وعام　　　با مسلماں اللہ اللہ بابرہمن رام رام

(حافظ اگر وصل چاہتے ہوتو ہر خاص وعام سے صلح رکھو، مسلمان کے ساتھ اللہ اللہ اور برہمن کے ساتھ رام رام)

یہ حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ کا شعر نہیں۔ یہ تو کوئی ہندوستان کے اصطلاحی حافظ جی معلوم ہوتے ہیں۔ جنہیں یہ نہ سوجھا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ یہ ذریعہ قرب نہیں۔ اگر یہ صحیح مذاق ہوتا تو پھر کسی کو کافر کسی کو مومن کہتے۔ کسی کو اولیاء اللہ اور عدو اللہ سے کیوں تعبیر فرماتے۔ قرب تو رضائے محبوب سے ہوتا ہے۔ محبوب کے دشمن سے صلح کرنے میں محبوب کی رضا ہرگز نہیں ہوسکتی۔ تو پھر قرب بھی نہیں ہوسکتا۔ اللہ میاں کا یہ طریقہ صلح کل کا نہیں۔ صلح کل کا طریقہ ہوتا۔ تو موسیٰ علیہ السلام کو عمالقہ سے مقاتلہ کرنے کا کیوں حکم ہوتا؟ خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطاب کیوں ہوتا ہے۔ **جاهد الكفار** (کفار سے جہاد کریں) اور یہ ارشاد کیوں ہوتا ہے۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ. (آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے)

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ تو آپ ایک پہاڑ پر چلے گئے اور وہاں جا کر پکارا۔

یا صبا حاہ یا صباحاہ

اس کلمہ کے معنی تو یہ ہیں کہ اے صبح کے وقت کی لوٹ۔ اے صبح کے وقت کی لوٹ اور ماخذ اس کا یہ ہے۔ کہ عرب میں رات کو لوٹ مار کم ہوتی تھی۔ صبح کے وقت لوٹتے تھے۔ کہ وہ لوگوں کے سونے اور سناٹے کا وقت ہے۔ تو جب کبھی کوئی لوٹا جاتا تھا یا اور کوئی امر عظیم پیش آتا۔ تو **یا صباحاہ یا صباحاہ** پکارا جاتا تھا۔ خواہ صبح کا وقت نہ بھی ہو۔ یہ آواز سن کر ساری قوم اس کی امداد کے لئے جمع ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اس محاورہ کے موافق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر **یا صباحاہ یا صباحاہ** پکارا۔ تھوڑی سی دیر میں ساری قوم جمع ہوگئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے جانتے ہو میں کون ہوں۔ انہوں نے کہا، ہاں! آپ محمد امین ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ اس پہاڑ کے

پیچھے ایک لشکر ہے جو عنقریب آ کر تمہیں ہلاک کر دے گا۔ تو تم کیا سمجھو گے؟

انہوں نے کہا: **ما جربنا علیک الا صدقا**

ہم نے آپ کو جہاں تک آزمایا۔ سچا ہی پایا۔ لہذا ہم اسے بھی سچ سمجھیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بس میں تم کو خدا کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔ کہ وہ عنقریب آنے والا ہے۔ اگر تم اس سے بچنا چاہتے ہو تو صدق دل سے کہو **لا الہ الا اللّٰہ**۔

بس یہ بات سن کر کفار جل بھن گئے۔ ابولہب جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا، جھلا کر کہنے لگا۔

تباً لک سائر الیوم الھٰذا جمعتنا.

خدا تمہیں برباد کرے۔ کیا یہی بات تھی۔ جس کے لئے ہمیں جمع کیا تھا۔ حق تعالیٰ کو اس کا یہ کلمہ اپنے رسول کی شان میں برا معلوم ہوا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ وَامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ.

''ابولہب ہی برباد ہو جائیو۔ بلکہ برباد ہو گیا۔ اور اس بربادی سے نہ اسے اس کا مال بچا سکتا ہے نہ اس کی کمائی۔ اور اس کی بیوی لکڑیاں چننے والی ہے''۔

بعض لوگوں نے تو اس کی تفسیر میں یہ کہا ہے۔ کہ اس سے اس کا اظہار بخل مقصود ہے۔ کہ باوجود مال و دولت کے پھر بھی اتنی کنجوس ہے۔ کہ لکڑیاں خود چن کر لاتی ہے۔ عرب میں بخل کو زنا سے بھی زیادہ قبیح سمجھتے تھے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ یہ جنگل سے خاردار لکڑیاں چن کر لاتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں بچھا دیتی تھی۔ تا کہ آتے جاتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو۔

ایک مرتبہ ایک پتھر لائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مارنے کو۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے نظر نہ آئے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت صلح کل سے کام لیتے۔ تو تمام عرب مسخر ہو جاتا۔ تو معلوم ہو گیا۔ کہ صلح کل مذہب ملحدوں کا ہے۔ اس لئے میں اس سے بھی منع کرتا ہوں۔ لہذا اپنی اصلاح کے ساتھ دوسروں کی بھی اصلاح کرنا ضروری ہے۔

طریقہ تربیت

دیکھو کہ اصلاح کرنا بھی علاج کرنا ہے۔ فرق اتنا ہے۔ کہ اصلاح روحانی علاج ہے

اور یہ جسمانی۔ مگر نفس علاج ہونے میں دونوں برابر ہیں اور یہ معلوم ہے۔ کہ علاج بغیر مطب کے کوئی نہیں کرسکتا۔ پس جس طرح علاج جسمانی کے لئے مطب کی ضرورت ہے۔ اسی طرح یہاں بھی کسی طبیب روحانی سے پہلے مطب کرو۔ اس کے بعد پھر علاج کے در پے ہو۔ دو چار کی اصلاح کے لئے کچھ نہیں۔ مگر اصلاح عام کے لئے اڑنا۔ ایک ایک سے لڑنا جھگڑنا، بگڑنا ٹھیک نہیں۔ اس کے لئے پہلے مرض کی پہچان علاج کا طریقہ طبیب کامل سے سیکھ لو۔ اس کے بعد اصلاح کرو۔

تو ایک تو اس میں کوتاہی ہے۔ کہ ایک کو دوسرے کی اصلاح کی فکر نہیں۔ دوسرے اگر فکر کرتے بھی ہیں تو طریقہ معلوم نہیں۔

اس حدیث میں دونوں باتیں مذکور ہیں۔ ترغیب وترہیب بھی ہے اور طریقہ تربیت بھی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

یسروا ولا تعسروا. (الصحیح للبخاری ۴:۷۹)

آسانی کرنا دشواری مت کرنا۔

وبشروا ولا تنفروا.

خوشی کی باتیں کرنا۔ نفرت مت دلانا۔

وتطاوعا ولا تختلفا.

ایک دوسرے کا کہا ماننا

اختلاف مت کرنا۔ یہ ترجمہ ہوا حدیث کا۔ اس میں پہلے دو امر تو عام لوگوں کی اصلاح کے متعلق تھے۔ یہ تیسرا حکم اس میں باہمی تعلقات کا ادب بتلا دیا۔ یعنی باہم اتفاق سے رہنا۔

ترجمہ سے حاصل تو سمجھ میں آگیا ہوگا۔ اب اس کی تحقیق سنیئے۔ اول فرماتے ہیں:۔

یسروا ولا تعسروا. دوسرا حکم فرماتے ہیں۔ **بشروا ولا تنفروا.** ان دو حکموں کی کیا ضرورت تھی۔ صرف امر اول ہی پر اکتفاء کیوں نہ کی۔ بس یوں فرما دیتے کہ **یسروا** آسانی کرنا۔ بس کافی تھا اور دوسرے میں یوں فرما دیتے۔ کہ **بشروا** تو **یسروا ولا تعسروا** سے کیا بات بتلائی۔

منقول تو دیکھا نہیں۔ مگر لغت واشارتتبع کرنے سے اتنا سمجھ میں آتا ہے۔ کہ اصلاح

کے دوطریقے ہیں ایک فعل ایک قول۔ مثلاً فعل تو یہ کہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر مصلے پر کھڑا کر دیا۔ کہ نماز پڑھو۔ قول یہ کہ زبان سے کہا کہ نماز پڑھا کرو۔ یا یوں مثلاً کسی بچہ سے کہا کہ فلاں کھیل مت کھیلو۔ ایک یہ کہ اس کھیل کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ تو اصلاح کبھی فعل سے ہوتی۔ کبھی قول سے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طریقوں کو الگ الگ کر کے بتلایا ہے۔ کہ اگر کر کے بتلاؤ تو آسان بتلاؤ۔ ایسا نہ ہو دشواری میں پڑ جائے۔ مثلاً یوں کہنا کہ ایک گھنٹہ میں سانس لیا کرو۔ رطوبت تحلیل ہوگی۔ اس طرح دشواری میں ڈالنا مناسب نہیں۔ اس کی بہت تفصیل ہے۔ ایک شخص میں دس عیب ہیں۔ وہ دفعتہً سب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ تو منع تو کرے سب کو۔ یہ تو نہ کرے کہ منع نہ کرے۔ ہاں سب کے چھوڑنے پر مجبور نہ کرے۔

ایک شخص نے رسوم شادی کے متعلق مجھ سے کہا۔ کہ ایک دم سے نہ منع کیا کرو۔ ایک ایک کو منع کرو۔ میں نے کہا سلام ہے جب میں ایک کو منع کروں گا۔ ایک کو منع نہ کروں گا۔ تو مجھ سے بدگمان ہوں گے۔ کہ رسوم ہونے میں تو دونوں برابر ہیں۔ پھر ایک کو کیوں منع کیا اور ایک کو کیوں نہ منع کیا۔ پھر بار بار منع کرنے سے قلب میں تنگی پیدا ہوگی۔ کہ یہ تو روز ایک بات کو منع ہی کرتے رہتے ہیں۔ خدا جانے کہاں تک قید کریں گے۔ اس لئے منع تو سب کو کروں گا۔ مگر مجبور نہیں کرتا۔ کہ سب کو ایک دم سے چھوڑ دو۔ تم چھوڑنے میں ایک ایک کر کے چھوڑ دو۔ تو بہر حال اگر کسی میں عیوب بہت سے ہوں تو بتا تو دے سب کو مگر پہلے ایک کو چھوڑا دے۔ پھر دوسرے کو چھوڑا دے۔ پھر تیسرے کو چھوڑا دے۔

شیخ کامل کی شفقت

صوفیاء اس راز کو خوب سمجھتے ہیں۔ خشک علماء چاہتے ہیں۔ آج ہی سب عیوب چھوٹ جائیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ خشک علماء میں ضابطہ ہوتا ہے، شفقت نہیں ہوتی اور صوفیاء میں شفقت ہوتی ہے اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں:

بندہ پیر خراباتم کہ لطفش دائم ست　　　زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ ہست وگاہ نیست

(میں پیر خانہ کا غلام ہوں کیونکہ اس کی مہربانی ہمیشہ باقی ہے، شیخ وزاہد کی مہربانی کبھی ہے کبھی نہیں ہے)

شیخ کامل کی حالت یہ ہے۔ کہ اگر ناخوش بھی ہوتے ہیں تو ظاہر میں برہم ہوتے ہیں۔ مگر دل سے خفا نہیں ہوتے۔

شاہ ابوالمعالی صاحب نے شاہ بھیک صاحب کو نکال دیا تو یہ روتے پھرتے تھے۔ تین دن کے بعد پھر وہی الطاف، وہی انعام، تو شاہ ابوالمعالی صاحب نے زبان سے تو نکالا تھا۔ مگر دل سے جذب کر رہے تھے۔ اگر دل سے بھی نکال دیتے۔ تو شاہ بھیک صاحب کو کبھی شوق و ذوق پیدا نہ ہوتا۔

نفرت فرعون میدان از کلیم

فرعون کو جو موسیٰ علیہ السلام سے نفرت تھی، وہ اس وجہ سے تھی کہ موسیٰ علیہ السلام ہی کو فرعون سے نفرت تھی۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو بھی فرعون سے نفرت تھی۔ جب فرعون ڈوبنے لگا تو کہنے لگا کہ میں موسیٰ کے پروردگار پر ایمان لاتا ہوں۔ تو جبرئیل علیہ السلام نے اس کے منہ میں کیچڑ ٹھونس دی۔ کہ تیرا منہ اس لائق نہیں۔ کہ تو اس سے کلمات ایمان جاری کرے۔ تو پھر موسیٰ کو کیوں نہ نفرت ہوتی۔ اب آگے مسئلہ تقدیر کا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے اس کو ایسا کیوں بنایا۔

ایک مرتبہ مجھے شبہ پیدا ہوا کہ حق تعالیٰ کو قدرت تھی کہ ابتداء ہی سے سب کو نیک بنا دیتے۔ پھر کیوں نہ ایسا کیا۔ میرے قلب میں خود بخود جواب پیدا ہوا۔

درکارخانہ عشق از کفر ناگزیر است آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

(دنیا میں کفر کا وجود لازمی ہے اگر ابولہب نہ ہو تو دوزخ کی آگ کس کو جلائے)

بس تسلی ہوگئی۔ کہ حکم تکوینی کا مقتضاء یہی ہے کہ کوئی نیک ہو۔ کوئی بد ہو۔ کوئی مومن ہو۔ کوئی کافر ہو۔ آگے تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ غرض موسیٰ علیہ السلام اور جبرئیل علیہ السلام کو نفرت تھی۔ اس سے اسے بھی نفرت تھی۔ تو یہ بزرگوں کی محبت تھی کہ تم ان کی طرف کھنچتے ہو۔ بہرحال انہیں شفقت ہے اور اہل ظاہر کو شفقت نہیں۔ اسی واسطے ایک دفعہ کہہ کر بس ہمیں کیا مانو چاہے نہ مانو اور وہ تدبیریں نکالتے ہیں۔ طرح طرح کی سہولتیں پیدا کرتے ہیں۔

یہاں سے آپ کو قرآن مجید کی تکرار کا حال معلوم ہوگیا ہوگا کہ مختصر المعانی میں تکرار نہیں۔ ہدایہ میں تکرار نہیں اور قرآن مجید میں تکرار ہے۔ حضرت آپ باپ بنے ہوں گے تو آپ کو معلوم

ہوگا کہ شفیق باپ کا جی نہیں مانتا۔ایک ہی بات کو بار بار کہتا ہے۔ایک دفعہ کہہ چکتا ہے۔مگر جب پھر وہی حرکت کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو بمقتضائے شفقت پہلے کہے ہوئے پر اکتفا نہیں کرتا۔بلکہ پھر کہتا ہےاسی طرح قرآن مجید کی تکرار بھی عین شفقت ہے۔اس کی معترضین نے یہ قدری کی۔کہ اعتراض کرتے ہیں۔یہ شفقت ہی تو ہے کہ دو ہاتھ،دو پیر،دو آنکھیں،دو کان دیئے۔

ایک ملحد نے قرآن کے تکرار پر اعتراض کیا تھا۔کہ خدا تعالیٰ مکرر کیوں فرماتے ہیں۔کسی مخلوق کا اس میں تصرف ہوا ہے۔بادشاہ وقت نے اس کو یہ سزا دی۔کہ جلاد کو حکم دیا کہ اس کا ایک ایک عضو حذف کردو۔کیوں کہ تکرار خدا کا فعل نہیں ہے۔تکرار شیطان نے کی ہے۔بس حکومت عجب چیز ہے۔اگر حکومت ہوتی۔تو ان معترضین کی بھی تکرار حذف کردی جاتی۔پھر کسی کے دل میں اعتراض وشبہ تو کیسا وسوسہ بھی نہ آتا۔بہرحال تکرار کی یہ وجہ ہے۔

اور یہ ایک عجب بات ہے۔جو مذکور ہوئی منقول نہیں دیکھی۔شفیقوں کے برتاؤ میں غور کرنے سے ایک بات ذہن میں آ گئی۔واقعی قرآن سمجھنا ہو تو عامہ خلائق کے حالات میں غور کرو۔تو اسرار اچھی طرح منکشف ہوجاویں گے۔اب آپ نے نظر تصنیف سے دیکھا۔تو خواہ مخواہ شبہے پیدا ہوں گے۔تو شیخ کامل اور عالم ظاہری میں یہ فرق ہے۔کہ یہ ایک ہی بات کو مکرر بتلاتا ہے اور وہ ضابطہ کا برتاؤ کرتا ہے۔اس کی شفقت کی یہ حالت ہے کہ کہہ دیا سب کو کہ دس مرض تمہارے اندر ہیں۔مگر ایک ایک کو چھڑائے گا۔کہ بار اور گرانی نہ ہو اور وہ چاہے گا۔کہ آج ہی تمام چھوڑ کر یہ جنید وقت بن جائے۔

اسی وجہ سے بعضے شیوخ پر لوگ اعتراض کرتے ہیں۔کہ امراض میں مبتلا پاتے ہیں اور علاج نہیں کرتے۔

ایک چور تھا۔اسے اپنی حالت پر افسوس ہوا۔ایک بزرگ کے پاس جا کر مرید ہوگیا۔ان بزرگ نے مرید کرلیا اور اس سے بھی توبہ کرائی کہ چوری مت کرنا اور خانقاہ میں رہنے کی اجازت دے دی۔صبح کے وقت ذاکرین اٹھتے ہیں تو جوتے ندارد۔بڑی تلاش کے بعد اس طرح ملتے ہیں۔کہ میرا وہاں آپ کا وہاں۔ایک پوائی میری تو ایک آپ کی۔تو بڑی دقت تلاش کرنے میں ہوا کرتی تھی۔آپس میں سب ذاکرین کہنے لگے۔یہ واہیات حرکت کون کر جاتا ہے۔اس کو پکڑنا چاہیے ایک صاحب پہرہ پر مقرر کیے گئے۔جب رات زیادہ

گزری اور سب سو گئے تو دیکھتے کیا ہیں۔ کہ نئے مرید صاحب یہ حرکت کر رہے ہیں۔ پکڑے گئے۔ رات بھر پہرہ میں رکھے گئے۔ صبح کو شیخ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ شیخ نے پوچھا کیوں میاں تم نے یہ حرکت کی۔ اس نے کہا ہاں میں نے یہ حرکت کی ہے۔

دیکھو! شیوخ سے اپنے مرض کو کبھی مت چھپاؤ۔ یہاں تاویلیں نہیں چلیں گی۔ وہ فراست سے معلوم کرلیں گے۔ اگر کھانسی اٹھ رہی ہے گوسل نہیں ہے۔ فقط دھسک ہے۔ طبیب سے ہرگز نہ چھپاوے۔ اسی طرح شیخ سے عیب نہ چھپاوے۔ بلکہ اگر شیخ کہے اور تم میں وہ مرض نہ بھی ہو تو کہہ دو ہے۔ تمہارا حرج ہی کیا ہے۔ آپ تاویلیں کیوں کرتے ہیں۔

حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں۔ ؎

چنداں کہ گفتیم غم با طبیباں ۔۔۔ درماں نکروند مسکین غریباں

(ہر چند کہ ہم نے طبیبوں کے پاس اپنا غم بیان کیا، لیکن انہوں نے ہم غریبوں مسکینوں کے درد کا درماں نہ کیا)

اس سے مراد اہل ظاہر ہیں: ؎

ما حال دل را با یار گفتیم ۔۔۔ نتواں نہفتن درد از طبیباں

(ہم نے اپنے دل کا حال اپنے دلی دوست (شیخ کامل) سے بیان کیا کیونکہ معالج سے اپنے درد کو نہ چھپانا چاہیے)

اس سے مراد شیوخ کاملین ہیں۔ طبیب سے کیا راز۔ اسی طرح مرشد کہ اس سے نہ چھپانا چاہیے۔ ناقص سے تو کہے نہیں۔

شیخ غیر کامل

ایک دفعہ ایک حالت مجھ پر پیش آئی تھی۔ اس وقت معلوم ہوا۔ کہ ہر ایک اس کا اہل نہیں۔ کہ اپنی حالت اس پر ظاہر کی جاوے۔ اناڑی آدمی لمبے چوڑے وظیفوں سے کام لیتے ہیں۔ جس طرح کپاس کی کھانی بوجھو گے۔ جہاں ان سے ایک بات کہی۔ انہوں نے ایک وظیفہ بتلا دیا۔ دوسری حالت کہی۔ اس کے لئے انہوں نے ایک اور وظیفہ بتلا دیا۔ انہوں نے کہا دوسوسے آتے

ہیں۔انہوں نے ایک وظیفہ بتلادیا۔غرض وظیفہ در وظیفہ بتلاتے چلے جاتے ہیں۔

علی حزیں جس وقت دہلی میں آیا۔ایک مکان کرایہ کا لے کر ٹھہر گیا۔دو تین روز کے بعد مالک مکان نے آ کر پوچھا۔کہ کوئی تکلیف تو نہیں۔کہا کوئی تکلیف نہیں۔مگر اس تذکرۃ الاولیاء کو کہیں اور بسا دو۔

اس مکان کے ایک حصے میں ایک مداری فقیر رہتا تھا۔جو شجرہ پڑھا کرتا تھا۔علی حزیں نہایت نازک دماغ تھا۔اسے تکلیف ہوتی تھی۔تو میں کہتا ہوں کیا مجموعہ وظائف بنو گے۔یہ تو شیخ غیر کامل کی تربیت کا حامل ہے۔شیخ کامل کہتا ہے۔وسوسہ آنے دو۔کچھ پرواہ نہ کرو۔عوام الناس کے نزدیک وہی زیادہ شفیق ہیں۔جو مجموعہ وظائف بتادیں۔

چنانچہ کہتے ہیں۔کہ حضرت کیسے شفیق ہیں۔ارے بھائی تمہیں کیا خبر علاج کرو۔نسخہ برتنے سے معلوم ہوگا۔تو ایسی ہی بڑی بڑی حالتیں پیش آتی ہیں۔غرض اناڑی سے تو کہو نہیں۔

ایک اناڑی پیر نے ایک شخص کو حبس دم کا شغل بتلایا۔اس نے کرنے کے بعد اپنی حالت کہی۔کہا کئے جاؤ۔یہاں تک کہ وہ غریب مر گیا۔

میں کہتا ہوں اس پر پیر خون کا گناہ ہوا۔حدیث شریف میں ہے۔

من تطبب ولم يعلم منه الطب فهو ضامنٌ. (سنن ابی داؤد:۴۵۸۶)

یعنی جو شخص بغیر جانتے ہوئے علاج کرے گا وہ ضامن ہوگا۔اسی طرح جو شخص بغیر جانتے ہوئے پیری مریدی کرے۔وہ ضامن ہے۔کہ علت دونوں میں مشترک ہے۔

جیسے ایک طبیب نے کسی کو مسہل دیا تھا۔حال کہا گیا۔حکیم صاحب! دست آرہے ہیں۔انہوں نے کہا آنے دو۔کہا کہ بہت آرہے ہیں۔کہا آنے دو۔یہاں تک کہ وہ مر گیا۔حکیم صاحب سے کہا گیا۔کہنے لگے۔اللہ اللہ اتنا بڑا سخت مادہ جس کے نکلنے سے مر گیا۔اگر رہتا تو نہ معلوم کیا آفت ہوتی۔حضرت ایسی ہی بعض شیوخ کی حالت ہے۔کہ بس چڑھ جائے سولی پر اللہ بھلا کرے گا۔ایسوں ہی کی نسبت فرماتے ہیں۔

دست ناقص دست شیطان ست ودیو

(ناقص کا ہاتھ شیطان اور دیو کا ہاتھ ہے)

یعنی جو شیطان سے بیعت کا نتیجہ ہے۔ وہی ایسے شیخ کی بیعت کا انجام ہے تو خیر کامل سے ظاہر نہ کرے۔ کامل سے چھپائے۔

محقق کی تربیت

غرض چور سے پوچھا کہ تم نے یہ حرکت کی۔ اس نے کہا۔ ہاں کی۔ کیوں کی۔ کہا جب وقت چوری کا آتا ہے۔ تو نفس کہتا ہے۔ چل چوری کر۔ میں کہتا ہوں اچھا چل کریں گے۔ تھوڑی دیر تک جوتیاں الٹ پلٹ کرتا۔ تو طلب و تقاضا بجھ جاتا ہے۔ اگر آپ منع کریں گے۔ تو پھر چوری کروں گا۔ شیخ نے کہا۔ کہ تم ہیرا پھیری کیا کرو۔ ذاکرین سے بھی کہہ دیا کہ سے کوئی تعرض نہ کرے۔

شیخ سے بڑھ کر کہتا ہوں۔ کہ اس وقت ہیرا پھیری اس کیلئے واجب تھی۔ یہی راز ہے۔ امام غزالیؒ کے اس قول کا کہ وہ فرماتے ہیں۔ جب تسبیح سے جی گھبرائے۔ تو واجب ہے ہنسنا بولنا۔ اس وقت کے علماء نے گو ان کی کتاب آگ میں جلوائی۔ مگر بعد میں وہ سونے سے لکھی گئی۔

امام غزالیؒ کے فتوے عجیب غریب ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مکہ معظمہ کے متعلق مضامین شوقیہ کا بیان کرنا ایسے شخص کے سامنے جس کو حج اس لئے جائز بھی نہیں (کہ اہل و عیال سے فرصت نہیں) حرام ہے اب وحشت ہوئی کہ مکہ مکرمہ کے فضائل کے بیان کرنے کو حرام فرماتے ہیں۔ اس واسطے حرام فرماتے ہیں۔ کہ وہ سن کر چل پڑے گا اور گنہگار ہوگا اور اس کے گناہ کا سبب یہ فضائل بیان کرنے والا ہوگا۔ حضرت محقق ہونے کی ضرورت ہے۔

ایسے امور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہیں۔ بنی ثقیف جس وقت مسلمان ہونے آئے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط کی۔ کہ ہم مسلمان تو ہوتے ہیں۔ مگر نہ زکوۃ دیں گے، نہ جہاد کریں گے۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا لوگوں کو بڑی وحشت ہوئی۔ کہ ترک فرض کی اجازت دے دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مسلمان تو ہونے دو۔ مسلمان ہو کر سب کچھ کریں گے۔

ایک بزرگ کی خدمت میں ایک ڈوم حاضر ہوا۔ عرض کیا میں مرید ہونا چاہتا ہوں۔ مگر طبلہ سارنگی نہیں چھوڑوں گا۔ حضرت نے فرمایا۔ اس شرط سے مرید کرلیں۔ کہ جماعت کی نماز کبھی مت چھوڑنا۔ اس نے کہا بہت اچھا۔ قسم کھالی۔ ایک جگہ مجلس نشاط تھی۔ وہاں یہ بھی تھا۔ جب اذان کی آواز آئی۔ طبلہ سارنگی چھوڑا۔ اذان کی آواز پر چلے۔ تمام مجلس بے لطف۔ اب تمام میں شہرت ہوئی۔ کہ اس کو بلانے سے مجلس بے لطف ہوجاتی ہے۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے بلانا ہی چھوڑ دیا۔ تو ان حضرت نے طبلہ سارنگی نہیں چھوڑا مگر طبلہ سارنگی نے انہیں چھوڑ دیا۔ سبحان اللہ طبیب ایسے ہوتے ہیں۔ کہ کونین تلخ تھی۔ مگر اس پر شکر لگا کر اسے شیریں کردیا۔

ایک شخص نے حضرت سے بیعت کی اور شرط کی۔ کہ نماز نہیں پڑھوں گا۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا مگر تھوڑا سا اللہ کا نام لے لیا کرنا۔ عرض کیا بہت اچھا۔ اور بیعت ہوگئے۔ نماز کا وقت آیا۔ آپ کا ارادہ تھا۔ کہ نماز نہ پڑھوں گا۔ بدن میں خارش ہونے لگی۔ ہزار تدبیریں کیں۔ مگر کسی طرح نہ تھمی۔ بس ٹھنڈا پانی جو لگایا۔ تو کسی قدر سکون ہوا۔ مگر بالکل رفع نہ ہوئی۔ لوگوں نے کہا وضو تو کر چکے۔ نماز پڑھ لو تو شاید رک جائے۔ اب جو نماز شروع کی۔ سکون بڑھتا گیا۔ جوں ہی ختم ہوئی۔ بالکل سکون ہوگیا۔ بس جہاں وقت نماز آیا۔ خارش شروع ہوئی۔ ادھر نماز شروع کی ادھر خارش رک گئی۔ میں نے جس وقت انہیں دیکھا۔ پکے نمازی اور تہجد گزار تھے۔ یہ تو برکت تھی۔ مگر تدبیریں بھی ہوتی ہیں۔

قادر بخش خاں رئیس نماز نہیں پڑھتے تھے۔ مولانا مظفر حسین صاحب جب گڑھی تشریف لائے۔ انہیں معلوم ہوا۔ خان صاحب کے پاس گئے اور فرمایا۔ کہ مجھے آپ سے کچھ مختصر سا کہنا ہے۔ انہوں نے کہا۔ فرمایئے، فرمایا کہ آپ نماز نہیں پڑھتے۔ نماز پڑھا کیجئے۔ خان صاحب نے کہا۔ سچی بات ہے کہ مجھے ڈاڑھی چڑھانے کا شوق ہے۔ وضو کرنے سے سب بال برابر ہوجاتے ہیں اور بے وضو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ فرمایا بے وضو ہی پڑھ لیا کیجئے۔ اجازت ہے۔ خان صاحب نے ایک وقت کی نماز تو بے وضو پڑھی۔ جب دوسرا وقت آیا۔ خیال پیدا ہوا کہ کیا بے وضو پڑھیں۔ محنت بھی کریں اور نفع کچھ بھی نہ ہو۔ بس ایک وقت بے وضو پڑھ کے دوسرے وقت سے باوضو نماز پڑھنے لگے۔ اس طرح

سے وہ نمازی بن گئے اور ڈاڑھی بڑھانا بھی چھوٹ گیا۔ حضرت تو ایک چنگاری لگا گئے تھے۔ تو بزرگوں کی یہ بات ہے۔ ناقصین کیا سمجھیں گے۔ گو پیری مریدی کرنے لگیں۔

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند | نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند
درنیابد حال پختہ ہیچ خام | پس سخن کوتاہ باید والسلام

(جو شخص آئینہ بناتا ہو ضروری نہیں کہ وہ سکندری بھی جانتا ہو، جو شخص سر منڈاتا ہو ضروری نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو، خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو مختصر کر کے ختم کرنا چاہیے والسلام)

اور ایسے ہی مبصر کا کام ہے کہ بچوں کو ہر بات سے نہ روکے۔ ایک حکایت ہے۔ کہ ایک شخص کے گھوڑے میں یہ مرض تھا۔ کہ لید کر کے پلٹ کے اسے سونگھتا تھا۔ جب آگے بڑھتا تھا۔ ایک شخص مسافر سوار ملے۔ کہا میں اس کا یہ عیب نکال دوں گا۔ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے پیچھے چلے۔ گھوڑے نے اپنی عادت کے موافق جہاں لید کر کے اسے سونگھنے کا قصد کیا۔ ان مسافر نے جو کہ پیچھے تھے۔ منہ پر ایک چابک رسید کیا۔ گھوڑا سیدھا سیدھا آگے کو ہولیا۔ دس بارہ کوس اسی طرح قطع ہوئے اور پھر اس نے دو چار مرتبہ مار کھانے کے بعد ایسا نہیں۔ سمجھے کہ اب ٹھیک ہو گیا۔ آگے اس مسافر کا رستہ بدلتا تھا وہ جدا ہو کر چلا گیا۔ اب جو چلے۔ تو اس نے دیکھا کہ اب وہ کوتوال تو ہے نہیں۔ لوٹا اور تمام لیدوں کو سونگھتا ہوا چلا گیا۔ ساری منزل گویا کالعدم ہوئی۔ انہوں نے کہا۔ اچھا درست کیا۔ اس سے تو پہلے ہی اچھا تھا۔ کہ اتنا حرج نہ ہوتا۔ بات کیا تھی۔ کہ قوت شامہ میں تقاضا جمع تھا۔ جب اسے موقع ملا۔ اس نے اسے پورا کیا۔

اسی طرح اگر بچوں کو ہر شرارت سے روک دیا جائے گا۔ تو ان کے قوت متخیلہ میں اس کا تقاضا جمع رہے گا۔ جب موقع ملے گا۔ ایک دم سے سب کی کسر نکالیں گے۔ تو اب آپ نے دیکھا کہ یسروا کا کیا راز ہے۔ میں یہ کہتا ہوں۔ کہ یہ تو ہے فعلاً اور بشروا و لا تنفروا یہ ہے قولاً۔ یہ عجیب علاج ہے۔

اثر مضامین

خصوص اب تجربہ سے معلوم ہوا ہے۔ کہ رحمت و بشارت کے مضامین ترہیب سے زیادہ نافع ہوتے ہیں۔ میں نے ایک رسالہ شوق وطن لکھا ہے۔ کہ لوگ طاعون سے بھاگنے

لگے تھے۔ اس کے دیکھنے کے بعد موت کا خوف باقی نہیں رہتا۔ واقعی اگر شوق ہو تو کیوں بھاگے۔ بلکہ آپ کے شوق میں تو یہ حالت ہو کہ ؎

خرم آنروز کزیں منزل ویران بردم | راحت جاں طلبم وز پے جاناں بردم
نذر کردم کہ گرایں غم بسر آید روزے | تا درِ میکدہ شاداں وغزلخواں بردم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے جان محبوب حقیقی پر نثار کروں اور خوش وخرم کوچ کروں، میں نے یہ نذر مانی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے گو خوش وخرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں)

پھر موت سے کیا اندیشہ۔ اس رسالہ میں یہ ثابت کیا ہے۔ کہ مومن کیلئے دنیا کے عیش وآرام سے آخرت کی دوزخ بھی اچھی ہے۔ اس کے دیکھنے کے بعد لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے۔ موت سے وحشت تو کیا اور شوق پیدا ہو جاتا ہے اور اسی کو عراقی فرماتے ہیں: ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت | سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر تیری خنجر آزمائی کے لئے سلامت رہے)

کہ گویا موت کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ کہ بشارت سے بہت نفع ہوتا ہے۔ یہ اسلام کا ہے سے پھیلا۔ یہ پھیلا تبشیر سے۔ تالیف قلب سے، حسن تدبیر سے، نہ کہ شمشیر سے۔ کیونکہ صاحب اگر بزور شمشیر پھیلا۔ تو اتنے شمشیر زن کہاں سے آئے تھے اور پھر وہ کیوں کر مسلمان ہوئے۔ وہ تالیف قلب ہی سے مسلمان ہوئے۔ حضرت صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا طرز عمل ان کی حالت دیکھ دیکھ کر لوگ مسلمان ہوتے ہیں۔

ترغیب صحبت

یسرا کے اندر یہ بھی داخل ہے۔ کہ اپنی اصلاح پوری طرح کر لو کہ دوسرے کے دیکھنے سے اصلاح ہو جاوے۔ میں جو ترغیب صحبت کی دیتا ہوں۔ اس میں یہی راز ہے کہ دیکھنے سے اصلاح ہو جاتی ہے۔ خربوز کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتا۔ کہ خواہ مخواہ لوگوں سے اپنے شیخ کی ثنا وصفت کی جاوے۔ میں اس کو استخواں فروشی سمجھتا

ہوں۔ یہ مہمل بات ہے۔ اس میں دوسرے کو شبہ ہو جاتا ہے۔ کہ یہ گر گے انہی کے چھوڑے ہوئے ہیں۔ بس تعریف کا اچھا طریقہ یہ ہے۔ کہ اپنی حالت کو درست کرلو کہ لوگ تمہارے مربی کی تعریف کریں۔ کہ ان کی صحبت میں یہ اثر ہے:

گلے خوشبوئے در حمام روزے   رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری   کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گل نا چیز بودم!   ولیکن مدتے باگل نشستم
جمال ہمنشیں در من اثر کرد   وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(حمام خانہ کی خوشبودار مٹی ایک دن میرے محبوب کے ہاتھ سے مجھے ملی، میں نے کہا کہ تو مُشک ہے یا عنبر ہے کہ تیری خوشبو سے میں مست ہو رہا ہوں کہا کہ میں ایک ناچیز مٹی ہوں لیکن کچھ مدت تک پھول کی صحبت میں رہی ہوں میرے ہم نشین پھول نے میرے اندر اپنا اثر ڈال دیا ورنہ میں تو وہی خاک ہوں جو پہلے تھی)

جب ایک شخص کی صحبت سے تمہاری حالت درست ہوئی۔ تو یہ طریقہ کھینچنے کا ہے۔ ہرگز یہ طریقہ اچھا نہیں۔ کہ لوگوں کو کھینچو۔ یہ گروہ بندی ہے۔ ہاں اگر کوئی خود رغبت کرے۔ تو مضائقہ نہیں۔ اب تک اس طریقے کی بھلائی ذہنوں میں جمی ہوئی تھی۔ اس لئے میرے یہ الفاظ ناگوار ہوئے ہوں گے۔ مگر کیا کروں۔ تجربہ سے مجبور ہوں۔ کہ اس طریقے سے بہت سی خرابیاں معلوم ہوئیں۔ تو بہرحال ایک طریقہ اصلاح کا یہ ہے۔ کہ خود اپنی حالت درست کرلو۔

ناصح غیر عامل

ایک بڑھیا اپنے لڑکے کو ایک بزرگ کی خدمت میں لائی اور عرض کیا۔ کہ حضرت یہ گڑ بہت کھاتا ہے۔ اسے نصیحت فرما دیجئے۔ ان بزرگ نے فرمایا۔ کل لانا۔ دوسرے دن بڑھیا اس لڑکے کو لائی۔ ان بزرگ نے نصیحت فرمادی۔ کہ میاں گڑ بہت مت کھایا کرو۔ نقصان کرتا ہے۔ اس کے بعد اس لڑکے نے گڑ کھانا چھوڑ دیا۔ خدام نے پوچھا۔ کہ حضرت ایک دن کی تاخیر میں کیا مصلحت تھی۔ فرمایا کہ جب تک مجھے بھی گڑ کھانے کی عادت تھی۔ اب میں نے وہ عادت چھوڑ دی۔ اگر اس وقت کہتا تو اثر نہ ہوتا۔ اب میرے لہجہ میں قوت زبان میں برکت

قلب میں طاقت پیدا ہوئی۔ اب تجربہ کر لیجئے۔ کہ ناصح غیر عامل کا لہجہ نرم ہوتا ہے، نہ برکت ہوتی ہے، نہ قوت ہوتی ہے اس سے اثر بھی نہیں ہوتا، اگر کوئی غیر عامل بتکلف اپنے لہجہ میں قوت پیدا کرے تو اس کی وقاحت اور بے شرمی ہے۔ اسی ضعف کو کسی نے کہا ہے۔

احب مناجاة الحبيب باوجه ولكن لسان المذنبين كليل

محبوبوں سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مگر خطاوار ہوں۔ اس لئے زبان یاری نہیں دیتی۔

ایک اور بات بھی تو ہے۔ جب اس طرح سے کہا جائے۔ جس سے یہ معلوم ہو۔ کہ یہ بھی کیا کرتے ہیں۔ تو جائز بھی نہ ہوگا۔ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ. (تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو خود کرتے نہیں)

طالب علموں کے کام کی بات ہے۔ یہ معنی نہیں۔ جو خود نہ کرے وہ کہے بھی نہیں۔ کیونکہ لم تامرون (کیوں حکم دیتے ہو) نہیں فرمایا۔

نکتہ اس میں یہ ہے کہ امر ہوتا ہے۔ انشاء اور یہاں ہے قول جو اخباری ہے۔ اب معنی یہ ہوئے۔ کہ لم تخبرون عما لا تفعلون. (تم کیوں خبر دیتے ہو ان کاموں کی جو خود کرتے نہیں)

چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ الاٰية. (بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو درست رکھتے ہیں جو قتال کرتے ہیں)

شان نزول دیکھ لو۔ شان نزول اس کا یہ ہے۔ کہ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا کہ اگر ہم کو معلوم ہو جاوے۔ جس سے خدا راضی ہو۔ تم ہم بھی کریں نازل ہوا کہ کرو۔ نہ کر سکے بس وہ لوگ۔ دعویٰ ہی کرنے کا کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ انہوں نے فقط دعویٰ کیا تھا۔ کہ کسی کو نصیحت تھوڑا ہی کی تھی۔ بس خوب سمجھ لو۔ کہ نصیحت کرنا تو فی نفسہ جائز ہے۔ مگر اس طرح سے ناجائز ہے۔ کہ باوجود عامل نہ ہونے کے عامل معلوم ہو۔ اس حیثیت سے متضمن کذب ہے۔ نہ اس حیثیت سے کہ نصیحت ہے۔ اب اکثر لوگ اس کی تفسیر غلط سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مولوی صاحب سے کوئی وعظ کو کہے۔ تو یہ آیت پڑھ دیتے ہیں:۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ.

بھائی اگر تم عامل نہیں بھی ہو تو وعظ کہنے میں کیا حرج ہے۔ ہاں اس طرح نہ کہو۔ کہ عامل معلوم ہو کہ کذب اور کبر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی اپنی حالت ایسی بنائے۔ جس سے تارک معلوم ہو۔ تو اسی حالت کاذبہ کے اظہار کا گناہ ہوگا۔ اسی طرح چاہے حال ہو چاہے قال۔ جو مالا تفعلون کے خلاف ہوگا۔ ناجائز ہوگا۔ تو ایسے طور پر نصیحت کرنا بھی جائز نہیں۔ اور اس طرح سے نصیحت کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ کہ عامل نہ معلوم ہو۔ ہاں دوسرے کو ایسی نصیحت سے کم نفع ہوگا۔
چنانچہ مشائخ کہتے ہیں۔ جو شیخ ذکر و شغل نہ کرتا ہو۔ اس کی تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔ اسی واسطے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے:۔

وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ.

کہ خلوت اختیار کیجئے۔ کہ جہاں تصور کے اعتبار سے بھی کوئی نہ ہو۔ تھوڑا سا بھی وقت خلوت کا اگر کوئی مقرر کر لے تو تعلیم میں برکت ہوتی ہے اور اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ تو پیروں کی خلوت بھی یسرا میں داخل ہے۔

علمی نکتہ

آگے فرماتے ہیں: بشروا و لا تنفروا. یہاں پر ایک بات اہل علم کے سمجھنے کی ذہن میں آئی۔ کہ تبشیر کے مقابل تو انذار آتا ہے۔ تنفر کا لانا بظاہر بلاغت کے خلاف معلوم ہوتا ہے یا تو انسا و لا تنفروا فرماتے یا بشروا و لا تنذرا فرماتے۔ کہ مقابلہ درست ہو جاتا۔ آج ہی یہ بات سمجھ میں آئی۔ کہ بہت بڑی بات کی طرف اشارہ فرما دیا۔ بات یہ ہے کہ بشرا کے وہ معنی مراد لئے ہیں۔ جو تنفروا کے مقابل ہیں۔ نہ معنی جو لاتنذرا کے مقابل ہیں۔ تو تبشیر اس مقام پر تنفیر کا تو مقابل ہے۔ انذار کا مقابل نہیں۔ کیونکہ انذار کو بھی شامل ہے۔ انذار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ وحشت ہو۔ ایک یہ کہ الفت ہو۔ پہلی قسم تنفرا میں داخل ہے۔ دوسری قسم بشرا میں داخل ہے۔ مثلاً انداز سے یوں جی خوش ہوتا ہے۔ کہ سب مردہ کو قبر میں رکھ دیتے ہیں۔ تو جنت سے پہلے دوزخ دکھلائی جاتی ہے۔ کہ اگر اعمال اچھے نہ ہوتے اور اصلاح نہ ہوتی تو یہ ٹھکانا تھا تو اس جہنم دکھانے کو دخل خوش کرنے میں نہیں تو کیوں دکھلائی۔ حضرت جہنم

دکھلا کر خوشی اور بڑھادی۔ اب جنت کو دیکھ کر زیادہ خوشی ہوگی۔

الحمدللّٰہ الذی نجانی.

اسی طرح جو دنیا کے رنج وغم دیکھ چکے ہیں۔ وہ کہیں گے

الحمد للّٰہ الذی اذہب عنی الحزن

حدیث میں ہے۔ کہ جب تمام اہل ایمان جنت میں چلے جائیں گے اور جنت نہ بھرے گی تو حق تعالیٰ جنت کے لئے ایک نئی مخلوق اور پیدا کریں گے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے۔ کہ بھئی! ان سے تو ہم زیادہ مزہ میں ہیں۔ کہ انہوں نے کوئی چیز جنت کے مقابل دیکھی ہی نہیں۔ انہیں اس کی کیا قدر اور کیا خوشی۔

بہرحال انذار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جس سے لوگ نا امید ہو جاتے ہیں اور ایک یہ کہ انذار اور اس کے ساتھ ہی اس سے بچنے کی تدبیر بھی بتا دی جاوے۔ مثلاً سلطنت کا ایک حکم اور اس کے ساتھ ہی اس سے بچنے کی تدبیر بھی بیان کردے۔ اس کو محقق سمجھ سکتا ہے۔ غیر محقق نے چغلی غیبت وغیرہ کا عذاب تو بیان کر دیا۔ مگر یہ نہ بتایا۔ کہ اس مرض سے نجات کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اور ایک محقق شیخ کامل جہاں عذاب بیان کرے گا۔ وہاں اسباب اس بات سے بچنے کے بھی بیان کرے گا۔ مثلاً امراض مذکورہ سے بچنے کے لئے یہ تدبیر بتائے گا۔ کہ بولو تو سوچ کر بولو۔ کہ کسی کی حکایت تو نہیں۔ جس میں غیبت ہو یا شکایت تو نہیں۔ جس میں چغلی ہو۔ تو دیکھو کہا انہوں نے بھی۔ مگر اس طرح کہ نا امید نہیں کیا اور اہل ظاہر اس طرح کہتے ہیں۔ جس سے معلوم ہو کہ ہمیشہ کے لئے مردود ہو گیا۔ شیطان بن گیا اور اہل باطن برابر تسلی دیتے رہتے ہیں۔ کہ فکر مت کرو۔ اس سے بچنا بہت آسان ہے۔ اسی طرح نظر بد۔ بدنگاہی اہل ظاہر کے نزدیک اس سے بچنے کی کوئی تدبیر ہی نہیں اور اب وہ شخص جہنم سے نہیں بچ سکتا۔ اور اہل باطن تدبیر بھی بتاتے ہیں۔ کہ تم عذاب کا خیال کرلو تو یہ مرض جاتا رہے گا۔ سو ایک انذار تو یہ ہے کہ جس کا حاصل یہ ہے:

درشتی و نرمی بہم می رسد چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

(سختی اور نرمی ساتھ ساتھ اچھی ہوتی ہیں جس طرح کہ فصد کھولنے والا کہ نشتر بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے)

اس سے امید رہتی ہے۔غرض ایک انداز تو یہ ہے کہ بالکل مایوس کردے۔ یہ ناجائز اور ایک وہ کہ جس میں نجات کی تدبیر بھی ہو یہ جائز۔تو حضور نے بشرا میں یہ بات بتلادی۔ حاصل یہ ہوا کہ ایسی بات کہ جس سے تنگی پیدا ہومت بتاؤ۔

مصلحین کے باہمی حقوق

خیر یہ تو وہ حقوق ہیں۔ کہ دوسرے کی اصلاح کے وقت جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اب اخیر کا جملہ رہ گیا۔اس میں یہ بتلادیا۔کہ مصلحین باہم کیا برتاؤ کریں۔تو واقعی یہ طبیب کامل کا کام ہے۔ کہ ہر پہلو پرنظر رکھے نہ دوا میں بالکل برودت ہی ہو۔ نہ نرا روغن بادام ہی ہو۔ جیسے آج کل کہ یا اصلاح نہیں کی۔ یا کی تو اس طرح کی۔ کہ ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ۔۔۔ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اصلاح کا قصد کیا تو امارت کی سوجھی۔ کہ ریفارمر بن بیٹھے۔اب اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ دوسرے مصلحین سے حسد ہے۔اب چاہتے ہیں۔ کہ کوئی اور پیر یا مولوی نہ رہے۔ جو کچھ ہوں وہ ہم ہی ہوں۔ صحابہ رضی اللہ عنھم کی یہ حالت تھی۔ کہ ان سے لوگ مسئلہ پوچھتے ہیں۔ تو یہ کہتے ہیں۔ کہ ان سے پوچھئے۔ وہ زیادہ جانتے ہیں۔ یہ وہ کہتے ہیں۔ ان سے پوچھئے۔ وہ زیادہ جانتے ہیں۔ یہ حالت کیوں تھی۔

ولیکن مدتے با گل نشستم (لیکن عرصہ سے پھولوں کے ساتھ نشست رہی)

سب صحبت کا اثر تھا اور آج ریفارمر کہلاتے ہیں۔ان کی یہ شان ہے۔ ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ۔۔۔ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اور مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی ۔۔۔ چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

(جب بھوکا ہوتا ہے کتا بن جاتا ہے، اور جب شکم سیر ہوتا ہے سخت مزاج اور ظالم بن جاتا ہے)

اسی طرح یا تو اصلاح کی فکر ہی نہ تھی یا فکر ہوئی تو دق کرنا شروع۔ خیر ان کو تو جانے دیجئے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ کہ مشائخ کے یہاں مشائخ کی غیبت ہوتی ہے۔ایک تو

غیبت اس لئے کرنا کہ لوگ گمراہی سے بچیں۔ اس میں تو مضائقہ نہیں اور اس کو حقہ پیچوان کے درجہ میں رکھنا یہ بہت برا ہے۔ آج کل معتقدین کی یہ حالت ہے کہ اپنے مشائخ کی مجلس میں یا دوسرے مشائخ کی غیبت کریں گے یا اپنے شیخ کے کمالات کی حکایات گو وہ خلاف واقع ہی ہوں۔ بیان کریں گے۔ کہیں ان کے مکاشفات کی فہرست، کہیں کرامات کی تفصیل۔ اگر چہ سچے شیخ اپنے کشف کا انکار بھی کریں۔ مگر یہ نہیں مانتے۔

ایک بزرگ سے ذرا فاصلہ پر بیٹھے ہوئے دو معتقد آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کہ فلانی مسجد جو بنی ہے۔ مولانا کو کشف ہوا تھا۔ ان بزرگ نے سن لیا اور فرمایا۔ کہ میں بقسم کہتا ہوں۔ کہ مجھے کشف نہیں ہوتا۔ تو وہ صاحب دوسرے کہتے ہیں پڑے کہو ہوتا ہے۔ لیجئے! شیخ بقسم اپنے کشف کا انکار کرتے ہیں۔ مگر معتقد صاحب نہیں مانتے۔ واقعی ایسے ہی مریدوں نے بعض پیروں کو بگاڑ دیا۔ ایک تو کشف کرامت منسوب کر کے ان کو بد دماغ بنا دیا۔ دوسرے ہدایا کہ جب شیخ کے پاس آؤ تو اور کچھ نہ سہی تو پھول ہی لے کر آؤ۔ اس سے بدنیت بنا دیا۔ اور اس کے بارہ میں ایک اردو کی آیت بنالی۔ کہ:

"خالی جاوے خالی آوے"

سو سمجھ لو اگر روپے سے خالی جاوے تو کچھ حرج نہیں اور نہ اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں۔ کہ روپیہ پیسہ سے خالی جاوے تو خالی آوے۔ بلکہ معنی یہ ہیں کہ اگر خلوص وطلب سے خالی جاوے تو خالی آوے۔ تو جناب پیروں کو اس کا انتظام کرنا چاہیے کہ ہمیشہ ہدیہ نہ لیا کریں۔ کہ جب مرید کا منہ دیکھا۔ خیال پیدا ہوا کہ کچھ ہدیہ لایا ہوگا۔ اس سے یہ ہوگا کہ خدا پر نظر نہ رہے گی۔ مرید پر نظر رہا کرے گی۔ افسوس! کہ پیر تو اس کے دین کو درست کرے اور یہ اس کے صلہ میں پیر کا دین بگاڑتا ہے۔

پھر تو پیر کی وہ حالت ہو جاوے گی۔ کہ ایک مرید نے اپنے پیر سے خواب بیان کیا۔ کہ آپ کی انگلیوں میں شہد بھرا ہوا ہے اور میری انگلیوں میں گوہ۔ پیر بولے تو دنیا دار ہے اور ہم دیندار۔ مرید بولا ابھی خواب پورا نہیں ہوا۔ یہ بھی دیکھا کہ میں آپ کی انگلیاں چاٹ رہا ہوں اور آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں۔ خیر یہ خواب ہو یا نہ ہو۔ مگر یہ نقشہ ہے۔ رسمی پیر اور مرید کے حال کا۔ مطلب یہ تھا۔ کہ مرید پیر سے دین حاصل کر رہا ہے اور پیر مرید سے

دنیا حاصل کرہا ہے۔تو تبھی اپنے پیر کوایسا ہی بناؤ گے۔ ہمارے حضرت کے یہاں یہ دستور تھا کہ کوئی لاتا تھااور کوئی لے جاتا تھا۔ایک امیر نے حضرت کی خدمت میں چھ ہزار روپے پیش کئے۔حضرت نے دوسرے حاجت مند کو دے دیئے۔حضرت یوں بھی روپیہ دوروپے برابر دیتے رہتے تھے۔فرماتے تھے کہ میں بعض آدمی سے جواس لئے ہدیہ لے لیتا ہوں۔ کہ یہ شخص حرم کے ثواب سے محروم نہ ہو۔اللہ اکبراس میں بھی ہمارے ہی نفع کا خیال۔

ایک شخص نے حضرت کے یہاں ایک ہدیہ پیش کیا۔ دوسرے روز اور پیش کیا۔ تیسرے روز اور پیش کیا۔حضرت نے مزاحاً فرمایا۔ کہ تھوڑا اس لئے روزانہ دیتے ہیں۔ تا کہ ہرروز جی خوش ہو۔اس لطیف عنوان سے ان کی پالیسی پر مطلع فرمادیا۔

غرض جب پیر کے پاس جاؤ تو ہدیہ کی پابندی نہ ہو۔اس میں دونوں طرف خرابی ہے۔مرید کے لئے تو یہ کہ اگر ہدیہ نہ ہوتو چاہے کیسی ہی ضرورت ہو۔ پیر کے پاس نہیں جاسکتے اور پیر کے لئے یہ کہ پھر توکل نہ رہے گا۔مرید پر نظر رہا کرے گی۔

بہرحال جب مال وجاہ کی طلب وحب غالب ہوتی ہے۔تو دوسروں کی نفی اور تحقیر و تنقیص کرتے ہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی کا علاج فرماتے ہیں:۔

تطا وعاو لا تختلفا (ایک دوسرے کا کہا ماننا اختلاف مت کرنا)

یہاں بھی اس اصول بلاغت کے موافق یا تو **تطا وعاو لا تعصیا** ہوتا یا **اتفقا و لا تختلفا** ہوتا۔مگراس میں بھی وہی نکتہ ہے۔کہ بجائے **اتفقا** کے **تطاوعا** فرما کر اتفاق کا مبنٰی بتا دیا۔کہ وہ تطاوع ہے۔کہ جب ہر ایک دوسرے کو اپنا مطاع و معظم سمجھے گا۔اتفاق لازم ہوگا۔

الحمدللہ! آج حاجی صاحب کے قول کا مبنٰی بھی معلوم ہوگیا۔کہ اتفاق تواضع سے ہوتا ہے۔ اور جب اختلاف ہوگا تکبر سے ہوگا۔پس فرماتے ہیں ۔کہنا مانو۔یعنی ہر ایک دوسرے کو بڑا سمجھو۔پھر سبحان اللہ یوں نہیں فرمایا کہ **امتثلا** بلکہ فرمایا **تطاوعا** طوع کہتے ہیں۔خوشی سے کہنا ماننے۔مطلب یہ کہ خوشی سے کہنا مانو۔یہ کاشف ہے۔مولانا محمد یعقوب صاحب کے قول کا۔کہ لوگ تواضع کو ذریعہ کبر بناتے ہیں۔کہ ظاہر میں متواضع بنتے ہیں تا کہ لوگ متواضع سمجھیں۔پس ایسا شخص امتثال تو کرے گا مگر طوع نہ ہوگا۔پس ایک اتفاق ضابطہ کا اتفاق ہے۔مگر دل سے

نہیں۔تو تطاوعا سے اس کا امر فرما دیا۔ کہ خوشی سے اتفاق رکھو۔ کہ یہ قلب کا کام ہے۔ پس حضرت کا قول نہایت واضح ہوگیا اور یہ کہ قلب کا کام ہے۔دلیل اس کی یہ آیت ہے:۔

وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ الْاٰيَةِ.

یعنی حق تعالیٰ کی وہ شان ہے۔ کہ قلوب میں اتفاق پیدا کر دیا۔ آگے فرماتے ہیں:۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِيْ الْاَرْضِ جَمِيْعًامَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ.

اگر آپ تمام روئے زمین کے خزانے صرف کر دیتے۔ تو الفت نہیں پیدا کر سکتے تھے۔ اے وہ لوگو! جو اتفاق اتفاق پکارتے ہو۔ اتفاق اس طرح نہیں پیدا ہوتا۔ صرف چالیس دن کسی اہل اللہ کی محبت اختیار کرو۔ تو تمہیں طریقہ معلوم ہو۔ ؎

قال را بگذار و مرد حال شو پیش مردے کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ و حال پیدا کرو کسی شیخ کامل کی جوتیاں سیدھی کرو)

اور طریقہ یہ ہوگا۔ کہ تمہارے دل سے جو کہ محل ہے۔ اتفاق کا خناس جو برنگ دین و دنیا ظاہر ہوتا ہے۔ دور ہو کر اس میں خلوص پیدا ہو جائے گا۔ اس کے بعد پھر سوسائٹی اور انجمن مبارک ہو۔ ورنہ ایسی انجمن اور ایسے ارکان کی یہ مثال ہے: ؎

گر بہ میر و سگ وزیر موش راہ دیوان کنند ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویران کنند

تو یہ آداب ہیں اصلاح کے۔ سبحان اللہ! اس قدر چھوٹے لفظوں سے اس قدر مضمون مستنبط ہوا۔ میں نے کچھ اپنی طرف سے نہیں بیان کیا۔ ہاں میں نے صرف اتنا کیا کہ مضمون کے چہرہ سے نقاب الٹ دی۔ اب معلوم ہوگیا ہوگا۔ کہ یہ مضمون نمکین نہیں ہے۔ ورنہ اس میں لوگوں کو جوش آتا۔ رقت طاری ہوتی اور تلخ بھی نہیں۔ ہاں شیریں ہے۔ اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے۔ کہ اس شیریں کو ہمارے حق میں گوارا فرمائے۔ اور ہماری ساری تلخیاں دور کر دے۔ آمین۔

و صلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه سيدنا و مولانا محمد و علىٰ اٰله و اصحابه و اجمعين. و اٰخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين.

الاستقامت

جس قدر دعوت الی اللہ اور اعمال صالحہ اور انشراح باظہار العبدیت میں ترقی ہوگی۔ اسی قدران ثمرات میں ترقی ہوگی۔ پھران ثمرات عالیہ کے لئے ترقی کی طلب کیوں نہ ہو؟ ضرور ہونا چاہیے۔ خصوصا جب کہ ترقی کے ذرائع بھی میسر ہوں۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست
خم و خم خانہ با مہر و نشاں ست

(از حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

☆...... ۵ جمادی الاخر ۱۳۴۰ھ بعد از نماز جمعہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''استقامت'' کے بارے میں یہ بیٹھ کر اڑھائی گھنٹے تک بیان فرمایا۔

☆......سامعین کی تعداد ۲۵ تھی۔

☆......حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے قلمبند فرمایا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دعا و خطبہ

الحمدللّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ ونؤمن بہٖ و نتوکل علیہ و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ للّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہٗ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ وبارک وسلم۔

اما بعد: فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔
اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡھِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَنۡ لَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ۔ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَفِی الۡاٰخِرَۃِ وَلَکُمۡ فِیۡھَا مَا تَشۡتَھِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَلَکُمۡ فِیۡھَا مَا تَدَّعُوۡنَ نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ۔ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ۔ وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ۔ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَبَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ۔ وَمَا یُلَقّٰھَاۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَمَا یُلَقّٰھَاۤ اِلَّا ذُوۡحَظٍّ عَظِیۡمٍ۔ وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ۔

(بے شک جن لوگوں نے اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر مستقیم رہے ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت پر خوش رہو جس کا تم سے وعدہ کیا جایا

کرتا تھا ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رہیں گے اور تمہارے لئے اس میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے اور نیز تمہارے لئے جو مانگو گے موجود ہے یہ بطور مہمانی کے ہوگا غفور رحیم کی طرف سے اور اس سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو خدا کی طرف بلائے اور نیک عمل کرتے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی، آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کیجئے پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے وسوسہ آنے لگے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ لیا کیجئے بلاشبہ وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے)

تمہید

آج کے بیان کی کوئی خاص ضرورت معتدبہ نہیں۔ محض استحسان کے درجہ میں بیان ہو رہا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے بعض مہمان مستورات کی درخواست پر گھر میں وعظ ہوا تھا۔ یہاں کے لوگوں کو (یعنی خانقاہ والوں کو) اس کی اطلاع نہیں ہوئی یا ہوئی۔ مگر وقت پر اطلاع ثانی کے منتظر رہے اور اطلاع وقت پر نہیں کی گئی۔ اس لئے شریک نہ ہو سکے۔

اور میں نے وقت پر قصداً اطلاع نہیں کی۔ کیوں کہ اس سے بعض لوگ یہ سمجھ جاتے ہیں۔ کہ شرکت کی طلب یا درخواست ہے۔ جس سے بعضے اپنے کاموں[1] کا حرج کر کے شرما شرمائی شریک ہوتے ہیں۔ اور وہ دن بھی تعطیل کا نہ تھا۔ اس لئے اکثر اپنا حرج ہی کر کے آتے۔ ان وجوہ سے میں نے اطلاع نہیں کی۔ پھر مجھے معلوم ہوا۔ کہ ختم وعظ پر جب یہاں خبر ہوئی۔ کہ آج گھر میں وعظ تھا۔ تو سب کو افسوس ہوا۔ تو میں نے خیال کر لیا تھا۔ کہ اس کی تلافی قریب ہی زمانہ

---

[1] خانقاہ میں یہ قانون ہو گیا تھا۔ کہ حضرت کا بیان اگر جمعہ کے دن کے علاوہ کسی دن بستی میں یا قرب و جوار میں ہو تو مدرسہ کی تعطیل کر دی جاتی۔ کیونکہ یہاں مدرسہ سے تکمیل درسیات مقصود نہیں۔ بلکہ اصل مقصود اصلاح باطن ہے۔ اس کی اعانت کے لئے بقدر ضرورت تعلیم کا سلسلہ بھی ہے اور یہ مقصود حضرت کے مواعظ میں بوجہ اکمل حاصل ہوتا ہے۔ یہ قانون طلبہ و مدرسین کی درخواست پر ہوا تھا۔ ۱۲ جامع

میں کسی دن کردوں گا۔ چنانچہ آج جمعہ تھا۔ تو ارادہ ہوا کہ آج اس فرض کو ادا کروں۔

اوراس کا مقتضا یہ تھا۔ کہ آج بھی وہی بیان ہوتا۔ جو زمانہ میں ہوا تھا یا ان ہی آیات کا بیان ہوتا۔ گو مضمون یا عنوان دوسرا ہوتا۔ مگر اس مضمون کا بعینہٖ اعادہ تو اس لئے نہ کیا۔ کہ وہاں مستورات کا مجمع تھا۔ وہاں ان کے مناسب مضمون اختیار کیا گیا تھا اور عنوان بھی ان کے مناسب تھا۔ مگر اتفاق سے مضمون ایسا بیان ہوا۔ جو مردوں کی ضرورت کا تھا۔ کیوں کہ پھر خاص خاص مسائل کے اکثر مسائل مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں۔ اس لئے مضمون تو وہی بیان ہوگا۔ مگر عنوان دوسرا ہوگا۔ جو اس مجمع کے مناسب ہوگا۔

اور آیات کا اعادہ اس لئے نہ کیا۔ کہ اس وقت اسی مضمون کے متعلق دوسری آیات ذہن میں آگئیں جن میں اس مضمون کی تکمیل تھی۔ کیونکہ قرآن کے مضامین ملتے جلتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں۔ کِتَابًا مُّتَشَابِهًا۔ (یعنی ایسی کتاب جس کے مضامین ملتے جلتے ہیں)

اس لئے ایک مضمون کے لئے چند در چند آیتیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ پس میں نے پہلی آیات کا اعادہ مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ جب اس مجمع کی خصوصیت سے عنوان بدلا گیا۔ تو آیات بھی دوسری اختیار کی گئیں۔

میں نے پہلے یہ بیان کیا تھا۔ کہ نبوت تو ختم ہو چکی ہے مگر ولایت ختم نہیں ہوئی اور ہر ولایت ہر شخص کو اسلام کی برکت سے حاصل ہوسکتی ہے۔ آج میں اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے بیان کرتا ہوں۔ وہ نیک استقامت کہ لازم ولایت ہے۔ دشوار نہیں۔ بلکہ سہل ہے اور یہ ہر شخص کو حاصل ہوسکتی ہے اور جو لوگ استقامت کو دشوار سمجھتے ہیں۔ اس کا منشاء افراط و مبالغہ ہے۔

فضائل ایمان

تعیین مضمون کے بعد اب تفسیر آیات شروع کرتا ہوں۔ ان آیات میں اصل مقصود فضائلِ ایمان کا بیان ہے۔ مگر اس کیلئے کچھ شروط ہیں۔ جن میں سے بعض پر نفس ایمان موقوف ہے اور بعض پر کمال ایمان موقوف ہے۔ ان شروط کو بھی یہاں پیش کیا گیا ہے۔

ماقبل سے ان آیات کا ربط یہ ہے۔ کہ اس سے پہلے حق تعالیٰ نے کفار کی بدحالی بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے یہ آیات ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ. لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ. وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ.

ترجمہ: اور یہ کافر (باہم) یوں کہتے ہیں۔ کہ اس قرآن کو سنو ہی مت۔ اور (اگر پیغمبر سنانے لگیں تو) اس کے بیچ میں غل مچادیا کرو۔ شاید (اس ترکیب سے) تم ہی غالب رہو (اور پیغمبر ہار کر چپ ہو جاویں۔) سو (اس نالائق حرکت اور ایسے ارادہ کے بدلہ میں) ہم ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ چکھادیں گے۔ اور ان کو ان کے (ایسے) برے برے کاموں کی سزا دیں گے۔ یہی سزا ہے۔ اللہ کے دشمنوں کی۔ یعنی دوزخ ان کے لئے وہاں ہمیشگی کا مقام ہوگا۔ اس بات کے بدلہ میں کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے اور (جب مبتلائے عذاب ہوں گے تو) وہ کفار کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو وہ دونوں شیطان اور انسان دکھلا دیجئے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا۔ ہم ان کو اپنے پیروں کے تلے مل ڈالیں تا کہ وہ خوب ذلیل ہوں۔

کفار کی بدحالی بیان فرما کر حق تعالیٰ مسلمانوں کی خوش حالی بیان فرماتے ہیں۔ جس کے ساتھ ایمان کے فضائل اور اخلاق جمیلہ کی تعلیم بھی مذکور ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی عادت ہے۔ کہ کفار اور مؤمنین کی حالت ساتھ ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ کبھی اول مومنین کی حالت بیان ہوتی ہے۔ تو اس کے بعد ساتھ ہی کفار کا حال بھی مذکور ہوتا ہے اور کبھی برعکس۔ تا کہ ترغیب وترہیب دوش بدوش رہیں۔ بعبارت دیگر یوں کہیے۔ تا کہ جمال وجلال کی تجلی ساتھ ساتھ ہوتی رہے۔ اس سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کے متعلق میں اپنا ایک امر وجدانی عرض کرتا ہوں۔ مجھے چند روز سے یہ بات محسوس ہوئی ہے اور بچپن سے بھی مجھے اس کا احساس تھا۔ مگر اب چند روز سے زیادہ احساس ہے۔ کہ مجھے قرآن کے دو صفحوں پر تو نور سا محسوس ہوتا ہے اور اس کے بعد دو صفحے ایسے معلوم

ہوتے ہیں جیسے ان پر سایہ پڑا ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی چند آیات شروع کے دو صفحوں پر ہیں۔ مجھے یہ زیادہ روشن محسوس ہوتی ہیں اور اس کے بعد کے دو صفحے ایسے ہیں کہ گویا ان پر ظل پڑا ہوا ہے۔ اسی طرح سارے قرآن میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

چند روز سے مجھے اس کی علت یہ ذہن میں آئی۔ کہ جمال و جلال کی صورت منکشف ہوتی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں ترغیب و ترہیب ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ تو جہاں ترغیب ہے وہاں تجلی جمالی ہے۔ جو زیادہ واضح ہے اور جہاں ترہیب ہے وہاں تجلی جلالی ہے جو کسی قدر ستر و حجاب لئے ہوئے ہے۔ خواہ کوئی اسے میرا وہم سمجھے۔ مگر میرے خیال میں یہی آیا ہے۔ واللہ اعلم۔

چنانچہ اس مقام پر پہلے جلال کا ذکر ہے۔ اب اہل جمال کا ذکر ہے۔ کہ جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اس پر قائم رہے۔ ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے آتے ہیں۔ کہ ڈرو مت اور اس جنت کے ساتھ خوش رہو۔ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

مبالغہ فی التقویٰ

اب سمجھنا چاہیے۔ کہ یہاں استقامت سے کیا مراد ہے۔ بعض لوگ اس کی تفسیر میں غلطی کرتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہمارے اندر دو مرض ہیں۔ افراط، تفریط۔ اہل تفریط نے استقامت کی تفسیر میں بھی تفریط کی ہے اور اہل افراط نے اس کی تفسیر میں غلو کیا ہے۔ پس ہم کو اپنے اندر اعتدال پیدا کر کے اپنی اصلاح کرنا چاہیے۔ ہر چند کہ افراط و تفریط دونوں مذموم ہیں۔ مگر افراط زیادہ مذموم ہے۔ کیونکہ اہل تفریط تو اپنی کوتاہی کو اکثر سمجھتے بھی ہیں۔ گو سستی ہی کی وجہ سے کوتاہی کریں اور ان کو اپنی غلطی پر بھی متنبہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے علم و عمل کو ناقص سمجھتے ہیں۔ مگر اہل افراط اپنے افراط کی غلطی پر متنبہ نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ افراط کو محمود اور کمال تقویٰ سمجھے ہوئے ہیں اور چونکہ اکثر افراط اعتقادی میں زیادہ مبتلا ہیں اسی لئے بعض لوگ استقامت کا نام سن کر یہ سمجھے ہوں گے۔ کہ استقامت کوئی بڑی دشوار چیز ہے۔ جس کی وجہ وہی ہے کہ بہت لوگ تقویٰ میں مبالغہ کرتے ہیں اور وہ اسی کو استقامت سمجھتے ہیں اور اس کو محمود سمجھتے ہیں اور بظاہر یہ محمود معلوم بھی ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں محمود نہیں۔ کیوں کہ مبالغہ کی وجہ سے کسی وقت یہ شخص مایوس بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس

کے نزدیک تقویٰ کا جو اعلیٰ درجہ ہے۔ اس کی تحصیل دشوار ہے اور ادنیٰ درجہ کو یہ ناکافی سمجھتا ہے۔ اس لئے اخیر میں اس کو مایوسی ہو جاتی ہے۔ جس کا انجام تعطل ہے۔

مثلاً بعض واعظوں سے لوگوں نے تقویٰ کے قصے سنے ہوں گے اور ہم نے بھی بچپن میں ایسے قصے دیکھے ہیں۔ جیسے ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ طعام حلال کی تلاش میں کسی بزرگ کے پاس آیا اور کہا۔ میں آپ کے پاس طعام حلال کی طلب میں آیا ہوں۔ یہ سن کر وہ رونے لگے اور فرمایا کہ ہاں اب تک تو میرا کسب حلال تھا مگر اب نہیں رہا۔ کیونکہ ایک دین میرے بیل دوسرے شخص کے کھیت میں چلے گئے۔ اس کی مٹی بیلوں کے پیر کو لگ گئی اور میرے کھیت میں مل گئی۔ اب مجھے شبہ ہو گیا ہے۔ ایسے قصے سن کر لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ بس تقویٰ بہت دشوار ہے۔ حالانکہ یہ قصہ شریعت کے بھی بالکل خلاف ہے اور عقل کے بھی۔

عقل کے خلاف تو اس لئے کہ بیلوں کے پیر کو جو مٹی لگ جاتی ہے وہ تھوڑی دور چلنے سے جھڑ جاتی ہے۔ تو کیا یہ ضرور ہے کہ دوسرے کے کھیت کی مٹی اس کے کھیت میں مل گئی ہو۔ پھر اگر دوسرے کے کھیت کی مٹی ان کے کھیت میں مل گئی ہو۔ تو ایسے ہی ان کے کھیت کی مٹی اس کے کھیت میں جا ملی ہوگی۔ تو برابر سرابر معاملہ ہو گیا۔ پھر اگر اتنی مٹی سے شبہ ہو جایا کرے۔ تو چاہیے کہ جانوروں کو ہر وقت بند رکھا جائے۔ کہیں چلنے پھرنے نہ دیا جائے۔ حالانکہ جانور بند نہیں رہ سکتے۔

اور شریعت کے خلاف اس لئے ہے حاملان شریعت نے ایسے مبالغہ کو قابل تعزیر سمجھا ہے۔ مثلاً کوئی شخص ایک دانہ گندم کی تعریف و تشہیر کرتا پھرے۔ کہ یہ دانہ کس کا ہے۔ تو فقہاء کہتے ہیں کہ انه یعزر اس شخص کو سزائے تعزیر دی جائے۔ کیونکہ شریعت نے اس قلیل مقدار کو قابل تعریف اور داخلہ لقطہ نہیں بتایا۔ کیوں کہ یہ مال نہیں۔

اور حدیث میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آتا ہے۔ کہ بعض دفعہ راستہ میں مجھے ایک چھوارہ پڑا ہوا ملتا ہے۔ تو میں اس کو کھانا چاہتا ہوں۔ مگر اس خیال سے نہیں کھاتا۔ کہ مبادا صدقہ کا ہو (کیونکہ صدقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حرام تھا) جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قلیل بھی مال ہے۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک چھوارہ عادۃً منتفع بہ ہے اس لئے وہ مال ہے اور ایک دانہ گندم منتفع بہ نہیں۔اس لئے وہ مال نہیں۔غرض شریعت نے ایسی قلیل مقدار کو نقطہ نہیں بنایا اور یہ شخص اس کو نقطہ بناتا ہے۔گویا یہ اپنی طرف سے نئی شریعت ایجاد کرتا ہے۔اسی طرح اگر بیل کے پیر کو مٹی لگ جائے تو وہ کوئی قیمتی چیز نہیں۔چنانچہ اتنی مٹی کی بیع جائز نہیں اور جب قیمتی نہیں تو اس کا ضمان بھی نہیں۔پھر اس کے کھیت میں ملنے سے شبہ کیوں ہو گیا اور اگر بالفرض ضمان بھی لازم ہوتا تو اس کا ضمان ادا کر دینا کافی تھا۔تم نے اپنے کھیت میں سے اتنی ہی مٹی دوسرے کے کھیت میں ڈال دی ہوتی۔اس سے کھیت کا غلہ اور پیداوار کیوں حرام ہو گیا۔پس یا تو یہ قصہ موضوع ہے۔یا یہ لوگ اہل حال ہیں۔جو معذور ہیں۔یا وہ شریعت سے ناواقف ہوں گے۔اس لئے ایسے اقوال حجت نہیں اور واعظوں کو ایسے قصے بیان کرنا جائز نہیں۔اس قسم کے قصوں سے لوگ یہ سمجھ گئے کہ تقویٰ بہت دشوار ہے اور جب تقویٰ اور استقامت حاصل نہیں ہو سکتی۔کیونکہ حلال خالص مل نہیں سکتا۔تو

چوں آب از سرگزشت   چہ یک نیزہ چہ یک دست

(جب پانی سر کے اوپر سے گزر گیا پھر کیا ایک نیزہ کیا ایک ہاتھ)

جب حرام کھانے سے مفر نہیں۔تو تھوڑا کھایا تب کیا بہت کھایا۔تب کیا۔بس اب بے احتیاطی شروع ہو گئی۔اول ایک بے احتیاطی ہوئی۔پھر دوسری، پھر تیسری، پہلے تو شبہات سے بچانے کا اہتمام تھا، اب حرام صریح سے بھی باک نہیں۔یہ انجام ہے مبالغہ اور غلو کا۔

حدود تقویٰ

اسی لئے شریعت نے غلو سے منع کیا ہے۔قرآن مجید میں بھی امر ہے:۔

لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (المصنف لابن ابی شیبة ۱۲:۲۹۳)

(یعنی اپنے دین میں غلو نہ کرو) اور احادیث میں بھی اس کی سخت ممانعت ہے۔

من شاق شاق اللہ علیه۔(جو شخص اپنے اوپر مشقت ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر مشقت ڈال دیتے ہیں) (سنن ابی داؤد، الأقضیة باب : ۳۱)

کیوں کہ اس میں حدود سے تجاوز ہے۔اور حدود سے تجاوزت کرنا اطاعت نہیں۔بلکہ معصیت ہے۔صاحبو! شریعت نے ہر چیز کے لئے حدود مقرر کی ہے۔نماز کیسی اچھی چیز ہے مگر اس کے لئے بھی حدود ہیں۔کہ طلوع وغروب کے وقت نماز حرام ہے۔مثلاً پھر تقویٰ اور استقامت کے لئے حدود کیوں نہ ہوں گے۔یقیناً اس کے لئے بھی ایک حد ہے۔اس سے آگے جو تقویٰ ہو۔وہ ممنوع ہے۔اسی واسطے شیخ شیرازی فرماتے ہیں:

بزہد وورع کوش وصدق وصفا ولیکن میفزا ئے بر مصطفےٰ

یعنی ایسا تقویٰ نہ کرو۔کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ جائے۔یعنی ایسا غلو نہ کرو کہ ایسا تقویٰ کرنے لگو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ویسا تقویٰ نہ کیا ہو۔

حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور العمل تو یہ آیا ہے۔

ما خير رسول الله صلى الله عليه وسلم بين امرين الااختار ايسرهما.

(کتاب التمهيد لابن عبدالبر ۸: ۱۴۶)

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر ایک امر میں دو راستوں کا اختیار دیا جاتا تھا۔تو آپ سہل کو اختیار فرماتے تھے۔یعنی طرق مقاصد میں مشقت کو اختیار نہ فرماتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفس پر مشقت ڈالنا مطلقاً محمود نہیں۔مگر لوگ نفس پر مصیبت ڈالنے ہی کو مقصود ومحمود سمجھتے ہیں۔یعنی وہ صورت اشد کو ہی مطلقاً افضل سمجھتے ہیں۔

چنانچہ ایک صاحب اسی خیال کے تھے۔وہ کہتے تھے کہ جس عمل میں مشقت ہو وہی افضل ہے۔میں نے کہا یہ مطلقاً نہیں۔بلکہ مقاصد کے ساتھ مخصوص ہے اور پھر اس کے بھی حدود ہیں اور وسائل میں تو سہل صورت مطلقاً افضل ہے۔وہ نہ مانتے تھے۔میں نے کہا بہت اچھا۔پھر وضو کے لئے پانی لانے کی دو صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ تھانہ بھون کے کنویں سے لایا جاوے۔دوسرے یہ کہ جلال آباد و لوہاری سے لایا جاوے تو آپ یہاں سے پانی لے کر وضو نہ کریں۔بلکہ جلال آباد یا لوہاری سے لائیں۔کیونکہ اس میں مشقت ہے اور مشقت کا کام افضل ہے۔اس مثال کے بعد انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔پس یاد رکھو۔کہ مشقت میں مطلقاً اجر نہیں۔

بعض صحابہ رضی اللہ عنھم نے ایک دفعہ اعمال شاقہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ایک نے کہا میں رات بھر نہ سویا کروں گا۔ دوسرے نے کہا۔ میں نکاح نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں عمر بھر گوشت نہ کھاؤں گا اور ان سب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز معتدل سن کر یہ بھی کہا کہ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی مشقت برداشت نہیں فرماتے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ بڑا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ضرورت نہیں۔ ہم کو ضرورت ہے۔ اسی طرح ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی رخصت پر عمل کیا تو بعض صحابہ رضی اللہ عنھم نے اس سے تنزہ کیا اور یہ سمجھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عزائم پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو کمال کو پہنچ چکے ہیں۔ مگر ہم کو عزیمت پر ہی عمل کرنا چاہیے۔ رخصتوں سے احتیاط کرنا چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگواری ہوئی۔ فرمایا:

ما بال اقوام یتنز ھون مما اصنع و انا اغشا کم للہ ھو اتقاکم اللہ۔

(الصحیح للبخاری ۸:۳۱)

لوگوں کا کیا حال ہے۔ کہ جو کام میں کرتا ہوں۔ وہ اس سے احتیاط کرتے ہیں۔ حالانکہ میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں اور سب سے بڑھ کر متقی ہوں۔ غرض ہر چیز کے لئے حدود مقرر ہیں۔ جن سے آگے بڑھنا جائز نہیں۔ وسائط میں تو حدود کیوں نہ ہوں گے۔ جب کہ مقاصد میں بھی حدود ضروری ہیں۔ مقاصد ظاہری وموقت جیسے نماز و روزہ میں تو سب کو معلوم ہے۔ مقاصد باطنی و مستمرہ جیسے شوق و خوف ہیں۔ کہ مقصود ہیں اور جیسے ذکر لسانی میں کوئی مقصود مستمر ہے۔ ان میں بھی تحدید ہے۔ مثلاً ذکر لسانی ہے۔ کہ غلبہ نعاس کے وقت اس میں سکومت مامور بہ ہے۔

افراط کی خرابی

اور مثلاً شوق و خوف یہ مقاصد باطنہ میں ہیں۔ مگر احادیث سے غور کے بعد ان کیلئے بھی حدود معلوم ہوتے ہیں۔ الحمد اللہ حق تعالیٰ نے مجھے یہ علم عطا فرمایا ہے۔

چنانچہ اس حدیث کے ایک جملہ سے میں نے خوف کی حد سمجھ ہے اور ایک سے شوق کی۔ حدیث میں آتا ہے۔

اللهم انی اسئلک من خشیتک ما تحول به بینی و بین معاصیک.
(لم اجد الحدیث فی "موسوعة اطراف الحدیث الشریف")

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں فرماتے ہیں۔ کہ اے اللہ! میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں کہ جو میرے اور میرے گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوف کے لئے ایک حد بیان فرمائی ہے اور اسی حد کے موافق حصول خوف کی دعا ہے۔ حالانکہ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے۔ کہ جب خوف مقصود ہے تو جتنا زیادہ ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ مگر غور کرنے سے اس قید کا نفع یہ معلوم ہوا۔ کہ اگر خوف حد سے زیادہ ہوتا ہے۔ تو تعطل کا سبب ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کو رحمت الٰہی سے مایوسی ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی ناشکری تو ابتداء ہی میں ہونے لگتی ہے۔ جس شخص پر خوف کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے اعمال کو حقیر اور لاشئے سمجھتا ہے اور کہتا ہے۔ اجی! میں کیا نمازی ہوتا۔ میری تو نماز اور عدم نماز برابر ہے۔ بس وہ ایسی تواضع کرنے لگتا ہے۔ جیسی ہم نے سفر الہ آباد سے کانپور آتے ہوئے چند جنٹلمینوں کی تواضع دیکھی تھی۔ ریل میں میرا اور ان کا ساتھ ہو گیا۔ بڑے ہی چھچھورے اور پھکڑ تھے۔ بعضوں کی تہذیب محض ظاہری ہی ہوتی ہے۔ ان سب نے مل کر ایک ناآشنا منصف کو تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ اس کو بنانا شروع کیا۔ ایک نے دسترخوان بچھایا اور کہا آیئے منصف صاحب آپ بھی کچھ گرہ موت کھا لیجئے۔ دوسرے نے کہا توبہ کرو توبہ۔ کھانے کی بے ادبی کرتے ہو۔ کہنے لگا اس میں کھانے کی بے ادبی نہیں۔ بلکہ اپنی تحقیر ہے۔ اپنے کھانے کو کھانا کہنا تکبر ہے۔ اپنی نسبت سے اس کو گوہ موت ہی کہنا چاہیے۔ مگر غنیمت ہے میرے حال پر انہوں نے عنایت رکھی۔ ایک صاحب جو مجھ کو اسٹیشن پر پہنچانے آئے تھے۔ ان کو دھمکا گئے۔ اس لئے مجھے تو کسی بات میں مخاطب نہیں کیا۔ اسی طرح زیادہ خوف والے اپنے اعمال کی بے قدری کرتے ہیں اور تواضع میں اپنی نماز روزہ کو بے کار وفضول کہتے ہیں۔ جیسے ان لوگوں نے تواضعاً کھانے کو گوہ موت کہا تھا۔ اے صاحب! اگر نماز کی آگ کو اتنی توفیق بھی نہ ہوتی۔ جواب ہو رہی ہے۔ تو بتلایئے کہاں جہاں کر سر پکتے۔

بلا بودے اگر اینہم نبودے

صاحبو! اعمال کی بے قدری بری بلا ہے۔ اعمال فی نفسہ۔ سب محمود و مقبول ہیں۔ ہاں ہماری حیثیت سے وہ کچھ بھی نہیں۔ مگر نعمت الٰہی ہونے کے اعتبار سے بڑی چیز

ہیں۔ پھر اس بے قدری کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جو شخص جب اپنے اعمال کو مغفرت کے لئے ناکافی سمجھتا ہے۔ تو سب کام چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ یہی تعطل ہے۔

اسی طرح شوق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود بیان فرمائی ہیں۔

اللهم انی اسئلک شوقا الیٰ لقائک فی غیر ضراء مضرة و لا فتنة مضلة.

(لم نجد الحديث في "موسوعة أطراف الحديث النبوي الشريف")

اس میں دو قیدیں ہیں۔ کہ اے اللہ مجھے ایسا شوق عطا ہو۔ جس میں ضرار مضرہ نہ ہو (یعنی ضرر ظاہری) اور فتنہ مضلہ نہ ہو (یعنی ضرر باطنی) کیونکہ غلبہ شوق میں کبھی جسم کو بھی ضرر پہنچ جاتا ہے۔ کہ شوق میں بے چین ہو کر گھلنے لگتا ہے اور باطنی ضرر بھی ہو جاتا ہے۔ کہ بعض لوگ حد ادب سے نکل جاتے ہیں۔ جیسے غلبہ شوق میں بعض عشاق محبوب کے پیروں میں گر پڑتے ہیں اور اس کی ٹانگ کھینچ لیتے ہیں۔ بعضے زبردستی اس کا ہاتھ کھینچ کر چومتے ہیں۔ بعض دفعہ باوجود کسی قابل نہ ہونے کے چند حالات و کیفیات عطا ہونے سے اپنے کو کامل سمجھنے لگتے ہیں۔

اہل اللہ ان واقعات کو جانتے ہیں۔ پھر حدود سے آگے نکلنے پر ان سے مواخذہ ہوتا ہے۔ اس وقت سمجھ جاتے ہیں۔ کہ یہ ہماری فلاں حرکت کی سزا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے دعا کی۔ کہ اے اللہ میں تو دو روٹیاں اس وقت اور دو روٹیاں اس وقت مانگتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگتا۔ بس ان پر یہ بلا نازل ہوئی کہ چوروں کے ساتھ شبہ میں پکڑے گئے اور جیل خانہ میں دونوں وقت دو دو روٹیاں ملنے لگیں۔ بہت پریشان تھے کہ کس گناہ میں پکڑا گیا۔ الہام ہوا کہ تم نے دو روٹیاں مانگی تھیں۔ عافیت کی قید نہیں لگائی تھی۔ یہ اس کی سزا ہے۔ اب توبہ کی اور عافیت کی دعا کی۔ فوراً حاکم اعلیٰ کا حکم جیلر کے نام پہنچا۔ کہ فلاں شخص غلطی سے پکڑے گئے۔ فی الفور رہا کر دیئے جاویں۔ تب چھوٹے۔ بعض دفعہ تو قیود نہ لگانے پر مواخذہ ہوتا ہے۔ جب وہ ضروری ہوں اور بعض دفعہ قیود لگانے پر مواخذہ ہوتا ہے۔ جب وہ فضول ہوں۔

چنانچہ ایک صحابی زادے نے اس طرح دعا کی تھی۔

اللهم انی اسئلک القصر الابیض عن یمین الجنة

(اے اللہ میں سفید محل مانگتا ہوں۔ جو جنت کی دائیں طرف ہو) ان کے والد

صاحب نے جو صحابی تھے۔ فرمایا۔

یا بنی سل اللّٰہ الجنۃ ولا تعتد فی الدعا ما نی سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ لا یحب المعتدین فی الدعاء.

(لم أجد الحديث في "موسوعة أطراف الحديث النبوي الشريف")

(صاحبزادے! اللہ سے جنت مانگو اور دعا میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ دعاء میں حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتے۔ تو دعا کے لئے بھی ایک حد ہے۔ شوق کے لئے ایک حد ہے۔

حد استقامت

اسی طرح استقامت کے لئے بھی ایک حد ہے۔ مگر بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں۔ کہ اعلیٰ درجہ کی استقامت ہونا چاہیے۔ ادنیٰ درجہ کی استقامت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نماز میں تطویل کرتے تھے۔ جمعہ کی نماز میں بھی لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے۔ جس سے لوگ دیر تک دھوپ میں جلتے تھے۔ ان کے نزدیک استقامت کا یہی درجہ مطلوب تھا۔ کہ نماز میں خوب تطویل ہو اور اس میں غلو یہ کیا کہ جماعت میں بھی تطویل کرنے لگے۔ حالانکہ امام کو تخفیف کا امر ہے۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ ایسی لمبی نماز سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ نماز مختصر پڑھانی چاہیے۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں۔ کہ تم لوگ دھوپ سے ہی گھبرا گئے۔ تو جہنم میں کیسے رہوگے۔ سبحان اللہ! آپ مسلمانوں کو جہنم کی گرمی سہنے کی مشق کراتے تھے۔

ایسے ہی ایک صاحب سجدہ میں اکیس بار سبحان ربی الاعلیٰ کہتے تھے تو جو شخص ایسی نماز کو استقامت سمجھے گا۔ وہ اس سے کم کو نماز ہی نہ سمجھے گا۔ اس کا انجام یہ ہوگا۔ کہ اس کے پیچھے ایک دفعہ کوئی نماز پڑھ لے گا۔ تو پھر ہمیشہ کو چھوڑ دے گا۔ اور خود اس شخص کو بھی اگر کسی وقت اس قدر اطمینان سے نماز پڑھنے کا موقع نہ ملے۔ مثلاً ریل میں اتنا اطمینان میسر نہیں ہوتا۔ تو اس حالت میں یہ نماز ہی کو چھوڑ دے گا۔ یہ خرابی ہے افراط و غلو کی اور جو شخص غلو نہ کریگا۔ وہ ہر وقت جیسا موقع ہوگا۔ ویسی ہی حسب رخصت شرعیہ نماز پڑھے گا۔ اس سے مقتدیوں کو بھی تکلیف نہ ہوگی اور خود یہ بھی عمل پر دوام کر سکے گا اور بڑی استقامت استدامت ہی ہے۔ کہ عمل پر دوام ہو اور یہ

مبالغہ کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ دوام ہمیشہ اعتدال سے حاصل ہوتا ہے۔

درجات استقامت

اب سمجھئے کہ استقامت کے چند درجے ہیں۔ایک اعلیٰ۔ایک ادنیٰ۔ایک متوسط۔اور یہ قاعدہ عقلیہ مسلم ہے۔

لا تشکیک فی الماھیات.

حقائق و ماہیات میں تشکیک نہیں ہوتی۔ بلکہ تشکیک محض افراد میں ہوتی ہے۔ پس ہر درجہ میں حقیقت استقامت کا موجود ہونا ضروری ہے اور جب استقامت ہر درجہ میں حاصل ہے تو اس کی فضیلت بھی ہر درجہ میں حاصل ہے۔ جو لوگ استقامت میں غلو کرتے ہیں وہ اس کو اعلیٰ درجہ میں منحصر کرتے ہیں۔ مگر یہ رحمت الٰہی کو تنگ کرنا ہے۔ حالانکہ خدائے تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ کہ ایک اعرابی نے نماز کے بعد دعا کی۔

اللھم الرحمنی و محمدًا ولا تشرک فی رحمتنا احدا

یعنی اے اللہ! مجھ پر رحم کیجئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ہمارے ساتھ رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا۔

لقد تحجرت واسعًا (جامع المسانید ۲: ۶۹۷)

تو نے وسیع شے کو تنگ کر دیا۔ وہ بے چارہ یہ سمجھا ہوگا۔ کہ سب پر رحمت ہوئی۔ تو بٹتے بٹتے کم رہ جاوے گی۔

باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس نے خاطر کی وجہ سے شریک کر لیا ہوگا۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تو ایمان ہی نصیب ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو شریک کر لینا چاہیے۔ باقی اور سب کی صاف نفی کر دی۔

مگر ان گاؤں والوں کی بے ادبی معاف ہے۔ کیوں کہ وہ جاہل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک بدوی نے سورۂ والتین والزیتون سنی تھی۔ اس کو خیال ہوا۔ کہ حق تعالیٰ نے انجیر و زیتون کی قسم کھائی ہے۔ تو یہ ضرور مزے دار ہوں گے۔ کھانا چاہیے۔ چنانچہ اول انجیر خریدا تو مزے دار تھا۔

کہنے لگا۔ صدقت ربنا۔اے اللہ آپ نے سچ کہا۔ پھر زیتون خریدا اور اسے بھی کھالیا۔ وہ بڑا بکلا تھا۔ تو کہنے لگا واہ اللہ میاں (نعوذ باللہ) چکھنے سے پہلے ہی قسم کھالی۔ یہ تو خدا تعالیٰ کے ساتھ برتاؤ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ برتاؤ تھا۔ کہ ایک دفعہ بہت سے اعرابی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر ہو گئے۔ کہ ہم کو کچھ مال دلوایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ فرمایا۔ کہا نہیں ابھی دلوایئے اور یہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر زور سے کھینچ لی۔ جس سے گردن مبارک پر نشان ہو گیا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو کچھ نہیں دھمکایا۔ بس ہنس کر یہ فرمایا۔

ردائی ردائی ارے بھائی میرے چادر تو دے دو۔

ہمارے مولانا فتح محمد صاحب کے پاس ایک ولایتی طالب علم پڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی بات پر سبق میں آپ کو غصہ آ گیا۔ تو مولانا سے کہتا ہے کہ تم کافر ہو۔ مولانا نے فرمایا کہ پھر کافر سے پڑھنے کے لئے کیوں آئے۔ کہا کافر سے فن سیکھنا جائز ہے۔ پھر تھوڑی دیر میں معافی چاہنے آیا اور کہا مولوی صاحب ہماری بات کا برا نہ ماننا۔ تم ہمارا معشوق ہے ہم تمہارا عاشق ہے اور عاشق معشوق کو کہہ ہی لیا کرتا ہے۔ تو ایک محبت ولایتی بھی ہوتی ہے جس میں گستاخی بھی جائز ہے۔

غرض جس طرح اس اعرابی نے رحمت کو تنگ کر دیا تھا۔ اسی طرح جو لوگ استقامت میں غلو کرتے ہیں وہ بھی رحمت کو تنگ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنت بس انہی کے واسطے ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ استقامت کا ہر درجہ استقامت ہے اور ہر درجہ کے لئے فضیلت ثابت ہے۔ پس استقامت کے سیدھے سادے معنی وہ ہیں۔ جو اس آیت کی تفسیر میں منقول ہیں۔ آیت یہ ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔

اور تفسیر یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے یوں کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اس پر جمے رہے (یعنی مرتد نہیں ہوئے) البتہ قالوا میں ایک قید بے شک ضروری ہے۔ یعنی قالوا بقلوبھم کہ انہوں نے حق تعالیٰ کی ربوبیت و توحید کا اقرار دل سے کیا ہو۔ پس قواعد شرعیہ سے یہ قید ضروری ہے کیوں کہ بدوں تصدیق بالقلب کے ایمان معتبر نہیں۔ پھر حق تعالیٰ کے اعتبار سے تو قلب کا ایمان کافی ہے۔ مگر اجراء احکام کے لئے زبان سے کہنا بھی شرط ہے۔ جس میں حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کے ایمان کا علم ہو۔ تو وہ اس کو اپنا آدمی سمجھیں۔

اس کے حقوق ادا کریں اور کفار اس سے الگ رہیں۔ اس کو اپنے اندر ملانے کی کوشش نہ کریں۔ تو یہ ظاہری قواعد سے حکمت معلوم ہوتی ہے اور قواعد باطن سے اس میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ جیسے باطن کا اثر ظاہر پر ہوتا ہے۔ اسی طرح ظاہر کا اثر باطن پر ہوتا ہے۔ چنانچہ بچوں کے حفظ قرآن کا طریقہ تکرار باللسان ہے۔ زبان سے جس لفظ کو بار بار کہا جاتا ہے۔ وہ دل میں جم جاتا ہے۔ اسی طرح ذکر باللسان کو زیادت اثر فی الباطن میں دخل ہے۔ پس ان الذین قالوا ربنا اللہ کے معنی یہ ہیں۔ الذین امنوا بالقلب و صدقوا باللسان۔ جنہوں نے دل سے خدا کو مانا اور زبان سے تصدیق کی اور ثم استقاموا کے معنی یہ ہیں۔ کہ اقاموا علیہ و لم یرتدوا۔ پھر اس پر جمے رہے۔ اور مرتد نہیں ہوئے۔ جزو اول قالوا ربنا اللّٰہ میں احداث ایمان ہے اور جزو دوم ثم استقامو ا میں ابقاء ایمان ہے۔ یہ معنی ہیں استقامت کے سیدھے سادے۔ آگے اس پر تفریع ہے:۔

تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْ اوَلَا تَحزَنُوْا.

کہ ان پر فرشتے اترتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہوئے آتے ہیں۔ (کہ آخرت کے اہوال سے) ڈرو مت اور (دنیا کے فوت ہونے کا) غم نہ کرو۔ یہ فضیلت ہر مومن کو جو مرتد نہیں ہوا حاصل ہوگی۔ کیوں کہ استقامت کا ایک درجہ اس کو بھی حاصل ہے اور یہاں جس فضیلت کا ذکر ہے۔ وہ مطلق استقامت پر متفرع ہے۔ خواہ کسی درجہ کی استقامت ہو۔ مگر نہ معلوم ان واعظوں نے کہاں سے مخلوق کا گلا گھونٹ دیا اور استقامت کو اعلیٰ درجہ میں کس دلیل سے منحصر کر دیا۔ پس یہ تنہا ہی جنت میں جانا چاہتے ہیں۔ اکیلے ہی قلانچیں مارتے پھریں گے۔ مگر جب یہ دوسروں کو محروم کرنا چاہتے ہیں تو خود بھی نہ جائیں گے۔ کیونکہ جب لوگوں کو کمال تقویٰ سے قاصر ہونے کی وجہ سے یہ جنت سے محروم سمجھے جاتے ہیں۔ تو اس کے مواخذہ میں بھی اول مستحق کیسے ہو جاویں گے۔

استقامت آسان ہے

بعض لوگوں کو بعض نصوص سے اس کا شبہ ہو گیا ہے۔ کہ استقامت دشوار چیز ہے۔

چنانچہ بعض نے فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ سے كَمَآ اُمِرْتَ کی قید دیکھ کر یہ سمجھا ہے۔ کہ استقامت کوئی بڑی چیز ہے۔ جب ہی تو اس کو کما امرت کے ساتھ مقید کیا گیا۔ ورنہ اس قید کی کیا ضرورت تھی اور یہ حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے۔ کیونکہ آگے وَمَنْ تَابَ مَعَكَ بھی ہے۔ جس سے مطلب یہ ہوا:۔

استقم كما امرت وليستقم من تاب معك كما امروا.

کہ جس طرح کا آپ کو امر ہے۔ اس طرح آپ مستقیم رہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔ جیسے ان کو امر ہوا ہے۔ اس طرح وہ مستقیم رہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب کو امر الٰہی کے موافق استقامت حاصل کرنے کا حکم ہے۔ اس سے کم درجہ کافی نہیں۔

تو سمجھنا چاہیے۔ کہ یہ لوگ قرآن کے سیاق و سباق میں غور نہیں کرتے۔ اس لئے شبہ میں پڑ گئے۔ اگر ماسبق و مالحق کو ملا کر اس آیت کو دیکھتے تو اشکال نہ ہوتا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں اس سے پہلے کفار کا ذکر ہے۔ چنانچہ اس آیت کے اوپر یہ آیت ہے:۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ط وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ط وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ.

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی۔ سو اس میں بھی اختلاف کیا گیا اور اگر ایک بات نہ ہوتی۔ جو آپ کے رب کی طرف سے ٹھہر چکی ہے تو ان کا فیصلہ (ابھی) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ اس (فیصلہ) کی طرف سے ایسے شک میں ہیں۔ جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے۔ اور بالیقین سب کے سب ایسی ہی ہیں۔ کہ آپ کا رب ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا حصہ دے گا۔ بالیقین وہ ان سب کے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے:۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ.

جس سے ظاہر و متبادر یہ ہے۔ کہ اس آیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تسلیہ مقصود ہے۔ گو تسلیہ صریح نہ ہو۔ مگر اس میں تسلیہ کا مضمون ضرور ہے۔ کیونکہ ایسا مضمون تسلیہ صریحہ میں بھی مذکور ہے۔ حق تعالیٰ کی عادت ہے۔ کہ کفار کی حالت بیان فرما کر حضور صلی اللہ علیہ

وسلم اور مسلمانوں کی تسلی اس طرح کرتے ہیں کہ سب کو اپنے اپنے کام میں لگنے کا حکم فرماتے ہیں۔ کہ تم اپنے کام میں لگے رہو۔ کفار کا معاملہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم نبٹ لیں گے۔ چنانچہ یہی مضمون یہاں بھی ہے۔ کہ اول کفار کا حال بیان فرمایا۔ کہ یہ لوگ پہلے انبیاء سے بھی اختلاف کر چکے ہیں۔ آپ کے ساتھ کفار کا اختلاف کوئی نئی بات نہیں اور ہم ان کو ابھی سزا دیتے۔ مگر ہماری طرف سے ایک بات ٹھہر چکی ہے۔ اس لئے دنیا میں فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ باقی وقت معلوم پر سب کو اپنے اپنے کئے کا بدلہ ملے گا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

فاستقم کما امرت. یعنی جب ان کی سزا کا معاملہ آپ سے کچھ سروکار نہیں رکھتا۔ تو آپ اور مسلمان کفار کی فکر میں نہ پڑیں۔ بلکہ ان کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑ کر آپ اور مسلمان اپنے کام میں لگے رہیں۔ جس کا آپ کو اور مسلمانوں کو حکم ہے۔

یہ حاصل ہے آیت کا بھلا اس سے یہ کہاں معلوم ہوا۔ کہ استقامت کوئی ایسی دشوار چیز ہے۔ جس کا آپ کو اور مسلمانوں کو خاص طور پر حکم دیا گیا ہے۔

بعض لوگوں کو حدیث **استقیموا ولن تحصوا** (سنن ابن ماجة: ۲۷۷) (مستقیم رہو اور اسے پورا شمار نہ کرو) سے شبہ ہوا ہے۔ جس کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مستقیم رہو۔ مگر تم سے احصا نہ ہو سکے گا۔ اور کہتے ہیں۔ کہ دیکھو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا کہ استقامت پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کا احصاد شوار ہے۔ مگر یہ مطلب بیان کرنے والا بعینہ اس کا مصداق ہے۔ کہ:

حفظت شیئا وغابت عنک اشیاء.

(ایک چیز تم نے یاد کر لی اور بہت سی چیزیں تم سے غائب رہیں)

صاحب! اگر **ولن تحصوا** کا متعلق وہی استقامت ہے۔ جس کا امر کیا گیا ہے۔ تو اس کا حاصل یہ ہوا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے کام کا حکم فرماتے ہیں۔ جو کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ تو **لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا** کے صریح خلاف ہے۔ کہ یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ استقامت حاصل کرو اور یہ بھی فرما رہے ہیں۔ کہ تم سے ہو نہ سکے گی۔ تو پھر جو کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا امر ہی کس واسطے کیا گیا۔ اس لئے یہ مطلب غلط ہے۔

میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ:

استقیموا ما استطعتم ولا تتعمقوافیها فانکم لن تحصوها ولا یشادالدین احدا لا غلبه.

یعنی جتنی استقامت تم سے ہو سکے حاصل کرو۔ یہ تو مامور بہ ہے۔ باقی اس میں تعمق و مبالغہ نہ کرو۔ کیوں کہ یہ مامور بہ نہیں اور تعمق و مبالغہ سے جس اعلیٰ درجہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ تم سے نہ ہو سکے گا اور یہ تو ان لوگوں کے خلاف ہے۔ کیوں کہ وہ استقامت کے اعلیٰ درجہ کو مامور بہ کہتے ہیں۔

اور اس تقریر سے معلوم ہوا۔ کہ وہ اعلیٰ درجہ جس میں تعمق و مبالغہ ہو مامور بہ نہیں ہے۔ باقی جو مطلب حدیث کا یہ لوگ سمجھے ہیں۔ وہ تو نص کے خلاف ہے۔ حق تعالیٰ نے وسعت سے زیادہ کہیں امر نہیں کیا اور ہر موقعہ پر جہاں اس قسم کا شبہ واقع ہوا۔ فوراً اشکال رفع کیا ہے۔ چنانچہ جب اتقوا اللّٰہ حق تقته (ترجمہ) اللہ سے ڈرو۔ جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنھم کو اشکال ہوا۔ کہ یہ کس سے ہو سکے گا اور ایسا تقویٰ جو حق الوہیت کے شایان ہو۔ کون کر سکتا ہے؟ تو اس پر فوراً یہ آیت نازل ہوئی۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا.

یعنی اللہ سے اتنا ڈرو جتنا تم سے ہو سکے۔

بعض صحابہ رضی اللہ عنھم نے اس کو پہلی آیت کے لئے ناسخ فرمایا ہے۔ مگر قاضی ثناء اللہ صاحب نے تصریح کی ہے اور خوب ہی فرمایا ہے۔ کہ نسخ اصطلاح سلف میں بیان تفسیر و بیان تبدیل دونوں کو عام ہے۔ پس بعض صحابہ رضی اللہ عنھم کا اس کو پہلی ہی آیت کے لئے ناسخ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت کی تفسیر ہوگئی اور بتلا دیا گیا کہ۔ کہ حق تقته سے مراد وہ تقوی ہے۔ جو تمہاری استطاعت میں ہو۔ جتنا تقویٰ تم سے ہو سکے۔ وہ حق تقاته میں داخل ہے۔ بحمد اللّٰہ اشکالات سب رفع ہو گئے اور معلوم ہو گیا۔ کہ یہاں جو فضائل اور بشارتیں استقامت پر متفرع ہیں۔ وہ ہر مسلمان کو حاصل ہوں گی۔ کیوں کہ استقامت کا ایک درجہ ہر مومن کو حاصل ہے۔

مگر اس پر اب شاید یہ اشکال ہو۔ کہ اگر اس آیت میں استقامت کے یہی معنی ہیں۔ کہ بس ایمان حاصل ہو اور ایمان کے بعد مرتد نہ ہو تو آگے اس استقامت کے بہت سے فضائل مذکور ہیں۔ کہ ان اہل استقامت پر رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ بشارت سناتے ہیں۔ خوف وحزن کو رفع کرتے ہیں۔ فرشتے ان کے رفیق ہوتے ہیں۔ اس میں صالح اور فاسق سب برابر ہو جائیں گے اور اگر فاسق کو بھی یہ فضائل حاصل ہو گئے تو اس کو اور کیا ضرورت رہی۔ بس ایک شخص اٰمنت باللّٰہ زبان سے اور دل سے کہہ لے اور اس پر جما رہے۔ پھر جو چاہے اعمال کرتا رہے۔ اس کے لئے رحمت بھی ہے۔ بشارت بھی ہے۔ فرشتوں کی رفاقت بھی ہے۔ حزن وخوف سے بے فکری بھی ہے۔

اس اشکال کا جواب میں ایک قاعدہ کلیہ سے دیتا ہوں۔ جو ہر مقام پر کارآمد ہے۔ کیونکہ یہ اشکال کچھ اسی آیت کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ بعض احادیث پر بھی واقع ہوتا ہے۔ جیسے من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ۔ (جس شخص نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا وہ جنت میں داخل ہوا) (المعجم الکبیر للطبرانی ۷:۵۵)

وہ قاعدہ کلیہ میں نے اپنے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے۔ کتابیں زیادہ دیکھنے کی مجھے عادت نہیں۔ اگر کسی کو وسعت نظر کا شوق ہو۔ ان کو یہ شوق مبارک ہو۔ ہمیں تو حق تعالیٰ نے اساتذہ ہی ایسے دیئے تھے۔ جنہوں نے بہت سی کتب سے مستغنی کر دیا۔ کیسا ہی اشکال ہو۔ ان کی چند باتوں سے جو یاد ہیں۔ رفع ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ کہ ”شارع نے جو اعمال کے فضائل بیان کئے ہیں۔ وہ گویا خواص اعمال ہیں اور خواص اشیاء کا ظہور عقلاً ارتفاع موانع سے مشروط ہوتا ہے۔“

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طبیب ادویات کی خاصیت بیان کرے، تو ہر عاقل اس کا یہ مطلب سمجھتا ہے۔ کہ اگر اس کے مخالف کوئی مضر چیز نہ کھائی جائے تو یہ نفع ظاہر ہوگا۔ پس اگر کوئی خمیرہ گاؤں زبان عنبری پر دو تولہ سنکھیا بھی کھالے اور مر جائے۔ تو اس سے خمیرہ کے خواص غلط نہ ہو جائیں گے۔ اسی طرح لا الہ الا اللہ دل سے کہنے اور اس پر مستقیم رہنے کی بھی خاصیت ہے۔ کہ اس سے ملائکہ رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ بشارت سنائی جاتی ہے۔

مگر شرط یہ ہے کہ اس کے منافی کوئی کام نہ کرے۔ مثلاً لا الہ الااللہ کے بعد ان اللہ ثالث ثلثۃ یا المسیح ابن اللہ (اللہ تین میں کا تیسرا یا حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں) وغیرہ نہ کہے۔ اگر کلمۂ ایمان کے بعد کلمہ کفر بھی کہہ دے گا تو اس کی وہی مثال ہوگی جیسے خمیرہ کے بعد سنکھیا کھالے۔

پھر منافی کی دوقسمیں ہیں۔ ایک وہ جو پورا منافی ہو۔ جیسے کلمہ ایمان کا مقابلہ کلمۂ کفر ہے۔ یہ تو مبطل خاصیت ہے۔ کہ لا الہ الا اللہ کی خاصیت کو بالکل باطل وزائل کر دے گا اور ایک وہ جو پورا منافی نہ ہو۔ بلکہ فی الجملہ منافی ہو۔ جیسے کفر کے علاوہ اور معاصی ہیں۔ ان سے کلمہ ایمان کی خاصیت باطل تو نہیں ہوتی۔ مگر کمزور ہو جاتی ہے۔ نفع دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے خمیرہ گاؤزبان کے ساتھ کھٹائی اور تیل اور گڑ اور سرکہ اور بینگن بھی کھائے جائیں۔ کہ ان اشیاء سے خمیرہ کی قوت کمزور ہو جائے گی اور نفع دیر میں ظاہر ہوگا۔

اس تقریر سے ایک اور شبہ کا جواب معلوم ہوگیا۔ وہ یہ کہ میں نے جو اوپر کہا تھا۔ کہ یہ فضائل خواص اعمال ہیں اور خواص کا ظہور رفع موانع کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ اس پر کسی کو یہ شبہ ہوسکتا ہے۔ کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے موانع اور مضرات کو بھی پیش کیا تھا۔ کہ یا رسول اللہ و ان زنی وان سرق۔ (یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر چہ وہ زنا کرے اور اگر چہ وہ چوری کرے)

مگر حضور صلی اللہ علیہ علیہ وسلم نے ان کو مضر نہیں مانا۔ یعنی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ جو کوئی لا الہ الا اللہ کا معتقد ہو کر مر جائے و ھو لا یشرک باللہ اس حال میں کہ وہ شرک نہ کرتا ہو۔ تو یہ شخص جنت میں جائے گا۔ اس پر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! چاہے اس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وان زنی وان سرق۔

ہاں اگر چہ اس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان خواص کا ظہور بدپرہیزی سے بچنے کے ساتھ مقید نہیں۔

تقریر گزشتہ سے یہ اشکال اس طرح حل ہوا۔ کہ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے جواب کا حاصل یہ ہے۔ کہ زنا وسرقہ **لا الہ الا اللّٰہ** کی خاصیت کے لئے مبطل نہیں۔
حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اس کو مبطل سمجھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی کر دی۔
رہا یہ کہ یہ اعمال کسی درجہ میں بھی **لا الہ الا اللّٰہ** کی خاصیت کے منافی اور مضر نہیں۔
یہ اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسرے نصوص سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زنا وسرقہ وغیرہ **لا الہ الا اللّٰہ** کی خاصیت کے لئے مضعف اور اس کے ظہور کے لئے موخر ہیں۔
یعنی ایسا شخص جنت میں تو ایمان کی برکت سے چلا جاوے گا۔ مگر دیر میں جائے گا۔ یا یہ کہا جائے۔ کہ ایمان کی خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے۔ مگر مفرد جب دوسرے اجزاء سے مرکب ہو جاتا ہے تو مرکب کا مزاج دوسرا ہو جاتا ہے۔ پس اگر ایمان اعمال صالحہ کے ساتھ مرکب ہوا تو اس وقت مجموعہ کا مزاج اور ہوگا۔ اس وقت ایمان کی خاصیت تیز اور قوی ہوگی کیوں کہ یہ اجزاء **لا الہ الا اللّٰہ** کے مناسب ہیں اور اگر اعمال سیئہ سے مرکب ہوا تو مجموعہ کا مزاج دوسرا ہوگا۔ یا یہ کہا جائے[1] کہ خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے۔ مگر عارض وموانع کی وجہ سے دیر ہو جائے گی۔ پس اب یہ دعویٰ محقق ہو گیا۔ کہ یہاں جس فضیلت اور استقامت کا ذکر ہے۔ وہ مطلق استقامت علی الایمان ہی کی فضیلت ہے۔ خواہ کسی درجہ کی ہو۔

فضائل استقامت

اب ان فضائل کو سنیئے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں :۔ **تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ.**
کہ ان پر رحمت وبشارت کے فرشتے اتریں گے۔ درمنثور میں زید بن اسلم سے مروی ہے۔ کہ نزول ملائکہ تین وقتوں میں ہوگا۔ اول تو مرتے ہوئے بشارت دیں گے۔ چنانچہ حدیث مرفوع میں بھی ہے۔ کہ مومن جب مرتا ہے۔ تو رحمت کے فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں:۔
اُخْرُجِیْ ایتها النفس المطمئنة الٰی روح و ریحان و رب غیر غضبان
ترجمہ:۔ اے نفس مطمئنہ نکل طرف راحت اور بہار کے اور طرف ایسے پروردگار کے جو ناراض وغضب ناک نہیں ہے۔ اس وقت مسلمان لقاء اللہ کا مشاق ہو جاتا ہے۔

---

[1] ان تینوں جوابوں میں جو فرق ہے۔ اہل علم اس کو تامل کے بعد سمجھ سکتے ہیں۔ اول صورت میں تو فعل ہی ضعیف ہو گیا۔ دوسری صورت میں فعل ضعیف نہیں ہوا۔ دوسرے جزو کے سبب اثر ضعیف ہو گیا۔ تیسری صورت میں اثر بھی ضعیف نہیں ہوا۔ ظہور موخر ہو گیا۔ ۱۲ منہ اشرف علی

اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ مسلمانوں کو تو مرتے ہوئے بہت کرب ہوتا ہے۔ یہ تو خوشی کے ساتھ جانے کی علامت نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک جسم، ایک روح، تو کرب نزع میں مومن کے جسم کو تو تکلیف ہوتی ہے۔ مگر روح کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ جس کی ہم کو خبر نہیں ہوئی۔ کیونکہ روح مبصر نہیں اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی معشوق عاشق کو بغل میں لے کر ایسا زور سے دبائے کہ اس کی آنکھیں نکل آئیں تو اس کے جسم کو تو کلفت ہے۔ مگر دل سے وہ اس حال میں شاداں و فرحاں ہوتا ہے اور ایسا خوش ہوتا ہے۔ کہ اگر محبوب یہ کہے کہ تم کو کلفت ہوتی ہے تو لاؤ تم کو چھوڑ کر رقیب کو دبانے لگوں۔ تو وہ یہ کہے گا۔ ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)

اور یوں کہے گا۔ ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے　　　یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

پس شدت نزع اس شخص کے عاصی ہونے کی علامت نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت نزع دیکھی ہے۔ اس وقت سے سہولت نزع کی تمنا نہیں رہی۔ کیونکہ پہلے تو یہ خیال تھا کہ سہولت نزع کوئی اچھی اور مطلوب شے ہے۔ مگر اب معلوم ہوا۔ کہ شدت بھی مذموم نہیں۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں ہوتی؟

دراصل شدت نزع کا مدار طاعت و معصیت پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کے سبب دو ہیں۔ ایک قوت جسم، دوسرے کثرت تعلقات۔ کیونکہ موت کے وقت روح طبی جسم سے جدا ہوتی ہے۔ اگر جسم قوی ہے تو روح کا طبی انفصال اس سے دقت کے ساتھ ہوگا۔ کیوں کہ وہ رگ رگ میں پیوستہ ہوتی ہے اور چونکہ روح مجرد کو بھی روح طبی کے واسطہ سے جسم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ تو اگر روح مجرم کو دنیا کی چیزوں کے ساتھ تعلق زیادہ ہوگا۔ تو اس تعلق کا منقطع ہونا اسے ناگوار ہوگا۔ اس لئے وہ جسم سے اپنا تعلق دیر میں قطع کرتی ہے۔ اس کے بعد سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم بھی قوی تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس کو اپنی

امت کے ساتھ تعلق بھی بہت تھا۔ وصال کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی طرف سے فکر تھی۔ اس لئے شدت ہوئی۔ جب حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کی طرف سے بے فکر دیا۔ اس وقت روح نے جسم سے تعلق منقطع کیا۔ اب اگر یہ تعلق محمود ہے تو شدت نزع محمود ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ میں ہوا اور اگر تعلق مذموم ہے تو شدت مذموم ہے اور اگر کسی کی روح کو اشیاء دنیا سے کچھ بھی تعلق نہ ہو تو نزع میں سہولت ہوگی۔ چاہے میت کافر ہی ہو۔ جیسے کوئی جوگی تعلقات واجبہ وغیر واجبہ سب کو قطع کردے۔ تو اس کو نزع میں سہولت ہوگی۔ گو یہ سہولت محمود نہیں۔

اسی طرح اگر کسی کا جسم بہت کمزور ہو۔ اس کو بھی نزع میں آسانی ہوگی اور یہ بھی کمال نہیں۔ چنانچہ مدقوق کا جسم بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کو نزع سہل ہوتا ہے۔ کہ پاس والوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ کہ روح کب نکل گئی، چاہے مدقوق مومن ہو یا کافر۔ بہرحال شدت نزع کو بشارت ملائکہ سے کچھ منافات نہیں۔ ہر مومن مرتے ہوئے فرشتوں کی بشارتیں سن کر خدا سے ملنے کا مشتاق ہو جاتا ہے۔ گو جسم سے جان نکلنے میں کلفت ہی کیوں نہ ہو۔

اس وقت اس کی وہ حالت ہوگی جیسے کسی شخص کو اس کا محبوب کھڑکی میں نکلنے کو کہے کہ اس ایک تنگ کھڑکی میں سے نکل کر ہمارے پاس آؤ۔ تو اس وقت وہ پینترے بدل کر اور دب جھک کر جانے کی کوشش کرے گا۔ گو اس حالت میں اس کے جسم پر خراش آ جائے۔ مگر اندر سے اس کا دل وصال محبوب کا خیال کر کے خوش ہوگا۔ بلکہ اس تکلیف پر بھی وہ خوش ہوگا۔ کیونکہ محبوب اس کے سامنے ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ محبوب میری اس مشقت کو دیکھ رہا ہے۔ کہ میں کس مصیبت سے اس کے پاس جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس وقت وہ زبان حال سے یوں کہتا ہوا جائے گا۔

بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست ۔۔۔ تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

(تیرے عشق کے جرم میں قتل کرتے ہیں اور غوغائی اب تو بھی بر سر بام آ کہ عجب تماشا ہے)

واقعی محبوب کے حکم کی تعمیل میں یا اس کی محبت میں نگاہوں کے سامنے جتنی بھی تکلیف ہو۔ سب آسان ہو جاتی ہے۔

اسی لئے حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مراقبہ تعلیم فرمایا۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا.

اپنے رب کے حکم کیلئے (تکالیف پر) صبر کیجئے۔ کیونکہ آپ ہمارے سامنے ہیں ہم آپ کی سب حالت دیکھ رہے ہیں۔ یہاں فانک باعیننا بڑھا کر صبر کو آسان کر دیا۔

ایک عاشق کو کسی شخص کے ساتھ محبت کے جرم میں لوگوں نے بہت مارا۔ ننانوے کوڑوں پر تو اس نے ایک بھی آہ نہ کی۔ سوویں کوڑے پر اس کے منہ سے آہ نکلی۔ کسی نے پوچھا کہ کہ تونے ننانوے کوڑوں پر تو آہ نہ کی۔ اخیر میں ایک کوڑے پر آہ کی۔ کہ اس کی کیا وجہ تھی۔ کہا ننانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا۔ میرا حال دیکھ رہا تھا۔ اس لئے مجھے کلفت کا احساس نہ ہوا بلکہ اس میں مزہ آرہا تھا۔ کہ محبوب دیکھ رہا ہے۔ کہ اس کی محبت میں میرا کیا حال ہے۔ اخیر کوڑے پر وہ چلا گیا۔ اس لئے کلفت کا احساس ہوا۔

صاحبو! یہ تو اس کا محبوب تھا۔ جس کی نگاہ سے عاشق غائب ہوگیا اور ہمارا محبوب ایسا ہے کہ کسی وقت کوئی چیز اس سے غائب نہیں ہے۔ ہمارے ہر حال کو دیکھ رہا ہے۔ پھر فانک باعیننا (آپ ہمارے سامنے ہیں) جس کے پیش نظر ہو۔ اس کو مصائب میں کیوں کلفت ہو۔ بہر حال شدت نزع کا شبہ رفع ہوگیا۔ غرض ایک تو یہ وقت ہے نزول ملائکہ کا۔ جب کہ مومن مرتا ہے اور روح نکلنے کے بعد کی کیفیت حدیث میں آتی ہے۔

حتی انه لینادله بعضهم بعضا.

یعنی فرشتے اس روح کو ایک دوسرے کو دیتے ہوئے لے چلتے ہیں۔ ہر ایک چاہتا ہے۔ کہ میں لے کر جاؤں۔ دوسرا چاہتا ہے۔ کہ میں لے کر جاؤں۔

دوسرا وقت اس کا قبر میں ہوتا ہے۔ کہ فرشتے آتے ہیں اور مردہ سے سوالات کرتے ہیں:

من ربک ما دینک و من هذا الرجل.

تیرا پروردگار کون ہے۔ تیرا دین کیا ہے اور یہ شخص کون ہیں۔ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) مومن تو جواب ٹھیک ہی دے گا پھر اس کو فرشتے بشارت دیں گے۔

نم کنومة العروس. (لم أجد الحدیث فی "موسوعة أطراف الحدیث النبوی الشریف") تیسرا وقت حشر کا ہے۔ کہ اس وقت فرشتے آئیں گے اور قبر سے مومن کا استقبال

کرینگے اوراس کو بشارتیں سنائیں گے اور تعظیم وتکریم کے ساتھ میدان حشر میں لے جائینگے۔

شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ پھر اس بشارت کے بعد میدان حشر میں مسلمانوں کو پریشانی اور خوف کیوں ہوگا۔ جیسا کہ ظاہر احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ احادیث عام نہیں۔ خود حدیث میں آتا ہے کہ مومن کو قیامت کا دن نماز کے وقت کے برابر معلوم ہوگا اسی کے مناسب میں نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے سنا ہے فرماتے تھے۔

عاشقاں را با قیامت روز محشر کار نیست　　　عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

(عاشقوں کو محشر کے دن میں کام نہیں ہے، عاشقوں کے لئے سوائے محبوب کے جمال کے تماشے کے اور کچھ مطلب نہیں ہے)

عشاق کو تو قیامت کا پچاس ہزار برس کا دن اتنا معلوم ہوگا جتنی نماز میں دیر لگتی ہے اور نماز بھی جلدی کی۔ جیسا کہ ہم پڑھا کرتے ہیں اور اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسی نماز ہوئی۔ تو خیر ذرا کچھ زیادہ وقت لگ جائے گا۔ اگر یہ کہو کہ ہم کو تو شبہ ہو گیا۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نماز کے برابر دیر لگی۔ تو وہ تو بڑی لمبی لمبی نماز پڑھتے تھے۔ تو ارے بھائی ان کے دل سے پوچھو۔ کہ ان کو وہ گھڑیاں کیسی قلیل معلوم ہوتی تھیں۔ اسی طرح موقف کا وقت بھی قصیر ہی معلوم ہوگا۔

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی حالت یہ تھی کہ جب رات آتی تو فرماتے:۔

ھٰذہٖ لیلۃ القیام. یہ کھڑے ہونے کی رات ہے۔ پھر رات بھر نماز میں کھڑے رہتے۔ صبح کے قریب رکوع وسجدہ کرکے نماز پوری کر لیتے۔ اگلا دن ہوتا۔ تو فرماتے:

ھٰذہٖ لیلۃ الرّکوع . یہ رکوع کی رات ہے اور پھر رات بھر رکوع میں رہتے کسی دن کہتے **ھٰذہ لیلۃ السجود** یہ سجدہ کی رات ہے پھر رات بھر سجدہ میں رہتے اور صبح کے قریب فرماتے کہ رات بہت جلدی گزر گئی۔ ارمان پورا نہ ہوا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی وہ دیر کچھ دیر نہ معلوم ہوتی تھی۔ تو بھائی تم نے نماز تو لی ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اور وجدان لیا اپنا۔ یہ غلطی ہے۔ اگر ان جیسی نماز کے برابر بھی دیر ہوئی۔ تو وہ بھی تم کو کچھ دیر نہ معلوم ہوگی۔ بہرحال خواہ تمہاری نماز کے برابر دیر ہو یا اہل

خشوع کی نماز کے برابر۔ مومن بہت جلد چھوٹ جائے گا۔ اس کو زیادہ طول محسوس نہ ہوگا۔ خصوصاً اگر کوئی ایسا عاشق ہوا۔ جس کا کچھ سلسلہ بھی نہ ہو۔ وہ تو وہاں بہت ہی بے فکر ہوگا۔ جیسے احمد فرماتے ہیں۔ **یغبطھم الا نبیاء والمرسلون۔**

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(احمد عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام، عاشق ہو جا سلسلہ ہوا، نہ ہوا، نہ ہوا)

اکرام اہل استقامت

یہ عشاق قیامت میں نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے۔ ان کو کچھ فکر نہ ہوگا۔ حدیث میں ہے:۔
کہ ان کی اس حالت پر انبیاء علیہم السلام بھی غبطہ کریں گے۔ کیوں کہ انبیاء کی پیشی ہوگی۔ ان سے سوال و جواب ہوگا۔ مگر یہ سب امت ہی کے متعلق ہوگا۔ خود ان کی ذات کے متعلق حساب و کتاب ان سے کچھ نہ ہوگا اور اپنی ذات کے لئے انبیاء کو کچھ تشویش نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ تو معصوم ہیں۔ ہاں انبیاء کو امت کی فکر ہوگی۔ اس لئے ان بے فکروں پر غبطہ کریں گے۔ کہ یہ بڑی چین میں ہیں۔ ان کو کسی کی بھی فکر نہیں۔

مگر اس سے ان اولیاء کی فضیلت انبیاء پر لازم نہیں آتی۔ کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے حاکم ضلع جس وقت اپنے ماتحت حکام کے عملہ کا معائنہ کرتا ہے۔ تو اس وقت حاکم کو اور عملہ والوں کو فکر ہوتی ہے۔ عملہ والوں کو اپنے اپنے کام کی اور حاکم کو اپنے عملہ کی۔ کہ کہیں ان پر کوئی جرم قائم نہ ہو جائے۔ اس وقت حاکم کے اردلی اور سائیں کو کچھ فکر نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے سپرد عملہ کا کام ہی کچھ نہیں۔ اس وقت حاکم عملہ کو اپنے اردلی کی بے فکری پر رشک ہوسکتا ہے۔ کہ یہ بہت بے فکر ہے۔ مگر معائنہ کے بعد حاکم حاکم ہے اور اردلی اردلی ہے۔ اسی طرح بعد فیصلہ کے انبیاء جب جنت میں جائیں گے۔ تو ان کے مراتب سب سے اعلیٰ ہوں گے۔ اس وقت یہ اولیاء ان پر رشک کریں گے۔ غرض حشر میں بھی نزول ملائکہ ہوگا اور ان کی بشارت سے خوف و حزن کچھ نہ ہوگا۔

اور تتنزل کا صیغہ بتلا رہا ہے۔ کہ یہ نزول بتدریج یکے بعد دیگرے ہوگا۔ تا کہ زیادت۔ مسرت و انشراح اور زیادت اکرام کا سبب ہو۔ جیسے ایک شخص مہمان بن کر بادشاہ کے یہاں

جائے تو اول اسٹیشن پر اس کا استقبال کرنے ایک جماعت آئے اور بشارت دے کہ بادشاہ آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر چل کر ایک اور جماعت آئے اور خوشخبری و مبارک باد سنائے۔ کچھ دیر کے بعد تیسری جماعت آئے اور وہ بھی مبارک باد اور خوشخبری سنائے۔ تو اس میں زیادہ مسرت و اکرام ہے۔ دفعۃً ہجوم سے تو مہمان بعض دفعہ گھبرا جاتا ہے۔ اس لئے وہاں ملائکہ کا نزول تدریجاً یکے بعد دیگرے ہوگا۔ پھر وہ سب کے سب یہ بشارت دیں گے۔

لَاتَخَافُوْا وَلَاتَحْزَنُوْا.

کہ آفاتِ قیامت سے تم اندیشہ نہ کرو اور دنیا کے چھوٹنے کا رنج نہ کرو۔ کیونکہ آگے تمہارے لئے امن و راحت اور نعم البدل ہے۔

وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ.

تم جنت کے ملنے پر خوش رہو۔ جس کا (پیغمبر کی معرفت) تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا اور دنیا کو جنت سے کچھ بھی نسبت نہیں۔ تو اب دنیا کے چھوٹنے کا کیا رنج۔

حقیقتِ دنیا

یہ تو ایسا ہوا۔ جیسا کسی کو اشرفی مل جائے اور پیسہ بلکہ کوڑی کھو جائے تو اس سے کچھ بھی رنج نہ ہوگا۔ بلکہ تمنا کرے گا کہ ایسا پیسہ تو ہر روز کھو جایا کرے۔ جس کے بدلہ میں اشرفی مل جائے۔ یہی تو وجہ ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

الدنیا ملعونۃ وما فیھا ملعون الا ذکر اللّٰہ وما والاہ او عالم او متعلم. (سنن ابن ماجۃ: ۴۱۱۲، کنز العمال: ۶۰۸۳)

(دنیا اور مافیہا ملعون ہے بجز ذکر اللہ اور جو چیز اس کی مددگار ہو یا عالم یا متعلم کے)

کیونکہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے پاخانہ ہو۔ چنانچہ خواب میں اکثر دنیا کی یہی صورت دیکھی جاتی ہے۔ کانپور میں ایک طالب علم صاحب تھے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا۔ کہ حق تعالیٰ شانہ عرش پر جلوہ افروز ہیں اور سب آدمیوں کا امتحان لے رہے ہیں۔

ایک شخص پر سخت عتاب ہوا۔ یہ خواب دیکھنے والے کانپ اٹھے۔ وہاں عرش کے ایک گوشہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی رونق افروز ہیں۔ یہ عتاب کی حالت دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرنے لگے۔ کہ یا رسول اللہ! آپ کچھ مدد فرمایئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم امتحان کے وقت یوں کہہ دینا۔ کہ میں تو کچھ علم نہیں رکھتا۔ اسی اثناء میں ان کو بھی امتحان کے لئے پکارا گیا اور فرمایا۔ کہ لاؤ جلالین۔ اس نے عرض کیا۔ کہ یا اللہ میں تو جاہل ہوں۔ میں تو جلالین پڑھا ہوا بھی نہیں۔ اس پر تبسم فرمایا اور حکم ہوا۔ اچھا تمہارے لئے ایک دن کی قید ہے۔ اس حکم کے بعد اس کو ایک کوٹھڑی میں لے گئے جو پاخانہ سے بھری ہوئی تھی اور وہاں قید کر دیا۔ اس خواب کی تعبیر بھی سمجھی گئی۔ وہ کوٹھڑی دنیا کی صورت مثالی ہے۔ ان کو دکھلا دیا گیا۔ کہ جس دنیا میں تم منہمک ہو وہ یہ ہے۔ پھر دیکھا کہ اس کوٹھڑی سے نجات ہوئی اور اس کو ایک نہر میں غسل دیا گیا اور پاک صاف کر دیا گیا۔ اس کی تعبیر الحیات سمجھی گئی۔

اسی طرح ایک شخص کی حکایت ہے۔ کہ وہ روز بستر ہ پر پیشاب کر لیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی نے کہا کہ کمبخت تو جوان ہو کر بستر ہ پر پیشاب کرتا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی۔ کہا کیا بتلاؤں۔ خواب میں ہر روز شیطان آتا ہے کہ آؤ تم کو سیر کرالاؤں۔ میں اس کے ساتھ چل کھڑا ہوتا ہوں۔ چلتے چلتے پیشاب لگ جاتا ہے۔ اس وقت میرے سامنے ایک پاخانہ نظر آتا ہے۔ میں اپنے نزدیک تو اس کے قدمچہ پر بیٹھ کر پیشاب کرتا ہوں۔ مگر وہ صبح کو بستر ملتا ہے۔ پیشاب کرتا کہیں ہوں اور نکلتا کہیں ہے۔ وہی مثال ہوگئی۔ ؎

جو تھے مژگان پرخون سب وہ خار دلنشیں نکلے
جنوں یہ کیسے نیشتر کہیں ڈوبے کہیں نکلے

مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ نے اس شعر کو ایک عجیب موقع پر لکھا ہے۔ بعض فرق باطلہ کا مذہب ہے۔ کہ استدبار بالمرأۃ (دبر سے وطی کرنے) سے بھی غسل قرار پا جاتا ہے۔ مولانا نے اس پر لکھا ہے۔ کہ واقعی کیوں نہ ہو اس کی وہی مثال ہے۔ ؎

جو تھے مژگان پرخون سب وہ خار دلنشیں نکلے
جنوں یہ کیسے نیشتر کہیں ڈوبے کہیں نکلے

یہ تو بیچ میں ایک لطیفہ تھا۔ تو اس شخص کی بیوی نے کہا۔ کہ اب کے شیطان خواب میں آئے تو اس سے کہنا کہ یار تم ہمارے دوست ہو گئے ہو۔ کچھ ہمارے ساتھ ہمدردی کرو۔ کہ ہم تنگدست غریب آدمی ہیں۔ کہیں سے بہت سا مال ہم کو دلوا دو۔

مرد نے کہا ضرور آج رات کو کہوں گا۔ رات ہوئی اور خواب میں حسب معمول شیطان آیا اور اس نے بیوی کا پیغام اس سے بیان کیا، شیطان نے کہا۔ کہ مال تمہارے واسطے بہت اور جتنا چاہو لے لو۔ شیطان ایک خزانہ پر اسے لے گیا اور بہت سا مال اس کی کمر پر لادا اور اتنا لادا کہ اس کے زور سے پاخانہ نکل گیا۔ اب جو صبح کو اٹھے ہیں تو مال تو غائب۔ مگر بستر پر پیشاب کے ساتھ پاخانہ بھی موجود ہے۔

بیوی نے کہا یہ کیا۔ اس نے سارا قصہ بیان کیا۔ بیوی نے کہا۔ بس جی میں مال سے باز آئی۔ تم پیشاب ہی کر لیا کرو۔ یہ پاخانہ کی مصیبت کون جھیلے تو یہ حقیقت ہے دنیا کی کہ پاخانہ یعنی وبال تو رہ جائے گا اور حظوظ غائب۔ جب دنیا کی یہ حقیقت ہے۔ تو پھر جنت میں پہنچ کر اس کے چھوٹنے کا کیا رنج۔ وہاں تو کسی قسم کی بھی کلفت نہ ہوگی۔ راحت ہی راحت ہے۔ اس کے بعد فرشتے کہیں گے۔

نَحْنُ اَوْلِيَآءُ كُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ.

کہ ہم تمہارے رفیق تھے۔ دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رفیق رہیں گے۔ یہاں بھی تمہارا ساتھ ہر قدم پر دیں گے۔ دنیا میں فرشتوں کی رفاقت دو طرح ہوتی ہے۔ ایک تو وہ اعمال صالحہ انسان کے دل میں القاء کرتے ہیں۔ دوسرے مصائب کے وقت سکینہ واطمینان نازل کرتے ہیں۔ چنانچہ صبر کے وقت کلفت ضبط کے علاوہ قلب میں ایک قوت اور چین بھی ہوتی ہے۔ یہ اسی سکینہ کا اثر ہے۔ جہاد میں بھی ملائکہ سکینہ نازل کرتے ہیں۔ چنانچہ نص میں ہے۔ کہ بدر میں ملائکہ نازل ہوئے اور ان کا کام یہ تھا۔

فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا.

کہ مسلمانوں کے قلوب کو قوت دین اور لڑائی میں ان کو ثابت قدم بنائیں۔ گو قتال بھی ملائکہ سے ثابت ہے۔ مگر اصل کام ان کا وہی تثبیت اور انزال سکینہ تھا۔ تیسری رفاقت یہ ہے۔

کہ ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ نص میں ہے:۔

لَهٗ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ. وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءً. فَلَا مَرَدَّ لَهٗ (ہر شخص کے لئے کچھ فرشتے ہیں جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے، کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے بحکم خدا حفاظت کرتے رہتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ اس قوم پر مصیبت ڈالنا تجویز کرتے ہیں تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں رہتی)

انسان کے دشمن سانپ بچھو تو ہیں ہی۔ اس کے دشمن جنات بھی ہیں اور فرشتے جنات سے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر یہ حفاظت نہ ہو تو جنات اس کی بوٹی بوٹی الگ کردیں۔ ہاں جب حق تعالیٰ ہی کوئی مصیبت بھیجنا چاہیں۔ تب وہ نہیں ٹل سکتی۔ اس وقت اس حفاظت کی صورت بدل دی جاتی ہے اور جنات یا حیوانات سے اس کو تکلیف پہنچ جاتی ہے اور آخرت کی ایک رفاقت تو اوپر معلوم ہو چکی۔ کہ مرتے ہوئے اور قبر میں حشر میں گھر سے نکلتے ہوئے بشارتیں سنائیں گے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک اور موقع پر بھی فرشتے حاضر ہوں گے۔ یعنی جنت میں۔

يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ۔ ہر دروازہ سے مسلمانوں کے پاس سلام کرنے اور مبارک باد دینے آئیں گے۔

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ.

آگے ارشاد ہے:۔

وَلَكُمْ فِيْهَا مَاتَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ. (تمہارے لئے جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا نیز تمہارے لئے جو مانگو گے موجود ہے)

یعنی جنت کو عیش محدود نہ سمجھنا۔ اس کی یہ حالت ہوگی۔ کہ جس چیز کو بھی تمہارا جی چاہے گا اس میں موجود ہے اور جو مانگو گے۔ تمہارے لئے وہاں موجود ہے۔

اس پر ایک طالب علمانہ شبہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ. کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ مانگنا تو چاہنے کی فرع ہے۔ جب وہاں ہر مشتہی موجود ہے۔ تو اس سے ہر مدعی کا ہونا خود لازم آگیا۔ پھر اگر کسی وجہ سے اس کو

بیان کیا گیا تھا۔ تو با قاعدہ بلاغت ابلغ کو مؤخر کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ ترقی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ہوا کرتی ہے۔ نہ کہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف۔ اور یہاں اعلیٰ کو مقدم کیا گیا ہے۔ یعنی ما تشتھی انفسکم (تمہارے لئے اس میں جس کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مشتہی اور مدعی میں تو یہ بیان کرنا مقصود ہے۔ کہ منہ سے مانگی اور دل کی چاہی مرادیں وہاں سب برابر ہیں۔ جیسے منہ مانگی مراد فوراً پوری ہوگی۔ ایسے ہی دل کی چاہی مراد بھی فوراً پوری ہوگی۔ روایات میں ہے۔ کہ جنتی کا دل کسی پھل کو دیکھ کر رغبت کرے گا۔ تو فوراً وہ پھل ٹوٹ کر سامنے آ جائے گا اور اس کی جگہ فوراً ہی دوسرا پھل درخت پر پیدا ہو جائے گا۔ اس تسویہ کو بیان کرنے کے لئے دونوں کا ذکر ضروری تھا۔ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْ اَنْفُسُكُم (تمہارے لئے اس میں جس کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے) کی تقویم بھی اسی لئے ہے۔ کہ اعلیٰ کو ادنیٰ کے برابر کرنے میں زیادہ مبالغہ ہے۔ مثلاً کہا کرتے ہیں۔ کہ ہمارے یہاں اشرفی اور پیسہ برابر ہے۔ اس صورت میں ابلغ و اعلیٰ ہی کو مقدم کرتے ہیں۔ ایسے ہی یہاں اعلیٰ کو ادنیٰ کے برابر کرنا مقصود ہے۔ کہ مشتہی جنت میں مثل مدعی کے ہے۔ ادنیٰ کو اعلیٰ کے برابر کرنا مقصود نہیں۔ کیوں کہ یہ مراد کے خلاف ہے۔ اب اشکال رفع ہوگیا۔

آگے فرماتے ہیں۔ نزلاً کہ یہ سب کچھ بطور مہمانی کے ہوگا۔ بھک منگوں کی طرح کھانا وغیرہ نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ عزت وقدر دانی کے ساتھ معاملہ ہوگا۔ اب جب ہر طرح سے اطمینان دلا دیا گیا۔ تو قاعدہ ہے کہ اطمینان کے بعد وہم شروع ہوا کرتا ہے اور دور دور کی سوجھا کرتی ہے۔ اب جنتیوں کو یہ خیال ہوگا۔ کہ میاں ہم تو اس قابل نہ تھے۔ نہ ہمارے اعمال اس لائق تھے۔ ہم نے تو بعضے بڑے بڑے گناہ بھی کئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مہمانی تھوڑی دیر کیلئے ہو۔ پھر معاصی پر گرفت ہونے لگے۔ اس لئے فرماتے ہیں:۔

مِنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ. (بخشنے والے بے حد مہربان کی طرف سے) کہ گو تم اس قابل نہ تھے۔ مگر حق تعالیٰ بخشنے والے ہیں۔ انہوں نے تمہارے عیوب ونقائص کو معاف فرما کر یہ انعام کیا ہے۔ کیونکہ وہ بخشنے ہی پر اکتفاء نہیں کرتے۔ بلکہ جرم کو معاف فرما کر عنایت ورحمت بھی فرماتے ہیں۔ وہ جس مجرم کو معافی دیتے ہیں۔ اس پر انعام بھی فرماتے ہیں۔ خلعت و

زادِ راہ بھی عنایت کرتے ہیں یہاں تک تو استقامت کے ثمرات کا ذکر تھا۔

طریق تکمیل استقامت

اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ کہ یہ سب مطلق استقامت کا نتیجہ ہے اور وہ عام ہے۔ خواہ استقامت بدرجہ اعلیٰ ہو یا بدرجہ ادنیٰ۔ یعنی خلاصہ یہ ہے۔ کہ نتائج نفس ایمان کے ہیں۔ مگر استقامت و ایمان اگر ادنیٰ ہے تو یہ ثمرات گو حاصل سب کے سب ہوں گے۔ مگر درجہ ادنیٰ میں حاصل ہوں گے اور اگر استقامت اعلیٰ ہے۔ تو یہ ثمرات اعلیٰ درجہ میں حاصل ہوں گے۔ اس لئے آگے اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کی ترغیب کے لئے تکمیل استقامت اور تقویت ایمان کا طریقہ اس طرز سے بتلاتے ہیں:۔ چنانچہ ارشاد ہے

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآاِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے۔ جو بلا دے طرف اللہ کے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ اس میں تکمیل ایمان کے لئے تین اجزاء مذکور ہیں۔ ایک دعوت الی اللہ کہ دوسروں کو بھی اللہ کی طرف بلائے۔ امر بالمعروف کرے۔ یعنی لوگوں کو اسلام کی دعوت دے اور مسلمانوں کو طاعات کی ترغیب دلائے۔ دوسرے یہ کہ خود بھی اعمال صالحہ اختیار کرے۔ محض نفس ایمان پر اکتفا نہ کرے۔ تیسرے یہ کہ یوں کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

اس تیسرے جملہ پر بظاہر یہ اشکال ہوگا۔ کہ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا (اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے) کے بعد اس کی کیا ضرورت رہی۔ کیوں کہ دعوت الی اللہ اور عمل صالح بدوں اسلام کے ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلام تو اس کے لئے پہلی شرح ہے۔ پھر جو شخص اللہ کی طرف بلائے گا وہ خود بھی ضرور مسلمان ہوگا۔ اس سے خود اس کا مسلمان ہونا مفہوم ہو گیا۔ نیز اس سے پہلے بھی جو فضائل نفس ایمان کے مذکور ہیں۔ وہ بھی اسلام کو مقتضی ہیں۔ بدوں اسلام کے نہ جنت مل سکتی ہے۔ نہ بشارتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ تو اب وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (اور کہے کہ بے شک میں فرمانبرداروں میں سے ہوں) کو اخیر میں کیوں بیان کیا

گیا؟ اس کو تو تکمیل استقامت میں دخل نہیں۔ بلکہ نفس استقامت ہی اس پر موقوف ہے۔
جواب یہ ہے۔ کہ اسلام من حیث ہوالاسلام کا قبول کرنا مراد نہیں۔ کیوں کہ واقعی یہ تو پہلے کلام سے مفہوم ہو چکا ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے۔ کہ ان کو اپنے اسلام کے ظاہر کرنے سے عار نہیں آتا۔ بلکہ فخر کے طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ بات نفس اسلام سے زائد ہے۔ یہ اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ جس کا اسلام کامل ہو۔ لہٰذا اس کو تکمیل اسلام میں دخل ہوا۔ کیونکہ بعض لوگ مسلمان تو ہوتے ہیں مگر ان کو کفار کے سامنے اظہار اسلام سے عار آتا ہے۔
چنانچہ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا۔ کہ ریل میں ایک بار نماز کا وقت آ گیا تھا۔ مگر میں نے وہاں اس لئے نماز نہیں پڑھی۔ کہ ہندوؤں کے سامنے الٹا سیدھا ہونے سے اسلام کی تحقیر ہوتی۔ کہ یہ لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے کہ اسلام میں یہ کیسی تعلیم ہے۔ یہ شیطان کی تلبیس تھی کہ اس نے اس ترکیب سے ترک نماز کو اس کے ذہن میں آراستہ کر دیا ورنہ دراصل اس کو مخالفین کے سامنے عبادت کرنے سے استنکاف تھا۔ جیسا کہ بعض لوگوں کو بھرے مجمع میں یہ بات ظاہر کرنے سے عار آتی ہے کہ ہم فلاں کے شاگرد ہیں اور وہ ہمارا استاد ہے اور اگر کسی کو اس سے بھی عار نہ آئے تو اپنے معتقدین کے سامنے استاد کی خدمت سے تو ضرور عار آتا ہے۔
ایک جنٹلمین مولوی کا قصہ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ کہ ایک دفعہ انہوں نے ایک جلسہ میں تقریر کی۔ مولوی فاروق صاحب چڑیا کوٹی بھی جو ان کے استاد تھے۔ جلسہ میں موجود تھے۔ جب وہ مولوی صاحب تقریر کر چکے۔ تو مولوی فاروق صاحب نے ان کو پکارا۔ کہ ارے فلانے! ذرا میرے پیر دبانا۔ اس وقت مولوی صاحب نے پیر تو دبائے مگر ان کے چہرہ سے ناگواری ظاہر ہوتی تھی۔ تو گو ان کو مولوی فاروق صاحب کی شاگردی سے انکار نہ تھا۔ مگر اس کے اظہار سے استنکاف تھا۔ اسی طرح بعضوں کو اپنے اسلام کے اظہار سے عار آتا ہے۔
اور اس کی فرع یہ بھی ہے کہ جن مسائل اسلامی پر ملاحدہ اعتراض کرتے ہیں۔ بعض مسلمان ان مسائل کے اظہار سے عار کرتے ہیں اور ان میں تاویل و تحریف کر کے اس طرح بیان کرتے ہیں۔ کہ مخالفین پر ان مسائل کی اصلی حقیقت ظاہر نہ ہو۔ جیسے غلامی کا مسئلہ اور معراج کا قصہ۔ بعضے تو ان کا صراحۃً انکار ہی کر دیتے ہیں۔ کہ اسلام میں یہ مسائل ہیں ہی نہیں۔ جیسے

ایک لطیفہ سنا ہے۔ کہ ایک مولوی صاحب سے کسی نے سرین کی عربی پوچھی ان کو معلوم نہ تھی۔ کہتے ہیں عرب میں سرین نہیں ہوتے۔ اس لئے اس کی کچھ عربی نہیں اور بعضے صراحۃً انکار نہیں کرتے۔ لیکن اصلی صورت پر ان کو ظاہر بھی نہیں کرتے۔ اس لئے فرماتے ہیں:۔

وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ. (اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں) یعنی بندگی کے اظہار کو فخر سمجھے۔ کہ ہم حق تعالیٰ کے ایسے تابعدار ہیں۔ کہ سب احکام کو بلا چون و چرا مانتے ہیں۔ چاہے وہ عقل میں آئیں یا نہ آئیں اب اشکال رفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا۔ کہ اس قول کو تکمیل استقامت میں بڑا دخل ہے۔

پس فرماتے ہیں۔ کہ تم نے مطلق استقامت کے فضائل تو سن لئے۔ اب اس کے بڑھانے میں کوشش کرو۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ امر بالمعروف کرو۔ دوسروں کو اسلام کی طرف بلاؤ اور خود بھی اعمال صالحہ بجالاؤ اور اپنے اسلام کو فخر کے طور پر دل کھول کر ظاہر کرو۔ جس کو یہ باتیں حاصل ہو جائیں۔ اس سے اچھی کسی کی بات نہیں۔

دستورِ دعوت

آگے اسی کے متعلق ایک بات فرماتے ہیں۔ جو اسی آیت کے لئے کالجزو ہے۔ مستقل مضمون نہیں۔ وہ یہ کہ اوپر دعوت الی اللہ کا امر تھا اور دعوت الی اللہ میں بعض دفعہ کفار یا فجار ایذاء پہنچاتے ہیں۔ اس کے متعلق ایک دستور العمل تعلیم فرماتے ہیں۔ اور تعلیم تو اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نیک برتاؤ سے ٹال دیا کیجئے) سے شروع ہوگی۔ مگر اس سے پہلے مقدمہ کے طور پر ایک قاعدہ کلیہ بیان فرماتے ہیں۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ.

یعنی یہ قاعدہ یاد رکھو کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوتی۔ اس سے یہ بھی سمجھ لو کہ اچھا برتاؤ اور برا تاؤ برابر نہیں ہوتا۔ پس تم کو دعوت میں عمدہ برتاؤ اختیار کرنا چاہیے۔ وہ کیا ہے؟

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ.

یعنی مخالفت کے برے برتاؤ کو اپنے اچھے برتاؤ سے دفع کرو۔ بدی کا علاج بھلائی سے کرو۔ اگر وہ سختی کریں تو تم نرمی کرو۔ ان کے ساتھ خشونت سے پیش نہ آؤ۔

آگے اس کا ایک دنیوی فائدہ بتلاتے ہیں۔

فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ.

یعنی پھر دیکھ لینا۔ کہ تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی۔ وہ ایسا ہو جائے گا۔ جیسا کوئی دوست ہوتا ہے۔ کانہ ولی حمیم میں لفظ تشبیہ سے اس طرف لطیف اشارہ ہے۔ کہ بعض لوگ تو نرمی کرنے سے بالکل ہی دوست ہو جاتے ہیں اور بعض اگر دوست نہیں ہوتے۔ لیکن ان کی عداوت ضرور گھٹ جاتی ہے اور شر میں تقلیل ہو جاتی ہے اور اس امر میں وہ دوست کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ گو ولی دوست نہ ہو۔ مگر اس میں ایک شرط ہے۔ جس کو میں بھول گیا تھا۔ اپنی تفسیر کو دیکھا۔ تو اس میں تمام پر سلامت جس کی قید بڑھائی ہے۔ یعنی یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثریہ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اگر مخاطب کی طبیعت میں سلامتی ہوئی۔ تو اس برتاؤ کا یہ اثر ضرور ظاہر ہوگا اور یہ قید دلیل عقلی سے پائی گئی ہے۔ پس اب یہ اشکال نہ رہا۔ کہ بعض دفعہ ہم دشمن سے کتنی ہی نرمی کرتے ہیں۔ مگر عداوت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ جواب ظاہر ہے کہ وہ شخص کج طبع ہے۔ اس لئے اثر نہیں ہوا۔ سلیم الطبع ہوتا۔ تو ضرور جھک جاتا۔

آگے فرماتے ہیں۔ کہ بدی کا بدلہ بھلائی سے کرنا ہر ایک کو آسان نہیں بلکہ یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے۔ جو بڑا مستقل مزاج اور صاحب نصیب ہے۔ یعنی جو اخلاقی اعتبار سے مستقل اور ثواب آخرت کے اعتبار سے صاحب نصیب ہے۔ اس میں اس کے معاملہ کا طریقہ بتلا دیا۔ کہ اپنے اندر استقلال کا مادہ پیدا کرو اور آخرت کے حصہ کو دل میں جگہ دو۔ پھر یہ سب کچھ آسان ہو جائے گا۔

آگے فرماتے ہیں۔ کہ اگر کسی وقت شیطان کی طرف سے (غصہ) کا وسوسہ آنے لگے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے۔ اس میں غصہ کا علاج بتلایا گیا ہے۔ کہ غصہ کے وقت زبان سے اعوذ باللہ پڑھنا چاہیے اور دل سے اس کے مضمون پر غور کرنا چاہیے۔ کہ جیسے ہم دوسرے پر غصہ کرتے ہیں اور اس وقت بظاہر اس پر زبردست ہیں۔ ایسے ہی ہمارے اوپر بھی ایک زبردست ہے۔ جس کی پناہ کی ہم کو ضرورت ہے۔

اس کے بعد ایک مراقبہ کی تعلیم ہے۔ جس کے عمل کرنے سے غصہ وغیرہ کا دفع کرنا بہت سہل ہو جائے گا۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال کو خوب سنتے اور تمہارے

اعمال و احوال کو خوب جانتے ہیں۔ اس لئے جو بات کرو اور جو کام کرو سنبھل کر کرو۔ غصہ میں جلدی سے کچھ کام نہ کرو۔ مبادا حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کام ہو جائے تو گرفت ہو۔

سبحان اللہ! کیسا کامل و مکمل کلام ہے۔ جس میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت ہے۔

حاصل بیان کا یہ ہے۔ کہ استقامت کچھ دشوار چیز نہیں۔ ہر مسلمان کو استقامت حاصل ہو سکتی ہے۔ بلکہ حاصل ہے اور نفس استقامت پر جن فضائل کو متفرع کیا گیا ہے۔ ہر مسلمان کو یہ فضائل نصیب ہوں گے۔ پھر جس قدر دعوت الی اللہ اور اعمال صالحہ اور انشراح با ظہار العبدیت میں ترقی ہوگی۔ اسی قدر ان ثمرات میں ترقی ہوگی۔ پھر ان ثمرات عالیہ کے لئے ترقی کی طلب کیوں نہ ہو۔ ضرور ہونا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ ترقی کے ذرائع بھی میسر ہوں۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است | خم و خم خانہ با مہر و نشاں است

(اب بھی وہ ابر رحمت درفشاں ہے، خُم اور خمخانہ مہر و نشان کے ساتھ موجود ہے)

اور اگر کسی کو نفس ایمان ہی حاصل ہو۔ وہ بھی مایوس نہ ہو۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ استقامت کا ایک درجہ اس کو بھی حاصل ہے۔ جس سے یہ ثمرات اس کو بھی ضرور حاصل ہوں گے۔ گو ادنیٰ ہی درجہ میں سہی۔ پس ناامید تو نہ ہو۔ مگر ادنیٰ درجہ پر قناعت بھی نہ کرے۔ بلکہ ترقی کی کوشش کرے۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو استقامت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا
ومولانا محمدٍ و علیٰ اٰلہٖ و اصحابہٖ اجمعین.
واٰخر دعونا ان الحمد للّٰہ رب العلمین.